کلیاتِ مصحفی

جلد دوم

مشتمل بر

دیوانِ دوم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1۔آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110006

کلیاتِ مصحفی

جلد دوم

مشتمل بر

دیوانِ دوم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ I۔ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110006

Kulliyat-e-Mus'hafi
Volume II
By
Ghulam Hamdani Mus'hafi
Edited by: **Prof. Nisar Ahmed Faruqi**

سنہ اشاعت	:	جنوری، مارچ 2004 شک 1925
پہلا اڈیشن	:	1100
قیمت	:	154/=
سلسلۂ مطبوعات	:	1119

ISBN:81-7587-044-3

ناشر: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔
اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ، واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الواسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ)
ڈائرکٹر

فہرست

دیوانِ دوم

الف (غزلیات)

ردیف ش

ردیف ص

ردیف ض

ردیف ط

ردیف ظ

ردیف ع

ردیف غ

ردیف ف

ردیف ق

ردیف ک

ردیف گ

ردیف ل

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی

☆☆☆☆

(ب) دیگر اصناف

حرفِ اوّل

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومتِ ہند نئی دہلی نے جہاں اور بہت سے نہایت اہم اور نتیجہ خیز کام کیے ہیں جن کے فائدے عام طور سے اردو والوں کو پہنچ رہے ہیں اور ماضی میں پہنچتے رہیں گے، وہیں اُس نے اب تک مختلف علوم وفنون کی ایک ہزار سے زیادہ کتابیں سلیقے کے ساتھ شائع کی ہیں اور اُنھیں اردو دوستوں تک پہنچانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ قومی کونسل کے پروگرام میں اردو کے کلاسیکی سرمائے کی ازسرِ نو اشاعت بھی شامل ہے اور اس سلسلے کی کئی کتابیں سامنے آچکی ہیں۔ اسی منصوبے کے تحت اٹھارہویں صدی کے استاد شاعر غلام ہمدانی مصحفی امروہوی کی کلیات کی اشاعت کی جارہی ہے۔ قومی کونسل کے نہایت فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے یہ کام راقم الحروف کے سپرد کیا ہے۔ میں نے 1958 سے مصحفی کی حیات اور شاعری پر کام شروع کیا تھا جس کا کچھ حصہ شائع بھی ہوا اور اُسے اہلِ نظر نے پسند کیا تھا۔ اسی ضمن میں راقم نے مصحفی کے تمام دواوین کی نقلیں بھی حاصل کی تھیں اور اُنھیں مرتب کر کے شائع کرنا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی اور دوسری جلد 1967 میں شائع بھی ہوئی تھیں پھر بعض وجوہ سے مزید جلدوں کی اشاعت معرض التوا میں رہی۔

اب 36 سال بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی ادب دوستی و معارف پروری کی بدولت یہ منصوبہ جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہوگا تکمیل کو پہنچ رہا ہے اس میں کلیات نظم مصحفی کے علاوہ اُن کی نثری تصانیف یعنی شعراء کے تذکروں کی ترتیب و اشاعت بھی شامل ہے۔ زیرِ نظر جلد مصحفی کے دیوانِ دوم پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کی بنیاد ایک قلمی نسخے پر رکھی تھی جو میرے ذخیرۂ ذاتی میں ہے، یہ سب سے پہلے مرزا محمود بیگ شور دہلوی کے ذاتی ذخیرے

میں رہا ہے۔ سعادت خاں ناصرؔ نے اپنے تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' میں ان کا نام اور صرف ایک شعر لکھا ہے۔ قلمی دیوان پر محمود بیگ شور کی مہر ثبت ہے جس پر سنہ 1269ھ بھی پڑھا جاتا ہے، مگر یہ نسخہ اس سے بہت پہلے لکھا گیا ہوگا۔ یہ میرے مکرم و محترم نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی مرحوم کی ملکیت بھی رہ چکا ہے اور اُنھوں نے ہی ازراہِ عنایت مجھے عطا فرمایا تھا۔ قرائن کہتے ہیں کہ اس نسخے کا اور دیوانِ دوم مخطوطۂ رام پور رضا لائبریری کا نسخۂ منقول عنہ ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس کا مقابلہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور رام پور رضا لائبریری رام پور کے دو نسخوں سے کیا گیا ہے۔ پوری کوشش اور احتیاط یہ رہی ہے کہ متن کی صحت ہو جائے اور کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ صرف ضروری اور معنی پر اثر ڈالنے والے اختلافات حواشی میں دیے گئے ہیں۔ ن:ا سے رام پور کا وہ قلمی نسخہ مراد ہے جو 1243ھ میں یعنی مصحفی کی وفات سے تین سال بعد لکھا گیا تھا، دوسرے نسخے کو ن:۲ کہا گیا ہے۔ غریب اور مشکل الفاظ کی مختصر تشریح بھی حواشی میں کردی گئی ہے۔ مصحفی کے دواوین کی مکمل اور مفصل فرہنگ ان شاء اللہ آخری جلد میں پیش کی جائے گی۔

کلیاتِ مصحفی کے اس منصوبے میں عزیزی سرور الہدیٰ (ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) اور عزیزی ضیاء الدین انصاری سے بہت تعاون ملا ہے اُن کے لیے شکریہ بھی اور دعائیں بھی۔

مکرمی ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا بھی ذاتی طور پر ممنون ہوں کہ اُن سے ہر قدم پر تعاون ملا ہے۔ قومی کونسل کے دوسرے ذمہ دار حضرات بھی ہر مشکل مسئلے کو آسان بنانے میں ہمیشہ مستعد پائے گئے ہیں اُن سب کا بھی شکریہ واجب ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مصحفی اور اُن کی شاعری

اردو شاعری کی تاریخ میں مصحفی کی ذات کئی اعتبار سے اہم اور قابل لحاظ ہے اور وہ ایک ایسی حیثیت کے مالک ہیں جس کے اندر ہم کو عجیب تناقض اور غیر معمولی تضاد نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری ہمارے اندر تصادم کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ تصادم مزاج اور ماحول کا تصادم ہے۔ مصحفی تاریخ کی دو بالکل مختلف فصلوں کی درمیانی کڑی ہیں، وہ اردو شاعری کے دو مختلف مدرسوں کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں ایک طرف تو اس دور کی آخری یادگار ہیں جو میرؔ، دردؔ اور سوداؔ جیسے کاملین سے ممتاز ہے اور جس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت خالص تغزل یعنی داخلیت subjectivism ہے۔ دوسری طرف ان سے اس دور کی ابتدا ہوتی ہے جس کو اردو شاعری کا لکھنوی دور کہتے ہیں۔ یہ دور خارجیت کا دور ہے، تکلف اور ظاہری سجاوٹ کے لیے مشہور ہے۔ اس دور کی سچی نمایندگی کرنے والے انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دلّی اُجڑ چکی ہے اور سلطنت و امارت کی طرح شعر و شاعری بھی اپنا ڈیرہ خیمہ لے کر لکھنؤ میں آ بسی ہے۔ مصحفی بھی اسی ''اُجڑے دیار کے رہنے والے'' تھے جو ''پورب کے ساکنوں'' میں آ پڑے تھے۔ دلّی کی وضع اور اس کی سچائی اور معصومیت ان کا خمیر ہو چکی تھی ان کے خون میں وہی معصومانہ تغزل وہی خلوص شعری حرکت کر رہا تھا جو میرؔ اور دردؔ کا ترکہ تھا لیکن کرتے کیا زمانہ کی ہوا بدل چکی تھی، نیا دیس تھا اور نیا بھیس۔ زمانہ اور ماحول دونوں خلاف مزاج، زمانہ کے ساتھ مصالحت کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ انشاؔ کی چہلوں اور جراءت کی طرّاریوں کے سامنے قدم جمائے رہنا تھا۔

اور اس میں شک نہیں کہ اس آزمائش اور کشاکش کو جس سلیقہ کے ساتھ مصحفی نے نباہا وہ ہر شخص کا کام نہیں تھا۔ لیکن ان کو پورا احساس تھا کہ وہ غلط زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ اصلی شاعری کی کہیں قدر نہیں رہی اور جب کہ شاعری بھی لکڑی اور دنگل کی طرح اکھاڑے کی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک غزل میں جو غالباً طرحی تھی اسی کا رونا روتے ہیں:۔

کیا چمکے اب فقط مری نالے کی شاعری — اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری
شاعر رسالہ دار نہ دیکھے نہ میں سُنے — ایجاد ہے انھیں کی رسالے کی شاعری
ہوں مصحفی میں تاجر ملک سخن کہ ہے — خسرو کی طرح یاں بھی اٹالے کی شاعری

غرض کہ مصحفی کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی خصوصیات باہم دست و گریباں نظر آتی ہیں اور وہ بیچارے کفر و ایمان کی کشاکش میں بری طرح مبتلا رہتے ہیں۔

اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے تاریخ شعر اردو میں مصحفی بالکل اکیلے ہیں کیا اس سے پہلے، کیا اس کے بعد؛ ان کا ساتھ دینے والا اور ان کی ہمنوائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ماضی کی یادگار اور حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہیں، متقدمین کے گائے ہوئے راگ نہ صرف ان کے کانوں میں بلکہ ان کی ہستی کی ایک ایک تہ میں گونج رہے تھے۔ لیکن خود ان کے زمانے میں دوسرے راگوں کی مانگ تھی، جن کے موجد جراءت اور انشا تھے۔ نتیجہ ایک لطیف اور پر کیف قسم کی انتخابیت تھی جو مصحفی کے دم سے شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہوئی۔ غور سے مطالعہ کرنے والوں کو مصحفی کے کلام میں اگر ایک طرف اس قسم کا خالص تغزل ملتا ہے:۔

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

یا۔ کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے

ترے کوچے میں اگر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

یا۔ کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر

فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تو دوسری طرف ایسے اشعار کی بھی کثرت ہے جو صرف لکھنوی فضا میں پیدا ہو سکتے تھے اور جو لکھنوی دبستان شاعری کے لیے ہمیشہ سرمایۂ ناز و افتخار رہے ہیں مثلاً:

آیا لیے ہوئے جو وہ کل ہاتھ میں چھڑی

آتے ہی جڑ دی پہلی ملاقات میں چھڑی

یا۔ آنکھوں میں اس کی میں نے جو تصویر کھینچ لی

سرمے نے اس کی چشم کے شمشیر کھینچ لی

یا۔ جنبشِ لب نے تری میری زباں کر دی بند

تو نے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں محض قافیہ اور ردیف اور رعایات و مناسبات سے مضمون پیدا کیے گئے ہیں اور ان میں جذبات و واردات یا خیالات و افکار کی سچائی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس قسم کی شاعری کی بنیاد، جس کو مجملاً خارجی شاعری کہتے ہیں، لکھنؤ میں پڑی اور یہیں سے اس نے فروغ پایا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس دبستان شاعری کے بانیوں میں مصحفی بھی تھے جو مجبور تھے کہ اپنے کو غالب جماعت میں شامل رکھیں۔

قبل اس کے کہ ہم مصحفی کے کلام سے تفصیلی بحث کریں اگر ان کی زندگی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو بے موقع یا غیر متعلق بات نہ ہوگی۔

مصحفی کا اصل نام غلام ہمدانی تھا اور باپ کا نام شیخ ولی محمد وطن امروہہ ضلع مراد آباد تھا ان کے آبا و اجداد ملازمانِ شاہی میں سے تھے۔ عنفوانِ شباب میں ان کا دلّی آنا ہوا اور لکھنؤ آنے سے پہلے برابر دلّی ہی میں رہے۔ طبیعت علم و ادب کی طرف بچپن سے مائل تھی اور شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی۔ دلّی اس وقت تک اربابِ فضل و کمال سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ مصحفی نے بہت جلد مروّجہ نصاب کے مطابق عربی فارسی میں خاطر خواہ دستگاہ حاصل کر لی۔ وہ خود اپنے تذکرے ''ریاض الفصحاء'' میں لکھتے ہیں کہ تیس 30 سال کی عمر میں اُنھوں نے شاہجہان آباد میں فارسی نظم و نثر کی تکمیل کر لی تھی اور پھر لکھنؤ پہنچ کر مولوی مستقیم ساکن گوپامئو سے عربی علوم یعنی طبیعی، الٰہی اور ریاضی وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ قانونچہ مولوی مظہر علی صاحب سے پڑھا آخر عمر میں تفسیر اور حدیث کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے۔ عربی میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ قریب ایک جزو غزلیات اور سَو دو سَو نعتیہ قصیدے اس زبان میں بھی کہے جو طاق پر دھرے دھرے نمزدگی کے سبب سے کرم خوردہ ہو کر غارت ہو گئے۔ غرضیکہ مصحفی نہ صرف شاعر تھے بلکہ خاصے عالم و فاضل تھے فارسی میں دو دیوان لکھے تھے ایک تو دلّی میں چوری گیا۔ یہ دیوان مرزا جلال اسیر اور ناصر علی کے رنگ میں تھا۔ اِس شعر میں اسی دیوان کی طرف اشارہ ہے:۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلّی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

دوسرا دیوان باقی رہا جو بعض کتب خانوں میں اب بھی موجود ہے۔ فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

مدتے شد کہ میانِ من و او آشتی است
کیست آنکس کہ کنوں میدہد آزار مرا

مرکب انداز کہ میدانِ تنگ و تازے ہست
در رہت سینہ سپر عاشقِ جانبازے ہست

مائل سوختنم شعلۂ آوازے ہست
در کمینِ دل من زمزمہ پردازے ہست
نیست نومیدیم از تو کہ دگر چشم ترا
سوے آئینہ نگاہے غلط اندازے ہست

درون خانہ تو اے نازنیں چہ میدانی
کہ گفتہ شد سرِ بازار داستانِ کسے

یہ منتخب اشعار سے انتخاب تھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مصحفی کے فارسی کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے بلکہ زبان اور مضامین دونوں کے اعتبار سے ان کا یہ کلام ڈھیلا اور پھسپھسا معلوم دیتا ہے۔

جب دلّی اُجڑی اور اہلِ علم وفن کی رہی سہی محفل بھی برہم ہوئی تو مصحفی نے بھی رختِ سفر باندھا اور لکھنؤ کی راہ لی۔ یہ آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ دلّی چھوڑ کر مصحفی سب سے پہلے ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) پہنچے اور قیام الدین قائم کے توسط سے نواب محمد یار خاں کے دربار میں ملازم ہوئے۔ کچھ دنوں اس طرح فکر معاش کی جانکاہیوں سے آزاد رہے۔ اور یک گونہ سکون کے ساتھ بسر اوقات کی۔ نواب محمد یار خاں کے زوال کے بعد لکھنؤ آئے اور پھر دلّی چلے آئے اس نیت سے کہ اب استغنا اور قناعت کے ساتھ پاؤں سمیٹ کر یہیں رہیں گے۔ لیکن سفّاک زمانے نے ان کا یہ عہد پورا نہ ہونے دیا اور معاش کی کوئی صورت نہ نکل سکی آخر کار پھر لکھنؤ آئے اور اب کے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں مامور ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فراغت اور آزادی کے دن ان کو پھر کبھی نصیب نہیں ہوئے۔ لطف ''گلشن ہند'' میں لکھتے ہیں: ''بالفعل کہ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیقِ معاش تو ایک مدت سے وہاں نصیب اہل کمال ہے اسی طور پر

در ہم بر ہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔"

مصحفی کا ایک شعر ہے:۔

سنے ہے مصحفی اب تو بھی فی الحال

مُنڈا کر سَر کو ہو جا فارغ البال

بیچارے کو آخر کار یہی کرنا پڑا جس شعور کی تربیت دلّی میں ہوئی تھی اس کو لکھنؤ پہنچ کر اپنا مزاج اور اپنا لب و لہجہ دونوں بدل دینا پڑا اور جمہور کو قائل کرنے کے لیے ایک ایسی طرز اختیار کرنا پڑی جس سے اگر مصحفی دلّی میں رہ جاتے تو یقیناً اپنے کو علحدہ رکھتے لیکن فضا اور ماحول سے بغاوت کرنا نہ ہر شخص کے بس کی بات ہے اور نہ خطرات سے خالی۔ مصحفی مجبور تھے کہ اس قسم کے شعر کہہ کر عوام سے داد لیں اور انھیں کو معراجِ شعری سمجھیں۔

نہ کھینچے خامۂ مو ایسی تمثال

کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال

یا۔ جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری

بنا خورشید پانی کی کٹوری

لیکن مصحفی کے کلام کا یہ حصہ بھی جو لکھنؤ کا ساختہ و پرداختہ ہے اگر غور سے پڑھا جائے اور اس پر گہری ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اصلاً و فطرۃً لکھنؤ کا شاعر نہیں ہے۔ ان کی زبان اور ان کے اسلوب میں یہاں بھی ایک اندرونی فضائی کیفیت ہوتی ہے جو نرمی اور گداز لیے ہوئے ہوتی ہے اور جو بہت واضح طور پر خوش نوایانِ دلّی کے گائے ہوئے راگ کا آخری ارتعاش معلوم ہوتی ہے۔

لکھنؤ پہنچ کر مصحفی کی شاعری نے بات کی بات میں اتنی شہرت حاصل کر لی کہ ہر طرف سے شاگردوں کی آمد شروع ہو گئی۔ یہ تو امر مسلمہ ہے کہ جتنے شاگرد مصحفی کو نصیب ہوئے کسی دوسرے اردو شاعر کو نہیں ہوئے خود مصحفی کو اس پر ناز ہے۔ "ریاض الفصحاء" میں لکھتے ہیں:۔ در زبان اردوے ریختہ قریب صد کس امیرزادہا و غریب زادہا بحلقۂ

شاگردی من آمدہ باشند وفصاحت وبلاغت ازمن آموختہ۔"

دواوین کے علاوہ مصحفی نے نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں تین تذکرے شاعروں کے ہیں جو مشہور ہیں اور چھپ گئے ہیں۔ ان میں سے دو یعنی "ریاض الفصحاء" اور "تذکرۂ ہندی" میں اردو شاعروں کے ذکر ہیں۔ تیسرا یعنی "عقدِ ثریا" چند فارسی شعراء کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ مصحفی نے چونکہ عمر طویل پائی اس لیے اکثر متقدمین ومتاخرین کے ہمعصر رہے۔ ان تذکروں میں شاعروں کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی اعتبار اور اہمیت رکھتا ہے اور پھر چونکہ مصحفی سخن سنج تھے اس لیے کلام پر رائے عموماً جچی تلی دیتے ہیں اور کلام کا جو انتخاب دیتے ہیں وہ ان کے مذاق سلیم پر دلالت کرتا ہے۔ "ریاض الفصحاء" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رسالہ عروض میں لکھا تھا جس کا نام "خلاصۃ العروض" تھا اور ایک کتاب فارسی محاورات پر تھی جس کا نام "مفید الشعراء" بتاتے ہیں۔

مصحفی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اردو شاعری کے دو مختلف زمانوں اور دو مختلف مدرسوں کو ملاتے ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے میرؔ اور سوداؔ کا آخری زمانہ دیکھا تھا اور دوسری طرف انشاؔ اور جراءتؔ کے ساتھ مشاعرے اور مطارحے کر رہے تھے۔ ان کی غزلوں میں جہاں میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کی خصوصیات ملتی ہیں وہیں پہلو بہ پہلو انشاؔ اور جراءتؔ کا رنگ بھی کافی نمایاں نظر آتا ہے بالخصوص جراءتؔ کی ریس تو وہ سعی وکاوش کے ساتھ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کو دلّی کے متغزلین کا ہم آہنگ ہونا مرغوب تھا اور یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جب تک دلی میں رہے اسی آہنگ میں شعر کہتے رہے۔ چنانچہ میر حسنؔ نے اپنے "تذکرۂ شعرائے اردو" میں مصحفی کے کلام کا جو انتخاب دیا ہے ان میں شاید ہی دو چار اشعار ایسے نکلیں جن پر لکھنوی رنگ کا دھوکا ہو اور میر حسنؔ جس وقت اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے مصحفی شاہ جہان آباد ہی میں تھے اور تجارت کرتے تھے۔

مصحفی ایک زبردست قوتِ آخذہ کے مالک تھے اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ کہہ چکا ہوں ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت تقلید اور انتخابیت ہے۔ یعنی

دوسروں کے اثرات کو اخذ اور قبول کرنے کا ان میں خاص ملکہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بقول آزاد کے ''غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔''

مصحفی انتخاب اور تقلید کی طرف فطرۃً مائل نظر آتے ہیں اس سے ان کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ پہنچا کہ متقدمین کے رنگ کو اپنے کلام میں اس طرح جذب کرلیا کہ وہ گویا ان کا رنگ تھا، مگر اسی کے ساتھ اپنے وقت کی خصوصیات اور میلانات پر بھی نظر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا میں ان کا مرتبہ انشا اور جراءت اور دوسرے معاصرین سے بہت بلند رہا اور ان اساتذہ کے مقابلہ میں آج تک غزل گو شعراء مصحفی کی شاعری سے زیادہ اثر قبول کرتے اور فیض اُٹھاتے رہے۔ لیکن اسی تقلید سے مصحفی کو نقصان یہ ہوا کہ خواہ مخواہ زمانہ سازی کی غرض سے انشا اور جراءت کی طرز میں اپنی قوت ضائع کرنے لگے جس سے ان کو کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ مگر یہ ہونا تھا قوتِ آخذہ جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اکثر ما صفا اور ما کدر میں امتیاز کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔

مصحفی اگرچہ انشا اور جراءت کے ہمعصر ہیں لیکن ان کے ان اشعار سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی جن میں صاف میر اور سودا کے انداز پائے جاتے ہیں وہ بالعموم زبان اور محاورات میں اپنے زمانہ سے الگ رہتے ہیں اور ان متقدمین کے عہد سے قریب۔ آزاد نے ان کو میر سوز، سودا اور میر کا آخری ہم زبان بتایا ہے اور جس کسی نے بھی مصحفی کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اس کو اس رائے سے اتفاق ہوگا۔ ان کی زبان میں وہی ملائمت اور گداختگی ہے جو میر کے عہد کی عام خصوصیت تھی اور ان کے لب ولہجہ اور اسلوب میں وہی نرمی اور مسکینی ہے جو پھر کبھی کسی دوسرے دور کو نصیب نہیں ہوئی۔ مصحفی کے وہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جن پر سوز اور میر اور ان کے دوسرے معاصرین کا دھوکا ہوسکتا ہے۔ مثلاً:۔

ہم سمجھے تھے جس کو مصحفی یار

وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

آکے میری خاک پہ کل گردباد
دیر تلک خاک بسر کر گیا

جب واقفِ راہ و روشِ ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

او دامن اُٹھا کے جانے والے
ٹک ہم کو بھی خاک سے اُٹھا لے

ان اشعار میں جو شکستگی اور سپردگی پائی جاتی ہے وہ کچھ میرؔ، دردؔ اور قائمؔ وغیرہ ہی کی یاد تازہ کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مزاج وطبیعت کا آدمی انشاؔ و جراءتؔ کا حریف نہیں ہوسکتا تھا یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ ان کو ایسے بھانڈوں سے پالا پڑا۔ جہاں تک شاعری اور اس کی فطرت کا سوال ہے مصحفی اور انشاؔ میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ آزاد نے آبِ حیات میں انشاؔ کو جو مصحفی سے اس قدر بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے وہ ان کا محض تعصب ہے۔ مصحفی کے متعلق ان کا یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ ''ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو ان کی شوخی میں بڑھاپے کا ناز بے نمک معلوم

ہوتا ہے'' مصحفی کی فطرت میں اکڑ نا نہیں ہے اس لیے ان کو اکڑ نا زیب نہیں دیتا۔ لیکن اکڑنے کا نام شاعری نہیں ہے۔ شوخی اور طرّاری کو دراصل شاعری اور بالخصوص غزل گوئی سے کوئی تعلق نہیں۔ انشا کی تیزی اور طباعی مسلّم ان کی علمی قابلیت بھی مسلّم، مگر ان کے اندر وہ خصوصیات بہت کم تھیں جو تغزل کی جان ہوتی ہیں، اور جو تھیں وہ ہمارے کسی کام کی نہیں اس لیے کہ خود شاعر نے ان کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ آزاد نے انشا کے متعلق میاں بیتاب کی رائے نقل کی ہے ''سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا''۔ اس میں اتنا تو ہم بھی مانتے ہیں کہ ان کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا لیکن جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر سعادت علی خاں کی مصاحبت نہ ہوتی تو بھی وہ ڈوبی ہی تھی۔ آخر مصحفی کی شاعری کو کسی نے کیوں نہیں ڈبویا۔ انشا اگر خود ایسے نہ ہوتے تو سعادت علی خاں کی مصاحبت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی بلکہ شاید اس مصاحبت کو ضرورت سے زیادہ دخل ہی نہ ہوتا۔

بہر حال جہاں تک غزل سرائی کا تعلق ہے انشا اور مصحفی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ جراءت غزل سرا ضرور تھے لیکن ان کی غزل سرائی تمام تر خارجی انداز کی تھی۔ اُنھوں نے غزل میں ایک بالکل دوسری دھن اختیار کی یعنی معاملہ بندی اور ادابندی۔ اردو میں اندازِ ادا اور معاملہ کی شاعری Poetry of behavior جراءت سے شروع ہوتی ہے۔ لکھنوی دبستان شاعری کے بانی دراصل جراءت تھے لکھنؤ کے شاعروں کا طرۂ امتیاز خارجیت ہے جو اس تکلف اور تصنع کی ذمہ دار ہے جس کو ہم لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔

مصحفی کو فطرۃً ان راگوں سے رغبت تھی جو متقدمین گا گئے تھے اِس دعویٰ کے ثبوت میں ان کی عشقیہ مثنوی ''بحر المحبت'' بھی پیش کی جا سکتی ہے جو اُنھوں نے میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کو سامنے رکھ کر لکھی ہے اور جس میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ میر کی ہو بہو نقل اُتار کر رکھ دیں۔ مصحفی کی مثنوی کو میر حسن کی مثنوی سے کوئی مشابہت نہیں ہے حالانکہ میر حسن بھی مصحفی کے معاصرین میں سے تھے۔

پہلے ہم مصحفی کے اس کلام کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں جس پر متقدمین بالخصوص میر کا نرم اور پُر گداز تغزل چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ میر وغیرہ کا جہاں مصحفی نے تتبع کیا ہے وہاں اپنے رنگ کو ان لوگوں کے رنگ سے کافی ملا دیا ہے اور خود انھیں لوگوں میں مل جل گئے ہیں۔ مصحفی کی شاعری کا مطالعہ کر کے ماننا پڑتا ہے کہ شاعر کا کام قدیم رسوم و روایات کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھنا ہے اگر وہ اس قابل ہیں۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ ادب اور زندگی کی روایات میں سے ان عناصر کو لے لے جو زمانی اور مکانی خصوصیات سے محدود نہ ہوں۔ شاعر اور نقاد دونوں کی نظر ادب کے ان اجزا پر ہونا چاہیے جن میں بقاء اور اِرتقاء کی صلاحیت ہو۔ مصحفی نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے پرانے اَسالیب و صور کو انتخاب کر کے نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اُن کو ازسرِ نو تربیت دے کر ان کے اندر نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ میر، درد اور سودا کے مقابلہ میں زیادہ منجھی اور کسی ہوئی ہے لیکن ان میں دردمندی دل برشتگی اور سوز و گداز کافی حد تک وہی ہے جس کو ان بزرگوں سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر وہی خلوص اور محویت، وہی عاشقانہ انفعال اور خود گزاشتگی ہے جو غزل کی جان ہے اور جو میر و درد کا مخصوص انداز ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

یاد ایام بے قراریِ دل
وہ بھی یا رب عجب زمانہ تھا

اب کہاں ہم کہاں وہ کنجِ قفس
کوئی دن واں بھی آب و دانہ تھا

یہ غزل میر آثر کی اس مشہور غزل پر کہی گئی ہے جس کے تین شعر یہ ہیں:۔

کبھو کرتے تھے مہربانی بھی
آہ وہ بھی کوئی زمانہ تھا

کیا بتا دیں کہ اس چمن کے بیچ
کہیں اپنا بھی آشیانہ تھا

ہوشیاروں سے مل کے جانو گے
کہ اثر بھی کوئی دوا نہ تھا

مصحفی کے اشعار بھی خاص و عام کی زبانوں پر چڑھ کر ضرب المثل ہو جانے کی اسی قدر صلاحیت رکھتے ہیں جس قدر کہ میر اثر کے اشعار۔ لیکن مصحفی اپنی پُر گوئی اور ہمہ رنگی کی وجہ سے اکثر خسارے میں رہتے ہیں۔ ورنہ خالص تغزل کے رنگ میں ان کے وہاں کافی شعر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان اشعار پر غور کیجیے:۔

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

تجھے اے مصحفی کیا ہے خبر دردِ محبت کی
نہ اے بیدرد میرے سامنے لے نام درماں کا

صدمے سو دل پہ ہوئے ہم نے نہ جانا کیا تھا
ہائے رے ذوق وہ الفت کا زمانہ کیا تھا

کہتا نہ تھا میں اے دل جانا نہ اس گلی میں
آخر تو مجھ پہ آفت، خانہ خراب لایا

میرؔ، دردؔ اور آثرؔ کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی سادہ اور شگفتہ بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں بجائے خود وہ گداز اور وہ بے ساختہ پن ہوتا ہے جس کا دوسرا نام تغزل ہے اور ان بحروں میں اُنھوں نے وہ اشعار نکالے ہیں جو ان کا حاصل عمر ہے۔ مصحفی کو بھی انھیں اکابر متغزلین کی طرح چھوٹی اور دلآویز بحروں کے ساتھ خاص اُنس ہے۔ جن میں انھوں نے بڑے پُر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ مصحفی کی ان غزلوں کو پڑھیے تو ان پر اور بھی متقدمین کے رنگ کا دھوکا ہوتا ہے۔ البتہ مصحفی جو چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں ان میں میرؔ، دردؔ اور آثرؔ کی چھوٹی بحروں کے مقابلہ میں اکثر لوچ اور ترنم زیادہ ہوتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کی نئی فضا کے بہتریں عناصر کو بھی اپنی شاعری میں جذب کرلیا ہے کچھ اشعار سُنیے :۔

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

شب جو دل دو دو ہاتھ اُچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا

جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

مصحفی یار کے گھر کے آگے
ہم سے کتنے نگھرے بیٹھے ہیں

تلوار کو کھینچ ہنس پڑا وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جیے ہی بنے

رکھا تہِ خاک مصحفی کو
آرام تمام ہو چکا اب

کہہ دے کوئی جا کے مصحفی سے
ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

کیا کریں جا کے گلستاں میں ہم
آگ رکھ آئے آشیاں میں ہم
مصحفی عشق کر کے آخر کار
خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے
ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
صفحۂ روزگار پہ لکھ لکھ
عشق کی داستان چھوڑ گئے

یہ مصحفی کا وہ تغزل ہے جو ان کو متقدمین سے بالکل گھلا ملا دیتا ہے۔ جذبات میں وہی سادگی اور خلوص ہے انداز بیان میں وہی بھولا پن ہے الفاظ اور ان کی بندش میں وہی بے تکلفی اور سہولت ہے۔

لیکن ادبی انتخابیت Literary Electicism میں سب سے بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی کسی ایک رنگ پر قناعت نہیں کرتی اور بعض اوقات وہ رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے جس کو چھوڑے رہنا ہی بہتر ہوتا۔ اسی انتخابیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اگر مصحفی کے کلام کا کوئی نقادان پر یہ الزام لگائے کہ وہ کسی خاص طرز کے ماہر نہیں ہیں تو اس کی تردید مشکل سے کی جا سکتی ہے۔ متقدمین ہی میں لے لیجیے۔ جہاں مصحفی نے میرؔ، سوزؔ، دردؔ اور اثرؔ وغیرہ کے رنگ کی تقلید کی ہے وہیں سوداؔ کی تقلید بھی کچھ کم نہیں کی ہے۔ اور اکثر سنگلاخ زمینوں میں مرکب اور طویل ردیفوں کے ساتھ غزلیں لکھی ہیں جن میں صرف تکلف اور تصنع برتا جا سکتا ہے اور تغزل کو نباہا نہیں جا سکتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انشاؔ کے دور میں نہ پیدا ہوئے ہوتے اور ان کو ایسے معرکوں میں نہ شریک ہونا پڑتا تو شاید وہ اس روش سے احتراز کرتے۔ یہ کہنا ایک حد تک تو صحیح ہوگا لیکن مصحفی کی طبیعت ضرورت سے زیادہ ہمہ گیر اور وسیع المذاق واقع ہوئی تھی۔ انشاؔ سے مقابلہ نہ بھی ہوتا تو بھی وہ ہر رنگ میں طبع آزمائی ضرور کرتے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس رنگ کو بھی انھوں نے اختیار کیا اس میں نہ صرف اپنی استادی اور کمالِ فن کا ثبوت دیا بلکہ غزل کی آبرو بھی رکھ لی۔ یہ سچ ہے کہ مشکل اور ٹیڑھی زمینوں میں وہ انشاؔ کے سامنے مشکل سے ٹھہرتے نظر آتے ہیں لیکن اگر اس

غیر مناسب موازنہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو خود اپنی جگہ مصحفی اپنے فن کے تنہا ماہر ہیں۔ زبان اور محاورہ اور شاعری کے رسوم و آداب کی تہذیب و تحسین میں ان کا درجہ انشا سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ پر تکلف زمینوں میں چند اشعار مثالاً درج کیے جاتے ہیں:۔

پیری سے ہوگیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ہوتے کردیں چراغ ٹھنڈا

اس طرح میں انشا کی غزل مصحفی کی غزل سے بڑھی چڑھی معلوم ہوتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:۔

پر تو سے چاندنی کے ہے صحن باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ، کردے چراغ ٹھنڈا

لیکن مصحفی کی غزل نہ صرف لطف زبان حسن محاورہ ،الفاظ کے رکھ رکھاؤ اور دوسرے عصری میلانات کے لحاظ سے ایک دلکش نمونہ ہے بلکہ اس کے اندر وہ متانت وہ گھلاوٹ وہ نرمی اور وہ دل گداختگی پورے طور پر موجود ہے جو غزل کے ترکیبی عناصر میں داخل ہیں اور جن کے لیے اس سے پہلے کا دور مشہور ہے۔ مصحفی کے دیوان میں ایسی غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں جن کے لطف کا دارومدار ردیفوں پر ہے لیکن جو اپنے اندر پوری غزلیت بھی رکھتی ہیں۔ یہ غزل مشہور ہو چکی ہے:۔

جو پھرا کے مُنھ کو اُس نے بہ قفا نقاب اُلٹا
اِدھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بسوال بوسہ اس نے مجھے رک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُلٹا

اسی طرح میں انشا کی بھی غزل ہے اور جہاں تک بیان کے زور اور انداز کے بانکپن کا تعلق ہے ان کی غزل مصحفی کی غزل سے ممتاز ہے اس میں وہی طرّ اری اور چنچل پن ہے جو انشا کی فطرت تھی۔ ان کے عام لب ولہجہ اور تیور کا انداز ان کے صرف ایک شعر سے ہو جاتا ہے۔

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی، تو ملا جواب اُلٹا

مصحفی کا رنگ بالکل جدا ہے جس کا انشا کے رنگ سے مقابلہ کرنا ایک فضول سی بات ہے۔ مصحفی کی زبان اور ان کے اسلوب میں وہ سادگی اور سیدھا پن ہے جو خلوص کی علامت ہے اور جس کے بغیر غزل صحیح معنوں میں غزل نہیں ہوتی۔ چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

چھپایا تم نے مُنھ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا
تغافل نے تمھارے خاک میں ہم کو ملا ڈالا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ، یعنی مصور نے
جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

زلفوں کی برہمی نے برہم جہان مارا
پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا

ہرگز وہ دست و بازو دہلتے کبھی نہ دیکھے
جو تیر اس نے مارا سو بے کمان مارا

ایسی طرحوں میں پُر تاثیر اشعار نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ زبان اور محاورے اور ردیف کے پیچھے غزلیت کا سرشتہ اکثر ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں بھی مصحفی کے یہاں جو بے تکلفی، بے ساختگی اور تاثیر ہے وہ ان کے معاصرین میں بہت کم ملتی ہے۔ مصحفی

صرف قافیہ ردیف یا محاورے کے لیے اپنے اشعار کے ساتھ زبردستی نہیں کرتے۔

ان دو اشعار میں محاورے اور ردیف قافیے کس خوبی کے ساتھ نبا ہے گئے ہیں اور آوردیا تکلف کا کہیں سے احساس نہیں ہونے پاتا۔

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا
فرہاد نہ کچھ بولا، مجنوں نے نہ دم مارا

تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا
اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا

یہی کیفیت ان اشعار میں ہے:۔

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا
جس رہگذر سے نکلا عالم کو مار نکلا

آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم
تیرا ہی نام مُنھ سے بے اختیار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر سیر چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

ایک ہچکی میں ٹھکانے دلِ بیمار لگا
اس پہ اب تیر لگا خواہ تو تلوار لگا

مصحفی عشق کی ہے گرمیِ بازار وہی
کشورِ حسن میں نت رہتا ہے بازار لگا

یہی بات انشا کو میسر نہیں ہوئی۔ ایسی ٹیڑھی طرحوں میں انھوں نے اپنی شوخ و شنگ طبیعت کی جولانیاں جتنی بھی دکھائی ہوں لیکن مصحفی کی طرح ظاہری رکھ رکھاؤ کے ساتھ کلام کو ایک باطنی کیفیت سے معمور رکھنا ان کے بس کا کام نہ تھا۔ اب ہم ایسی ہی طرحوں میں سے کچھ اور اشعار یکجا کرتے ہیں:۔

میں ادا اُس کی کہوں کیا مرے مینوش نے رات
سر پہ ساقی کے کس انداز سے ساغر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جاتا ہے اس راہ میں اکثر مارا

آخر کو مصحفی نے دی جان تیری خاطر
جی سے گزر گیا وہ نادان تیری خاطر

کیوں نہ ہو شیشۂ دل چور مرے پہلو میں
میں نے ایامِ جنوں کھائے ہیں تھوڑے پتھر
کوئی سحر سے باندھتا ہے دکاں کو
وہ کافر جو آوے تو بازار باندھے
نہ ساون کرے پھر برسنے کا دعویٰ
جو یہ دیدۂ تر کبھی تار باندھے

محبت میں صادق یہ اغیار ٹھہرے
ہم اک بات کہہ کر گنہگار ٹھہرے

مصحفی کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ خارجی انداز میں ہے جو جراءت کا اسلوب رکھتا ہے۔ وہ معاملہ بندی، ادابندی، معشوق کا سراپا، اس کے عشوہ وناز اور سج دھج کے بیان میں بھی استادانہ ملکہ رکھتے ہیں۔ اس میدان میں ان کا جراءت کے ساتھ مقابلہ تھا اور یہ کہنا غلط نہیں کہ اول اول اُنھوں نے جراءت ہی کی تقلید میں یہ رنگ اختیار کیا لیکن جراءت و مصحفی میں فرق ہے۔ خارجی رنگ میں بھی مصحفی کا انداز متقدمین ہی سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زبان یہاں بھی انشا اور جراءت دونوں سے پیاری ہوتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں وہ پتے کی باتیں سُننے میں نہیں آتیں جن کے لیے جراءت مشہور ہیں۔ جراءت کا چلبلا پن ان کی اپنی فطرت کا تقاضا تھا، جس سے مصحفی کو کوئی طبعی مناسبت نہ تھی چنانچہ جب کبھی خواہ مخواہ کی ریس میں اپنے اوپر بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں تو مبتذل ہو جاتے ہیں جو ان کے وہاں شاق گزرتا ہے۔ مثلاً مصحفی جیسے شاعر سے ہم اس قسم کی باتیں سُننے کی توقع نہیں رکھتے:۔

یہ طرفہ اِختلاط نکالا ہے تم نے واہ
آتے ہی پاس چٹ سے وہیں مار بیٹھنا

پانی بھرے ہے یارو یاں قرمزی دوشالہ
لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

لیکن اکثر مقامات پر اس تقلید میں بھی کامیاب رہے ہیں اور تخیل کی مدد سے ان خارجی موضوعات میں بھی جراءت سے زیادہ پیاری اور مزے دار باتیں کہہ گئے ہیں، یہ ان کے رچے ہوئے مذاق کا نتیجہ تھا۔ متقدمین کے غائر مطالعہ سے اُنھوں نے اپنے تخیل اور اپنی فطرت شعری کی تربیت کی تھی۔ اس لیے جہاں جہاں خارجی معاملات باندھے ہیں اثر وکیفیت کو قائم رکھا ہے مثلاً:۔

قدم اس دھج سے کچھ پڑتا ہے اس غارت گرِ جاں کا
کہ دل ہر ہر قدم پر لوٹ ہے گبر و مسلماں کا

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہنچے تمھیں
کہ پلٹتی ہے بُری طرح سے سرکار کی گیند

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چُرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر

اے مصحفیؔ تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں
میری نظر مجھی کو لگے، دور چشمِ بد
اس وقت بن رہے ہو پری، پھر کے دیکھ لو

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

اوّل تو یہ دَھج اور یہ رفتار غضب ہے
تِس پر ترے پازیب کی جھنکار غضب ہے

مصحفی کے کلام میں اس عریانی کا شائبہ بہت کم ہے جس کی جراءت وغیرہ کے یہاں بہتات ہے۔ ان کی شاعری خالص شاعری ہے، ان کے اندر جتنی نزاکتیں اور لطافتیں اور جتنی رنگینیاں ملتی ہیں ان کی زبان اور طرزِ ادا میں جو سجاوٹ اور طرحداری ہوتی ہے وہ سب ان کے ذوقِ شعر اور مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ اُنھوں نے بہترین روایاتِ شاعری کو اخذ کر کے اپنی چیز بنالیا تھا۔ اردو میں دو شاعر ایسے ہیں جن کو روایات وصور کے شاعر کہہ سکتے ہیں۔ مصحفی اور حسرت موہانی۔ ان کی شاعری کے محرکات زندگی کے تجربات اتنے نہیں جتنے کہ خالص شاعری کے تجربات۔ شاعری کے تجربات سے میری مراد اساتذہ کے کلام کا ذوق وانہماک کے ساتھ مطالعہ کر کے اس کو اپنے رگ وپے میں جذب اور ساری کر لینا ہے۔ مصحفی اور حسرت دونوں نے یہی کیا ہے۔ دونوں کو شاعر بنانے کے لیے تخیل اور اساتذہ کے کلام کافی تھے۔

مصحفی کا کلام چاہے وہ خارجی پہلو رکھتا ہو چاہے داخلی ایک خاص کیفیت کا حامل ہوتا ہے ان کی شاعری ارتسامی Impressionistic ہوتی ہے۔ ان کے محاکات حُسن کاری Art کی ایک خاص بصیرت لیے ہوتے ہیں۔ ایک شعر سُنیے :۔

کیا نظر پڑ گئیں آنکھیں وہ خمار آلودہ
شفق صبح تو ہے زور بہار آلودہ

یوں تو بظاہر مصحفی کے کلام میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی اور آزاد کی ہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ غزلوں میں ہر رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص رنگ کی قید نہیں۔ لیکن گہری نظر ڈالنے سے مصحفی کے کلام میں ہم کو ایک تیز انفرادی کیفیت محسوس ہوگی جو انھیں کی چیز ہے اور جس کو میں نے ایک اندرونی فضائی کیفیت بتایا ہے۔ مصحفی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کے اشعار میں رنگ اور فضا کا احساس پیدا کیا۔ اور یہی ان کی سب سے زبردست انفرادی خصوصیت ہے، جس کا اثر بعد کی اردو شاعری میں کافی دور تک پڑا اور جس کی وجہ سے جراءت کے مقابلہ میں شاعروں نے مصحفی کو زیادہ نظر کے سامنے رکھا۔ کچھ

مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفتِ دل
اب تلک دامن صحرا ہے غبار آلودہ

اس شعر میں ایسی گہری اور چھا جانے والی فضا پیدا کردی ہے کہ سنگلاخ زمین کا خفیف سے خفیف احساس بھی پیدا ہونے نہیں دیا ہے۔اسی طرح کے کچھ اور اشعار سُنیے :۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

تیری رفتار سے اِک بے خبری نکلے ہے
مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے

جس بیابانِ خطرناک میں ہے اپنا گزر
مصحفیؔ قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں

کس نے رکھے ہیں قفس ان پہ گرفتاروں کے
کانٹے کیوں سُرخ ہیں سب باغ کی دیواروں کے

مجنوںؔ گورکھپوری

مصحفی کا رنگِ سخن

میں مصحفی کا جائزہ لے رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں اپنے ہمعصر مصحفی کی تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ بچپن میں اردو کے ہر طالب علم کی طرح میں بھی آبِ حیات کے اس جلوس میں شرکت کر چکا ہوں جس میں آگے آگے لوگ مصحفی کی وہ ہجو پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک مصرع یہ تھا کہ:

لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

اور میں پیچھے پیچھے تالیاں بجانے والوں میں سے تھا۔ آبِ حیات اور شعر الہند دونوں کتابیں مصحفی کے باب میں یہ بتاتی ہیں کہ:

''مصحفی کی غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں۔ کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں۔''

اور یہ کہ وہ:

''کسی خاص رنگ کے پابند نہیں''

حسرت موہانی کا انتخاب مصحفی کے اپنے ذوقِ شعر پر دلالت کرتا ہے۔ وہ مصحفی کے بارے میں یہی رائے دیتے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی رنگ نہیں، ان کا رنگ شعرائے متقدمین اور متاخرین کا رنگ ہے۔ البتہ حسرت موہانی اُنھیں میر اور مرزا کے بعد سب سے بڑا غزل گو بتاتے ہیں۔ مجنوں گھورکھپوری کی رائے بھی اسی قسم کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مصحفی کے کلام کی خصوصیت تقلید اور انتخابیت ہے۔ اس سلسلے میں فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر سید عبداللہ

کے مضامین اہم ہیں کہ یہ دونوں حضرات مصحفی کے یہاں ایک خاص رنگ دریافت کرتے ہیں۔ فراق صاحب کا خیال ہے کہ مصحفی کے کلام میں ایک ''رچا ہوا اعتدال''، ''تحت النفسیاتی کیفیت''، ''شبنم کی نرمی''، ''شعلۂ گل کی گرمی'' ہے۔ ''اس کے یہاں تنقیدِ حیات نہ سہی ایک مزاجِ حیات ہے۔'' ان کے بقول مصحفی کی شاعری دلی اور لکھنؤ اسکول کا سنگم ہے فراق صاحب لکھتے ہیں: ''جذبات کی میانہ روی، تخیل و وجدان کو قدم بہ قدم اس خارجیت کی طرف بڑھالے چلی جہاں سے ہم مصحفی کو دلی اور لکھنؤ کے اسکول کے دوراہے پر کھڑا یا آگے بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔''

فراق صاحب کا خیال ہے کہ میر کی شاعری کا سوز و گداز مصحفی کے کلام میں نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ان کے یہاں نشاطیہ کیفیت ہے۔ کلام میں ایک رنگین فضا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا تنوع ہے جو میر کے یہاں ممکن ہی نہ تھا۔

''میر کا سوز و گداز یا مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاہا یا اُن سے پیدا نہ ہو سکا۔''

''میر اور مصحفی میں وہ فرق ہے جو دوپہر اور غروبِ آفتاب میں پایا جاتا ہے اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں، اُسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے۔''

''غم انگیز وجدان میں تنوع کے اتنے امکانات نہیں ہوتے جتنے نشاط آمیز وجدان میں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مصحفی کے یہاں بہ نسبت میر کے تنوع زیادہ پایا جاتا ہے۔''

فراق صاحب کی رائے مصحفی کے بارے میں جتنی مثبت ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے اتنی ہی منفی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے مضمون ''مصحفی کا کارنامۂ خاص اردو شاعری میں'' میں مصحفی کے بارے میں ان آرا کا اظہار کرتے ہیں:

1۔ ''مصحفی کی شاعری جذبے کی اس شدت سے محروم ہے جس کی وجہ سے میر کے اشعار نشترِ آبدار بن کر دلوں میں پیوست ہو جاتے ہیں، یا مثلاً درد کا کلام بصیرتوں کا کلام بن کر ہمارے ذہن و نفس کو قوت اور جلا بخشتا ہے۔''

2۔ ''مصحفی کے کلام میں کوئی معین، واضح جذباتی نقطۂ نظر موجود نہیں۔ نہ ذاتی، نہ حیاتیاتی، نہ کائناتی۔ البتہ ایک لطیف سی افسردگی ضرور پائی جاتی ہے جو ان کے ذہن کے لاشعوری رخوں اور جہتوں کو ظاہر کرتی ہے جس کے طفیل ان کے کلام میں تاثیر کی چاشنی اور درد کی خفیف سی چبھن پیدا ہوگئی ہے۔ ان کے پاس ان مضامین کی کمی ہے جن کا سرچشمہ گہرے جذبات اور شدید احساسات سے پھوٹتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے نفسِ انسانی کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں گہرے تفکر اور غور و فکر کی کمی ہے۔ ان کا مطالعۂ کائنات سطحی ہے۔ زندگی کے اسرار کو بے نقاب کرنے کی اُنھیں فرصت نہیں ملتی۔ جذبۂ عشق کے متعلق بھی ان کے اپنے تجربے بہت کم ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کے تجربے ہیں ضرور۔ ان میں سے بعض تلخ بھی ہیں۔ عشق و عاشقی کی عام باتوں پر وہ اچھا عبور رکھتے ہیں۔ انھی باتوں میں ذاتی تجربے کی ہلکی رنگ آمیزی سے کچھ بات پیدا ہوگئی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کے کلام میں ذاتی تجربے کی یہ آمیزش بھی نہ ہوتی تو ان کا کلام پڑھنے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ ان کے کلام میں تاثیر کی کمی اگر ہے تو اس وجہ سے ہے کہ ان کے جذبات میں خلوص کم معلوم ہوتا ہے۔ احساسات میں صداقت معدوم ہے۔ ان کے کلام میں ذاتی تجربات کی جھلک بہت مدھم ہے۔ ان کے اشعار میں درد و الم کم ہے۔ تاہم ان کا کلام پُر تاثیر اشعار سے خالی بھی نہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے ایک قسم کا ہلکا پھلکا غم انگیز تاثر ضرور پیدا ہوتا ہے۔''

3۔ ''مصحفی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اردو غزل کے لیے اظہار و بیان کے وہ لطیف پیرائے تیار کیے جن کے بغیر تغزل کی تکمیل ممکن نہیں۔ مصحفی پہلا شاعر ہے جس نے تجربات اور احساسات کے مقابلے میں زبان اور طرز ادا کو اہمیت دی اور صوت وصورت کی خوبی اور شیریں الفاظ و تراکیب کا سہارا لیا۔ وہ شدت جذبات

پر لطافتِ جذبات کو ترجیح دیتے ہیں، ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ یہی نفاست و لطافت ہے۔ الفاظ و تراکیب کے سبک اور خوشگوار سانچوں کے علاوہ لے کاری اور غنائیت ان کی شاعری کا وصف خاص ہے۔''

4۔ ''مصحفی کی غزل کے الفاظ ان کی غزل کے معانی و تصورات سے ہم آہنگ ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی غزل کے معانی و تصورات لازماً ان کے ذہن و نفس کی گونا گوں مگر منفرد خصوصیات و کوائف کے حامل ہوں گے۔''

5۔ ''وہ دھیمے مبہم اور مدھم نقوش و تصورات کے شاعر تھے۔ ان کا ذہن شوخ، شدید اور پُر جوش حالتوں اور کیفیتوں کا دلدادہ نہیں۔ ان کی شاعری کی معنوی فضا خواب آلود سی ہے۔ رنگوں کے سلسلے میں ان کی تصویروں کا رنگ تب ظاہر ہوتا ہے جب وہ حنا کا مضمون باندھتے ہیں اور حنا وہ دھیما اور مٹا مٹا رنگ ہے جسے مصحفی کی حُسن پسند آنکھ سب سے زیادہ پسند کرتی ہے۔

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا

ان تمام باتوں کے بعد سید صاحب مصحفی کا رنگ خاص یہ بتاتے ہیں:

(1) جذبات کا دھیما پن (2) الفاظ و تراکیب کے لطیف سانچے

(3) صوت و صورت کی خوشنمائی (4) دل خوش کن لے کاری، پھر یہ محاکمہ دیتے ہیں کہ:

''مصحفی ایک متوسط درجے کے شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں ان کی شاعری نہ بغایت بلند ہے اور نہ بغایت پست۔ ان کے کلام میں بلند ترین فضائیں شاید کم سے کم ہیں۔''

میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے مضمون سے طویل اقتباسات اس لیے نقل کیے ہیں کہ ان کے اس آخری نتیجہ کا جواز یا عدم جواز بالتفصیل معلوم ہو سکے۔ وہ بنیادی طور پر تو مصحفی کے کلام کو جذبہ و احساس، فکر و بصیرت سے عاری بتاتے ہیں، مگر شاید اس کے

منفرد رنگ کی تلاش کے لیے اس کی غزل کے الفاظ اور معانی و تصورات میں ہم آہنگی بھی دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے بقول:

''ان کے معانی و تصورات لازماً ان کے ذہن و نفس کی گوناگوں مگر منفرد خصوصیات وکوائف کے حامل ہوں گے۔''

گو ڈاکٹر صاحب پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ:

''جذبۂ عشق کے متعلق بھی ان کے تجربات بہت کم ہیں۔''

اور یہ کہ:

''ان کے کلام میں ذاتی تجربات کی جھلک بہت مدھم ہے۔''

اور مصحفی کے مدھم پن کو ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حنا کا رنگ مٹا مٹا اور مدھم ہوتا ہے اور پھر مصحفی کا وہ شعر بھی اپنی دلیل کے ثبوت میں پیش کیا ہے جس کے بارے میں ہم کم فہم اب تک یہی سمجھتے آئے تھے کہ وہ خاصے شوخ رنگ کا شعر ہے:

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا

چلیے یہی سمجھ لیجیے کہ رنگ مدھم ہے مگر فراق صاحب کو کیا کیجیے، وہ تو یہ کہتے ہیں:

''رنگ روپ، صورت شکل، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اُتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں۔ اس کا کلام ایک تصویر خانہ یا پکچر گیلری ہے۔''

خیر اب یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ مصحفی کی کلیات بقول مولانا آزاد آٹھ دیوانوں پر مشتمل ہے جو ابھی تک طبع ہو کر ہمارے سامنے نہیں آئی مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی کی رائے کے نتیجے میں مصحفی کی تقلید اور انتخابیت کے تصورات پیدا ہوئے۔ مصحفی کے بارے میں بیشتر آراء مولانا حسرت موہانی کے انتخابِ کلامِ مصحفی کے تاثرات کا بھی نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ حسرت کے انتخاب کے علاوہ ایک اور دیوان ''آیاتِ مصحفی'' جو لکھنؤ

سے طبع ہوا ہے، میرے سامنے ہے۔ اس میں سے میں ایک پوری غزل یہاں نقل کرتا ہوں:

سوے نجد جی کا یہ قافلہ عجب اس کا کیا جو چلا نہیں
کہ ہواے شدتِ برف ہے ابھی قافلے کی ہوا نہیں

رہی اُس کے ہاتھ میں دیر کیوں مجھے آرسی سے گلہ نہیں
اسے اس کی آنکھ ہی کہتی ہے نظر ایسے رخ سے پھرا نہیں

ابھی اپنے رتبہٴ حسن سے یہاں باخبر تو ہوا نہیں
کہ غزل سرا ترے باغ میں کوئی مرغِ تازہ نوا نہیں

وہ درختِ برق رسیدہ ہوں نہیں لگتے جس میں گل وثمر
وہ نہالِ یاس دمیدہ ہوں جسے آرزوے صبا نہیں

ہمیں کب چمن کی ہے آرزو، نہیں اتنے کشتہٴ رنگ و بو
جو دلِ شگفتہ ہو روبرو تو قفس سے تنگ فضا نہیں

میں جفائیں جھیلی ہیں سینکڑوں ترے عشق میں بدونیک کی
یہ ہزار شکر کہ آج تک گلہ گردِ لب کے پھرا نہیں

حذر اس کو کہتے ہیں دوستاں مجھے قتل کر کے وہ نوجواں
ہوا جس طرف کہ قدم زناں مرا خوں ادھر کو بہا نہیں

جو گلی میں یار کی جاؤں ہوں تو اجل کہے ہے یہ رحم کھا
تو ستم رسیدہ اُدھر نہ جا کوئی زندہ واں سے پھرا نہیں

مجھے عشق رکھتا ہے سرنگوں مرا حال پوچھو نہ کیا کہوں
میں حبابِ بحر کا شیشہ ہوں مرے ٹوٹنے میں صدا نہیں

ترے نخلِ حسن کی کونپلیں ابھی نا شگفتہ ہیں اے پری
جو نسیم آئی ہے اس نے بھی انھیں کچھ سمجھ کے چھوا نہیں

نہ میں رہنے والا ہوں باغ کا نہ صفیر سنج ہوں زاغ کا
مجھے ڈھونڈے کوئی سو کس جگہ کہیں آشیانِ ہما نہیں
کوئی زخم خوردہ ہے خار کا کوئی خوں طپیدہ بہار کا
ہے مرا ہی حوصلہ مصحفی کہ کسی سے مجھ کو گلہ نہیں

میں نے یہ غزل اس لیے نقل کی ہے کہ یہی ایک غزل تقلید اور انتخابیت سطحی مطالعۂ کائنات، جذبات میں خلوص کی کمی اور اوسط درجے کی شاعری کے محاکموں کا رد ہے۔ بہرحال آپ اسی غزل سے مصحفی کے کلام کی گوناگوں خصوصیات کا اندازہ لگائیے۔ میں مصحفی کے اشعار کثیر تعداد میں نقل کروں گا۔ آزاد اور حسرت کی اس رائے کا کہ مصحفی کسی ایک رنگ پر قانع نہ تھے، ایک مطلب اور شاید زیادہ صحیح مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصحفی کی شاعری کا کینوس دوسرے شعرا کے مقابلے میں زیادہ وسیع تھا اور یہ کہ ان کے مشاہدے اور تجربے میں تنوع زیادہ تھا۔ جس کے باعث وہ مختلف رنگوں میں شعر کہہ سکتے تھے۔ خیر ابھی یہ بات یہیں چھوڑیے اور یہ دیکھیے کہ کہیں مصحفی کے بارے میں تنقید کے بنیادی نقطہ ہائے نظر میں فرق تو نہیں ہے۔ کچھ ناقدین مصحفی کے کلام میں تقلید کا عنصر دیکھتے ہیں تو دوسرے ان کے یہاں انفرادی رنگ کا پتہ چلاتے ہیں۔ کلاسیکی نقطۂ نظر والے ''تقلید'' کو ان کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔ رومانی نقطۂ نظر کے لوگ انفرادیت کو شاعری کی روح خیال کرتے ہیں۔ تاہم اگر شاعر بڑا ہے تو اس کے کلام میں تقلید اور انفرادیت دونوں آپس میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ تقلید انفرادیت کے بغیر بنجر پن ہے۔ اور انفرادیت محض انفرادیت ہو کر انتشارِ ذہنی بن جاتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بڑی شاعری روایت کے بھرپور احساس سے جنم لیتی ہے اور ہر بڑا شاعر روایت کے احساس سے اپنی ''شعری شخصیت'' کی تعمیر کرتا ہے۔ مصحفی کو روایت کا کتنا احساس تھا اور روایت میں رہ کر اس نے اپنی شخصیت و انفرادیت کی کتنی تلاش کی اور اس تلاش میں اسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ اب مصحفی سے سنیے:

پیشتر ہم سے بھی تھے اہلِ سخن کیا کیا کچھ
کھِل گئے باغِ معانی میں چمن کیا کیا کچھ
تازگی خاک رہی نظم کی یہ کس سے کہوں
کر گئے کام حریفانِ کہن کیا کیا کچھ
دستِ مشاطۂ افکارِ خرد منداں سے
زلفِ مضمون نے پائیں ہیں شکن کیا کیا کچھ
نے وہ تیر اور وہ کماں ہاتھ میں اب ایک کے ہے
وادیِ شعر میں تھے صید فگن کیا کیا کچھ
مصحفی سات برس تک یہی پاپڑ بیلے
ہم نے دیکھے ہیں زمانے کے چلن کیا کیا کچھ

اور پھر اپنے فن کے بارے میں:

نکالی ہیں جو ہم نے اوجِ سخن
زمینیں وہ سب آسماں ہوگئیں
ہر نفس تازہ غزل کہتے ہیں
ہر نفس تازہ نوا بندی ہے
مصحفی شعر تازہ کہنے میں
وقت کا اپنے تو فغانی ہے
صدقے ہوں سخن کے مصحفی میں
صدقے ہے مرے سخن ہمیشہ

پھر اپنی زبان کے بارے میں:

ہے وہ جو طرز اعلیٰ اردو کی اس زباں میں
اپنی طرف ہم اس کو منسوب کر چکے ہیں

مصحفی کام ہے اندازِ فصاحت سے جنھیں
وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کیسی زباں لکھتے ہیں

اب زبان کی بات نکل آئی ہے تو اس معروضے پر بھی غور کرتے چلیے کہ شاعری کا اپنا ایک سفر ہوتا ہے اور وہ سفر فطرت اور موضوع سے فن اور زبان کی طرف ہوتا ہے۔ میں یہاں دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ یہ بحث مستند اساتذہ کی ہے۔ میں تو محض اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ شاعری اپنی اولین غزلوں میں جذبات و احساسات، خیالات و افکار کا اظہار کرتی ہے اور آگے بڑھتی ہے تو اظہار کی پختگی اور فنی تزئین کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اظہار کے نئے نئے وسائل، زبان کے امکانات، بندشوں کی چستی، تمثال کاری اور آہنگ یہ سب چیزیں اہم ہونے لگتی ہیں۔ غرضیکہ یہ سفر خیال اور جذبے سے اسلوب اور فن کی جانب ہوتا ہے۔ آخری حد پر پہنچ کر ہم کس انقلاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس بات کو آپ ایک اور طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کے اس سفر کے آغاز میں شاعر اپنی ذات کے حوالے سے گرد و پیش کو دیکھتے ہیں پھر ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں گرد و پیش کے حوالے سے اپنی ذات کو دیکھنے کی سعی ہوتی ہے۔ آسانی کے لیے پہلے رجحان کو داخلیت کہہ لیجیے کہ اس میں ذہنی و قلبی واردات کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلے رجحان میں موضوع اور دوسرے میں اسالیب فن اہم ہو جاتے ہیں۔ اب آپ اس بات کے پیشِ نظر مصحفی کا مقام اُردو شاعری میں متعین کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ موضوع اور فن، داخلیت اور خارجیت کے دوراہے پر ہیں اور اس لیے فراق صاحب انھیں دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا سنگم کہتے ہیں۔

شاعر کے سفر کی طرح یہی سفر تہذیب (Culture) کا بھی ہوتا ہے۔ تہذیب (Culture) اس مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں سے ہم اپنے جذبات و احساسات کو منظم و مہذب کرنا شروع کرتے ہیں۔ جب انسان داخلی فطرت پر فتح پاتا ہے وہ مہذب ہوتا ہے اور جب خارجی فطرت پر فتح پاتا ہے تو متمدن ہوتا ہے۔ بنیادی جذبات اور داخلی

فطرت کو فن میں ڈھالنے کا ہی نام تہذیب ہے۔ یہی کام مصحفی کا ہے۔ مصحفی کے یہاں جذبہ کا بھرپور اظہار نہیں ہے۔ اس کے یہاں جذبہ واحساس کی تنظیم ہے اور ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ مصحفی شدت جذبات پر لطافت جذبات کو ترجیح دیتے ہیں۔ فراق صاحب جب یہ کہتے ہیں کہ میر کا سوز مصحفی کے یہاں ساز بن گیا ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جذبۂ فن میں ڈھل کر تہذیب بن گیا ہے۔ اگر آپ مصحفی کے یہاں تصنع دیکھنے کے بجائے تہذیب کی مختلف صورتیں دیکھیں تو آپ کو اس کے یہاں قدروں کا احساس ایک انسانی سطح، خلوص نیت، قناعت پاسِ ادب اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ معاشرتی رشتوں کے تہذیبی تیور، اشارے، زبان اور لہجہ اور وہ بنیادی مفروضات جن پر معاشرتی وتہذیبی عمارت کھڑی ہوئی تھی، یہ تمام چیزیں نظر آئیں گی۔

پاسِ عصمت نے تری تجھ سے مجھے دور رکھا
ورنہ طبعِ بشری کا تو میں مجبور نہ تھا

غبار دل پہ نہ آیا کسی طرح ہر چند
میان گرد یتیمی رہا گُہر اپنا

شکر کہ میں کبھی نہ کیں غیر کی نکتہ چینیاں
میرے ہی رخ پہ وا ہوا دیدۂ عیب بیں سدا

اے مصحفی استاد ہوئے گا وہی آخر
جو میری طرح عزت استاد کرے گا

مردِ قانع نہ کرے مجلسِ شاہاں کی ہوس
خوار رکھتی ہے بس انسانوں کو انساں کی ہوس

آہ بھاتا نہیں دل کو ترا جانا شبِ وصل
منھ دکھا کر نہ مجھے پیٹھ دکھانا شبِ وصل

ہر چند کہ ہو لولوے دنیا متجلی

کب معتقدِ زیور و پوشاک ہوئے ہم
رُخ اس کا میں اے مصحفی کیونکے دیکھوں
نگاہیں مری بدگماں ہوگئی ہیں
ان منعموں سے مانگتے کچھ ہم، پہ کیا کریں
حرفِ سوال ہے لب اظہار پر گراں
شوخ مضمون سے حذر کرتے ہیں
شعر میں جن کے حنا بندی ہے
کہہ دو اس پردہ نشین سے ترے سودائی کو
بے قراری سرِ بازار لیے پھرتی ہے
جوں ہیزمِ تر کیوں نہ دھواں آگ کا پھیلے
اک آگ ہے سینے میں کہ سلگاتی ہے مجھ کو

ذرا مندرجہ بالا اشعار میں معاشرتی تہذیب کے رنگ دیکھنے کے ساتھ ساتھ ضبطِ نفس اور قناعت کی انسانی اقدار پر مصحفی کا ایمان بھی دیکھیے اور پھر خود یہ فیصلہ کیجیے کہ کیا اس کے یہاں وہ کیفیت ہے جسے فراق صاحب ترسنے والی کیفیت کہتے ہیں۔ اس شعر میں بھی جسے فراق صاحب نے مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آگئی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

ترسنے والی کیفیت نہیں ہے، البتہ لذت ہے اور مصحفی حسن کے مشاہدے سے ہمیشہ لذت لیتے ہیں۔ لیکن یہ لذت بھی تہذیبِ نفس کی حدود سے باہر نہیں ہوتی (ترسنے والی کیفیت مجبوری کا اور ضبطِ نفس قوتِ ارادی کا اظہار ہوتا ہے) بہر کیف آپ اس تہذیبی اظہار کی اور صورتیں بھی دیکھیے۔ زبان و بیان کی چاشنی، بندش کی چستی، ردیف وقوافی کا

متنوع استعمال، لہجے کی صفائی غرضیکہ ایک فن کارانہ پختگی ملاحظہ کیجیے:

مجھ پر ہی تیغِ ناز نہیں اُس نے تیز کی
مارے گئے ہیں یاں اِسی دستور سے بہت
تیغِ جفائے چرخ رہی ہے سدا بلند
سولی پہ اس نے کھینچے ہیں منصور سے بہت

غم چھپائے سے میاں مصحفی کب چھپتا ہے
آپ کرتے ہیں مرے سامنے تقریر عبث

نہ چرچا کرو میرے دیوانے پن کا
یہ عالم بھی رکھتا ہے اک عالم آخر

یادگار گذشتگاں ہیں ہم
خوب دیکھا تو پھر کہاں ہیں ہم
شمع کی طرح بزمِ ہستی میں
داغ بیٹھے ہیں، اور رواں ہیں ہم
رہے جاتے ہیں پیچھے یاروں کے
گردِ دنبالِ کارواں ہیں ہم
آبیارِ سخن ہے اپنی زباں
لفظ و معنی کے باغباں ہیں ہم
جس باغ میں دیکھا گلِ نورستہ شگفتہ

اس باغ کے خار و خس و خاشاک ہوئے ہم

اس باغ میں آئے تو و لے دست صبا سے
پیراہنِ گل کی سی طرح چاک ہوئے ہم

اے مصحفی جتنے تھے چبھے پاؤں میں کانٹے
اُتنے ہی رہِ عشق میں چالاک ہوئے ہم

تماشے کی شکلیں نہاں ہو گئی ہیں
بہاریں بہت یاں خزاں ہو گئی ہیں

نکالی ہیں جو ہم نے اوجِ سخن سے
زمینیں وہ سب آسماں ہو گئی ہیں

کوچے میں اس کے جا کے کروں کیا میں تنگِ خلق
سایہ ہے میرا سایۂ دیوار پر گراں

چاہت تری جذب اور ہی دکھلاتی ہے مجھ کو
بیتابیِ دل کھینچے لیے جاتی ہے مجھ کو

ماہِ نو سے وہ تیغ ابرو
کرتی رہے بانکپن ہمیشہ

پھولیں گل و یاسمن ہمیشہ
سرسبز رہے چمن ہمیشہ

غربت میں رہے نصیب ہم کو
خوش طالعیِ وطن ہمیشہ
رہنے کی نہیں ہے چیز غافل
یہ صحبتِ جان و تن ہمیشہ
واں بن گئے قصے اور افسانے
یاں بند رہے دہن ہمیشہ
آتی ہے صدائے تیشہ اب تک
جیتا رہے کوہ کن ہمیشہ
صدقے ہوں سخن کے مصحفی میں
صدقے ہے مرے سخن ہمیشہ

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر
یہ عجب طرح کی پابندی ہے

یا رب آباد ہوئیں گھر سب کے
پھریں خط لے کے نامہ بر سب کے
ایک عاشق پہ التفات نہ کر
حال پر رکھ میاں نظر سب کے
تھے جو سلطانِ بحر و بر آخر
گئے برباد تاجِ زر سب کے
وائے دنیا، کہ رلتے پھرتے ہیں
خاک میں کاسہ ہائے سر سب کے

مصحفی یہ جو ہیں امیر و فقیر
دل میں ہے موت کا خطر سب کے

آپ نے مصحفی کے دور کی تہذیب، اس تہذیب میں پیدا شدہ طرزِ احساس، زندگی اور معاشرت کے بارے میں قدری نقطۂ نظر، یہ سب دیکھا اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ شاعری کے سفر میں زبان و بیان کے سانچوں کی اہمیت کس طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر مصحفی کے یہاں زبان اور معانی آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ دونوں میں کسی قسم کے بُعد کا احساس نہیں ہوتا۔

آبیارِ سخن ہے اپنی زباں
لفظ و معنی کے باغباں ہیں ہم

ایک اہم بات اور وہ یہ کہ داخلی احساسات اور واردات سے خارجی مشاہدات کی طرف تہذیبی سفر کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ فرد معاشرے کا حصہ ہے اور فرد اور معاشرے کے اس تعلق میں معاشرے کو اولیت حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ اب شعری اظہار فرد کا نہیں معاشرتی فرد کا اظہار ہے۔ اس اظہار میں گرد و پیش اور اس کے ٹھوس مظاہر اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یوں شاعری میں معاشرتی رشتے، تہذیبی زندگی کی پوری خارجی شکل، مختلف صورتوں میں اظہار پانے لگتی ہے۔ مصحفی اور اس کے بعد کے شاعروں کے یہاں اردو شاعری کا یہ تہذیبی سفر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری کو کنگھی، چوٹی، کرتی، انگیا، مسی، سرمہ، آرسی، آئینہ، پھول، پان کی شاعری کہہ کر رد کر دینا شاعری کے تہذیبی عنصر سے انکار کے مترادف ہے۔ ایسی شاعری محض محسوس کرنے والی چیز نہیں ہوتی۔ وہ دیکھنے، سونگھنے اور سننے کی چیز بھی ہو جاتی ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ حواس کے ذریعے ہوتا ہے اور اسی لیے خارجی اشیاء کا شاعری میں ذکر ہمیں حسی سطح پر متاثر کرتا ہے۔ حسی تاثرات کی شاعری مصحفی سے پہلے بھی ہوئی ہے مگر مصحفی کی غزلوں میں حسی تاثرات زیادہ ہیں۔ ٹھوس

اشیاء سے لگاؤ کی ہی ایک صورت یہ ہے کہ غزل میں ٹھوس ردیفیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس رجحان کو ہم تجرید سے تجسیم کی طرف مراجعت کا رجحان بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے عہد میں بھی غزلوں میں یہ رجحان عام نظر آتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد سے اردو شاعری کے سفر کو تجرید سے تجسیم کی سمت سفر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب میں مصحفی کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جن میں مختلف قسم کی تمثالیں ہیں۔ کہیں سیدھی سادی تصویر ہے کہیں کسی مجرد خیال کو تصویر بنایا گیا ہے۔ کہیں تصویر اور خیال اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ہم انھیں جدا نہیں کر سکتے۔ کہیں تصویر مکمل ہے کہیں نامکمل۔ کہیں تصویریں حرکی ہیں تو کہیں ساکن۔

لینے کو آغوش میں میرے تئیں
ہر شجرِ وادیِ نرمان پھٹا

ہے یہ یقیں کہ زلف کے کشتہ کی خاک سے
اُٹھے گا گرد باد بھی پیچیدہ دیکھنا

رفتار تیری دیکھ کے حیران رہ گیا
آگے ترے اُٹھا نہ سکا سروِ باغ پا

برنگِ طائرِ رنگ حنا ہوں میں وہ اسیر
جو چھوٹ کر نہ شناسائے آشیانہ ہوا

چمنِ عشق میں کی دست درازی ہم نے
نخلِ خواہش سے گلِ حسرت و ارماں توڑا

شاکی تھا رنگِ گل سے میں آگے ہی کیا کہوں
لالے نے اور آگ لگا دی چمن کے بیچ

گل ہو نہ بے دماغ کہ آتے ہی باغ میں
بادِ صبا نے خاک اُڑا دی چمن کے بیچ

مرغِ اسیر سر نہ پٹکنے سے باز آئے
جب تک نہ تیلیوں کا قفس کے ہو رنگ سرخ

نالہ سر کھینچے ہے یوں سینے کو اکثر توڑ کر
نخل جوں نکلے کوئی پتّھر سے، پتّھر توڑ کر

یوں چشمِ تر سے چہرے پہ آنسو رواں ہوئے
دریا سے جیسے لائے کوئی نہر کاٹ کر

بھپتا بھپتا رنگ اُس کا، اور وہ مکھڑا دلفریب
ہائے یہ عالم ہے کس تصویر کے انداز میں

روبرو اس کے زباں تک جو نہیں آتی ہے بات
کس نے باندھے ہیں مری قوتِ گفتار کے ہاتھ

ناہید سے کہتا ہے فلک تیرے دمِ رقص
ہاں اس کے ذرا ہاتھ اُٹھانے کی ادا دیکھ

حیران سا رہ جائے گا منھ کھول کے اپنا
آئینہ ترے منھ کے پھرانے کی ادا دیکھ

جاتے ہیں لگے سایہ صفت سائے کے پیچھے
بازاری ترے ہنسنے ہنسانے کی ادا دیکھ

نذر کو اس گلِ نورستہ کے، دامن میں نسیم
بھر کے پھولوں کا اک انبار لیے پھرتی ہے

یہ کس نے کھولے ہیں دریا پہ کاکلِ پیچاں
جو موج دوڑی ہوئی بے قرار آتی ہے

کچھ صبا کوچے سے اُس کے جو چھپا کر لے گئی
شاید اُس کی مشتِ خاکِ پا اُٹھا کر لے گئی

اُس چہرۂ گل رنگ سے خط جس نے نکالا
کھینچی ورقِ شعلہ پہ تصویر دھوئیں کی

چہرے کی طرح آتشِ بے دُود بنائی
زلفوں کی جگہ کھینچ دی تصویر دھوئیں کی

مثلِ گردِ راہ ہوں میں راکبِ دوشِ نسیم
دوش پر اپنے لیے پھرتی ہے ویرانی مجھے

کھینچے ہے نسیمِ سحری منھ سے دوپٹہ
پر ہاتھ پکڑ تجھ کو جگاتی نہیں وہ بھی

میں اک نالہ ایسا کیا شب چمن میں
کہ شعلہ سا برگِ درختاں سے گزرا

دیکھ آئینے میں اک مہِ تاباں ہے دوسرا
تجھ سا ہی تیری شکل کا حیران ہے دوسرا

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی

ہائے تیرا مسکرا کے چلنا
پھر شرم سے سر جھکا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھلکھلاتے آنا
اور راہ میں منھ بنا کے چلنا
ہے قہر کہ دیکھ مجھ کو پیچھے
پھرتی سے قدم اُٹھا کے چلنا
نیچی نظروں سے دیکھنا ہائے
پھر تس پہ نظر چُرا کے چلنا

مصحفی محض تصویریں بنانے پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ گرد و پیش سے خوشبو، رنگ، آہنگ اور ذائقے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک حواس کو دوسرے حواس میں منتقل بھی کرتے ہیں۔ باہر کی کیفیتوں کو محض دکھاتے نہیں بلکہ یوں اپنے داخلی ردِعمل کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ فراق صاحب بھی مصحفی کو حواسِ خمسہ کا شاعر بتاتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے:

دیکھے جو مصحفی نے ترے تمتمائے گال
بستر میں تپ کے جا کے وہ آتش زباں گرا
اس جوششِ بہار میں ہم لوگ مر نہ جائیں
سیمیں بروں کا سینۂ بالیدہ دیکھنا
اللہ ری صفا گورے بدن کی ترے کافر
تجھ کو شبِ مہتاب میں ڈھونڈا تو نہ پایا
جب بر میں ترے جامۂ چسپاں نہیں ہوتا
صد چاک کبھی گل کا گریباں نہیں ہوتا

کیا کھلا تھا باغ میں شب نامۂ گیسوے دوست
نکہتِ گل سے مجھے آتی ہے ہر دم بوے دوست

لگی یہ غم کی دل و جانِ بے فراغ کو چوٹ
کہ سانس لینے سے لگنے لگی دماغ کو چوٹ

تلخی شبِ فراق کی دے وصل کا مزا
چاہے تو زہر کو بھی کرے آسماں لذیذ

وہ تشنہ کام ہوں کہ مجھے آبِ شورِ تیز
لگتا ہے اُس کے کف سے دمِ امتحان لذیذ

معشوق سے خالی نہیں عاشق کی کوئی بات
ہے رنگ شکستہ میں بھی اک پیار کی آواز

رہینِ ضبط کوئی مجھ سا درد مند نہ ہو
شکستِ رنگ سے جس کے صدا بلند نہ ہو

پیارا لگے ہے تجھ کو وہ چہرا تو مصحفی
آنکھوں میں لے کے اُس کو، کلیجے میں ڈال رکھ

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو سمن کے اندر

گورے بدن کا اس کے عالم میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

مصحفی کے یہاں داخلی کیفیات کی وہ تصویریں بھی ہیں جنھیں ہم نفسیاتی کہہ سکتے ہیں۔ یہ نفسیاتی تصویریں بالعموم معاملاتِ عشق سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے نفسیاتی کیفیات کو تمثالوں اور تصویروں میں پیش کرنے کے لیے جذبہ اور احساس کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ تجزیہ

محض اس وقت ممکن ہے جب کہ شاعر جذبات واحساسات پر خود سے الگ ہو کر معروضی طور سے غور وفکر کی صلاحیت رکھے۔ یہ معروضات جذبہ کی تنظیم اور فنی لوازم کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح یہ نہیں ہوتا کہ جذبہ کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ناقدین مصحفی کے بارے میں خیال ظاہر کرتے رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جذبہ کی تنظیم اعلیٰ تر فنی صورت کو جنم دیتی ہے۔ پھر یہ بھی کہ معروضیت قارئین کو شعری تجربے میں شریک کر لیتی ہے۔ مصحفی کے یہاں عشق کی واردات خارجی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ نفسی کیفیات کی یہ تصویریں دیکھیے:

جذبِ الفت کا یہ عالم ہے کہ بیٹھے بیٹھے
کوئی ہر وقت نکالے ہے مرے گھر سے مجھے

ہم اور یار اگر دو گھڑی بھی مل بیٹھے
تو بیمِ طعنۂ ہمسایہ سے دو دل بیٹھے

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا
کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا

یک چند اس طرف میں جو جانے سے رہ گیا
رک رک کے وہ بھی کچھ ادھر آنے سے رہ گیا

میں اک دم چین سے رستے میں اُس گل کے کہاں بیٹھا
کبھی اُٹھ کر یہاں بیٹھا کبھی اُٹھ کر وہاں بیٹھا

کل جو وہ رستے میں ناگہ مل گیا، تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اس کے رک جانے کی طرح

اول تو تھوڑی تھوڑی چاہت تھی درمیاں میں
پھر بات کہتے لکنت آنے لگی زباں میں

ہم تو اس کوچے سے گھبرا کے چلے آتے ہیں

دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے جاتے ہیں
وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں جی کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں
دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کر لی
حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں کبھو آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے
ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مصحفی کے کلام کی یہ خصوصیت، اس کی تمثال کاری اور محاکات، جذبات کا معروضی مطالعہ، نفسی کیفیات کا تجزیہ اور ان کا فنی اظہار، جذبہ و احساس کی تنظیم، یہ تمام باتیں اسے عہد جدید سے قریب تر کر دیتی ہیں۔ ایک اور بات جس کے باعث وہ ہمیں ہمارے اپنے زمانے سے قریب معلوم ہوتا ہے، وہ زبان کا استعمال ہے۔ مصحفی نے زبان کو عام لب ولہجہ اور بول چال کی زبان سے قریب رکھا ہے۔ شاعری کی زباں روزمرہ کی زبان سے قریب تر ہو تو اس کی اپیل اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ مصحفی کے یہاں ہمیں زبان کی صفائی محاورے کا استعمال، بندش کی چستی، ردیف کا متنوع استعمال اور ان سب باتوں سے زیادہ ایک مہذب سطح، ایک ستھرا پن ملتا ہے۔ چونکہ مصحفی کے یہاں فن کا تعلق موضوع سے ہمہ وقت قائم رہتا ہے، اس لیے اس کے یہاں ہمیں محض زبان کے اشعار نہیں ملیں گے اور ہوئے بھی تو بہت کم۔ خلاصۂ زبان کا چٹخارہ یا محاورے کی بندش یا محض رعایت لفظی مصحفی کے کلام کی خصوصیت نہیں ہے۔ ان کے یہاں زبان معاشرے کی زبان ہے۔ معاشرتی و تہذیبی رشتوں کی زبان ہے۔ جس کا تعلق جذبات و خیالات سے بھی ہمہ وقت استوار ہے۔ زبان

اور لہجے کے تیور بھی ملاحظہ کیجیے:

در پر پھسل کے اُس کے جو میں ناتواں گرا
آئی صدا یہ غیب سے، ظالم کہاں گرا

دیکھنے کو دیکھ مرے بولے وہ
اتنا نہ ہو دیدۂ انسان پھٹا

آغازِ عشق میں تو تجھے کچھ خبر نہیں
انجام اس کا اے دلِ شوریدہ دیکھنا

گر یہی چشم کی مستی ہے تری اے ساقی
میکدے سے کوئی ہشیار نہیں جانے کا

کوچۂ عشق میں کل اُس نے اذیت کھینچی
اب اُدھر مصحفیِ زار نہیں جانے کا

نگاہ آئینہ پر اس نے کی میں کھیت رہا
کسی کے تیر لگا اور کوئی نشانہ ہوا

زمانہ جائے گزر یا کہ ہم گزر جاویں
کسی طرح سے یہ اوقاتِ غم گزر جاویں

کہاں یہ صحبتِ اہلِ سخن، غنیمت ہے
خوشی کے ساتھ جو دو چار دم گزر جاویں

اور اب آخر میں مصحفی کے کلام کی وہ خصوصیات بھی دیکھیے جن کے باعث آج وہ ہمارا ہمعصر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اس خصوصیت کا تو ہم پہلے ہی ذکر کر آئے ہیں کہ وہ اپنے جذبات واحساسات اور قلبی واردات کا رشتہ خارجی اشیاء کے ساتھ قائم کرتا ہے۔ آپ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی خارجی اشیاء اور خارجی صورت کو جذبات واحساسات

اور واردات قلبی کے اظہار کے لیے معروضی تلازمہ (objective co-relative) کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی واقعاتی زندگی کو جذباتی سطح پر برتنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح تجربے کی حدیں وسیع تر ہوتی ہیں۔ گرد و پیش کی زندگی سے تشبیہات واستعارات لے کر انھیں کسی خیال یا جذبہ کے اظہار کے لیے معروضی تلازمہ بنانا ایک بہت بڑی تہذیبی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ وہ یوں کہ اس طرح زندگی کا خارجی شعوری نظام اس کے داخلی لاشعوری نظام سے مربوط ہوتا ہے۔ یوں فکر اور جذبے کی ہم آہنگی سے پوری زندگی منظم ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ زندگی میں یہ ہم آہنگی منظم اور ہم آہنگ افراد کو بھی پیدا کرتی ہے۔ گرد و پیش کو جذبہ و احساس کے چراغوں سے روشن کرنے کا یہ عمل ہمارے زمانے میں بھی ہو رہا ہے۔ واقعاتی زندگی کو شاعری میں سمو لینے اور اس طرح جذبات واحساسات کے دائرے اور تجربات کے احاطے وسیع کرنے کی کوشش ہمارے عہد کی شاعری میں بالعموم اور غزلوں میں بالخصوص نمایاں ہے۔ اس لیے آج ہمارے ہمعصر غزل گو مصحفی کے مقلد نظر آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ اس بات کا مطلب محض یہ ہے کہ مصحفی کا طرزِ احساس اس کی شاعری کا مسئلہ اور فنی پیرایہ ہمارے طرزِ احساس، ہماری شاعری کے مسائل اور فنی پیرایوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس طور مصحفی ہمارا ہمعصر بن جاتا ہے۔ مغرب کی جدید شاعری میں شعری تکنیک کی ایک نمایاں خصوصیت اعلیٰ ترین و ادنیٰ ترین، سنجیدہ و مضحک اور شعری و غیر شعری عناصر کو یکجا کرنا ہے۔ اب آپ مصحفی کے یہاں اس کی مثالیں دیکھیے:

بھلا درستیِ اعضائے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

چنے سے بھنتے ہیں آنکھوں میں روز و شب آنسو
تپ فراق نے مژگاں سے بھاڑ باندھ دیا

(یہاں ڈبلیو بی ییٹس کی یہ تشبیہ ذہن میں رکھیے: ''میری بوڑھی اور ناتواں عمر

میرے جسم کے ساتھ اس طرح باندھ دی گئی ہے جیسے کتے کی دم سے بے پیندے کی کیتلی‘‘)

درویش کو بھی چاہیے اک رنگ مصحفی
کرتے ہیں اتنے واسطے آنکھیں ملنگ سرخ

لال لال آنکھیں شفق کی، شام کی سر پر جٹا
ہم ہیں پیرِ چرخ دیوانے ترے بیراگ کے

کب سخن چینِ فصاحت کو ملے نام استاد
خط کی اصلاح سے ہوتا نہیں حجام استاد

سرقے کا بُرا مانیے کیوں مصحفی سچ ہے
کہتے ہیں جسے شاعری، ہے آپ یہ فن چور

گر لڑ مریں شاعر بھی تو کیا اس کا عجب ہے
ہوتی ہے زمینداروں میں نت جنگ زمیں پر

یوں چشمِ تر سے چہرے پر آنسو رواں ہوئے
دریا سے جیسے لائے کوئی نہر کاٹ کر

کر کے رخصت روح کو پہلے ہوا تن بے خبر
مردِ مفلس جوں بجھا دیوے دمِ خفتن چراغ

بنتے بگڑتے رہے خاک کے پتلے یہاں
لیک نہ آخر ہوا چرخ کی چوسر کا کھیل

کیوں نہ نظر سے نہاں ہووے کہ طفلی میں بھی
آنکھ مچولی ہی تھا اُس مہِ انور کا کھیل

گرمیِ غیر کی جوں شمع مجھے کب ہے تلاش
ژالہ ہوں برف ہوں میں آپ پگھل جاتا ہوں

آتش اسے جلا دے پانی اسے گلادے

کس کس سے پھر بچاویں یہ جسمِ کاغذیں ہم
بے داغ عاشقوں کو ثمر کب وصول ہو
دیکھا نہیں درخت میں گولر کے پھول ہو
جوں ہیزمِ تر کیوں نہ دھواں آگ کا پھیلے
اک آگ ہے سینے میں کہ سُلگاتی ہے مجھ کو
تن کا یہ حال ہے بارِ غمِ دنیا سے کہ جوں
گٹھری کاندھے پہ رکھے رہروِ عاجل بھاری
ساعتِ عیسویاں ہے یہ مرا دل جس میں
خود بخود چوٹ لگی خود بخود آواز ہوئی

میں نے اس مضمون میں اپنے ہم عمر مصحفی کی تلاش کی ہے۔ مختصراً اس تنقید کے حوالے بھی دیے ہیں جو مصحفی پر کی جاتی رہی ہے۔ فراق صاحب نے اپنے مضمون میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ:

''حالی کے یہاں مصحفی کا اعتدال اور حسرت موہانی کے یہاں مصحفی کی رنگینی ہے۔''

میں نے اس عہد کی شاعری کی چند خصوصیات مصحفی کے یہاں تلاش کی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب مصحفی کی خوبیوں اور برائیوں پر نظر رکھتے ہوئے ''عملِ جمع و تفریق'' کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مصحفی متوسط درجے کے شاعر ہیں اور یہ کہ وہ اُسے صوت و صورت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو ''یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے (مصحفی کے) کلام کے بدنما حصوں پر ایک سفید اور خوش نما چادر اس طریق سے پڑی ہوئی ہے کہ ہم اس کی بدنمائی کو کچھ دیر نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

میں نے اس مختصر مضمون میں اشعار زیادہ تعداد میں نقل کیے ہیں۔ اس کی ایک وجہ

یہ بھی ہے کہ زیادہ تر اشعار وہ ہیں جو حسرت کے انتخاب میں نہیں ہیں اور اس ایک دیوان سے لیے گئے ہیں جو ''آیاتِ مصحفی'' کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اب آپ ان اشعار کو پڑھ کر مصحفی کی شاعری کی وقعت و قدر کے بارے میں سوچیے۔ میں تو اب خود سے پوچھتا ہوں کہ اگر مصحفی دوسرے درجے کا شاعر ہے تو پھر اول درجے کا شاعر کس طرح کا ہوتا ہے؟

سجاد باقر رضوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الف

1

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کی دکھا خوبی، سرمے کو لگا رکھا

سویا تو لپٹ کر میں، اُس ساتھ، ولے اُس نے
پہلو سے مرے پہلو، تا صبح جدا رکھا

معمار نے قدرت کے، طاقِ خمِ ابرو کو
موقع سے بنایا تو، ٹک لیک جھکا رکھا

کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھاویں گے
ہم میں تری الفت نے، کہہ تو ہی، کہ کیا رکھا

قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو ظالم نے
نامے کے کیے پرزے، قاصد کو بٹھا رکھا

بے یار و دیار اپنے، جیتا تو رہا میں پر
رکنے نے مرے جی کے، دم میرا خفا[1] رکھا

کس لب کے تبسّم نے چھڑکا تھا نمک ان پر
زخموں کے الم نے شب، تا صبح مزا رکھا

کیا جانیے کب کا تھا، میرا یہ فلک دُشمن
جو اُس مہِ تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا

1۔ نسخہ الف: چُرا، رُکنا، دم رُکنا، جی رُکنا، اِن سب کا وہی مفہوم ہے جو عربی لفظ خفا کا ہے، ہم اردو میں خفا ہونا روٹھنے، ناراض ہونے کے معنوں میں بولتے ہیں۔ مصحفی نے یہاں ''گھٹن'' کے لیے استعمال کیا ہے۔

میں اپنے ہنر کا بھی بندہ ہوں کہ کل میں نے پہلو میں دل اپنے کو، پیکاں سے بچا رکھا
دیکھ اس کی ادا یارو بس مر ہی گیا میں تو جوں ہاتھ کو قاتل نے قبضے پہ ذرا رکھا
اے مصحفی میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں جو میں نے انداز نیا رکھا

2

پیغام و سلام اُس نے ذرا بھی نہیں لکھا نامے میں تو اک حرفِ دعا بھی نہیں لکھا
تقدیر میں اپنی، غمِ خوباں ہی میں مرنا لکھا ہے جو حق نے تو بُرا بھی نہیں لکھا
تا پاوے نہ مطلب کو کوئی نامے میں میرے گر شکر نہیں ہے تو گِلا بھی نہیں لکھا
بدنامی کے ڈر سے سرِ مکتوب پر اُس نے نام اپنا تو کیا، نام مرا بھی نہیں لکھا
اُس شوخ نے دشمن کو مرے قتل کا ایما بے جا نہیں لکھا، تو بجا بھی نہیں لکھا
نامے میں مرے وصف[1] ہے نک سِک کی بتاں کے اتنا تو میں کچھ بے سر و پا بھی نہیں لکھا
اے مصحفی قاصد کو کہاں بھیجوں کہ خط میں
گھر اپنے کا اُس نے تو پتا بھی نہیں لکھا

3

ترا خدنگِ نگہ جس کے دل سے پار ہوا نشانِ تیرِ تغافل وہ دل فگار ہوا
فلک نہ دیکھ سکا، دیکھوں اپنے یار کو میں کہ دیکھنا بھی مرا اُس کو ناگوار ہوا
زمانہ سازی نہ کی ہم نے، یُوں ہیں، خاطر خواہ کِسی کے ساتھ ہمارا نہ روزگار ہوا
جہاں کہ بیٹھ کے زلفوں کو تو نے شانہ کیا سب اس زمین کا تختہ بنفشہ زار ہوا
دریغ غمزۂ کافر نے کج ادائی کی نگاہوں میں جو کبھی وصل کا قرار ہوا
تمام عمر ہمیں گذری آشنائی میں پر آشنا نہ کوئی اب تلک دوچار ہوا

1۔ مصحفی نے وصف کو مؤنث باندھا ہے۔

غبار اُس کا نہ بیٹھا کسی کے دامن پر　　مری طرح جو کوئی خاکِ کوے یار ہوا
قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد　　چمن میں، کہتے ہیں، پھر موسمِ بہار ہوا
صبا، جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ
تو کہیو ہنس کے: "میں صدقے، ترے نثار ہوا"

4

لطف کیا جب بسرِ راہ عیاں ہو جانا　　دیکھ کر دور سے عاشق کو، رواں ہو جانا
تو ملے یا نہ ملے، اِس سے تو کچھ کام نہیں　　ہم کو کوچے میں ترے روز میاں ہو جانا
میں دل آزردہ پھر اک نالہ کیا چاہوں ہوں　　ٹک پرے مجھ سے تم اے ہم نفساں ہو جانا
کیا بُری خو ہے تمھاری کہ مہِ عید کی طرح　　منہ دکھانا بھی تو پھر وو ہیں نہاں ہو جانا
اس میں جو ہووے سو ہو، ہم کو رہِ عشق کے بیچ　　جستجو میں تری بے نام و نشاں ہو جانا
سی رکھے کیا کوئی منھ اپنا؟ عجب مشکل ہے،　　بات کہنے میں وو ہیں دشمنِ جاں ہو جانا
ہے تماشا کدۂ خلق مری خاکِ مزار　　جی میں آوے تو کبھی آپ بھی یاں ہو جانا
دل کی اپنے بھی عجب خو ہے کہ بیٹھے بیٹھے　　خود بخود ناوکِ مژگاں کا نشاں ہو جانا
کوچۂ عشق میں پرسش نہیں کچھ اے یارو　　سہل سی بات ہے یاں، جی کا زیاں ہو جانا
طُرفہ عالم ہے ہمارا بھی کہ با ایں ہمہ ضبط　　دیکھتے ہی تجھے سرگرمِ فغاں ہو جانا
مصحفی تیری یہ کیا خو ہے کہ روے خوش کو
دیکھنا، اور وو ہیں اودھر نگراں ہو جانا

5

مرضِ عشق سے گر اب کی سنبھل جاؤں گا　　تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا
مجھ کو قاصد کے تغافل نے تو مارا، ہے ہے　　روز ظالم یہی کہتا ہے کہ کل جاؤں گا
تو کھلے بالوں مرے سامنے آیا مت کر　　ورنہ سر پیٹ ابھی گھر سے نِکل جاؤں گا

دل فریبی کا ہے اُس چشم کو دعویٰ لیکن — غمزہ کہتا ہے کہ میں اس کو بھی چھل[1] جاؤں گا
روغنِ نفت کی حاجت مجھے کیا ہے اے عشق — میں تو پروانہ ہوں، پل مارتے جل جاؤں گا
پاس سے اس کے، نہ کہہ مجھ کو تو ہر دم، جا جا — تجھ کو کیا کام مرے جانے سے، چل[2]، جاؤں گا
گو کہ خورشیدِ قیامت میں بٹھا دیں مجھ کو — کیا بنا موم کا ہوں میں جو پگھل جاؤں گا
اس کے کوچے میں پکارے گا اگر مجھ کو رقیب — میں بھی عیار ہوں، آواز بدل[3] جاؤں گا
لے چلا ہے مجھے، یہ کہہ کے، دل اس کی کوُ میں — تو اُٹھانے مجھے لگیو، میں مچل جاؤں گا
رَل گئے خاک میں لاکھوں تو اچنبھا کیا ہے، — میں بھی اک روز اسی خاک میں رَل[4] جاؤں گا
لے چلو باغ میں مجھ کو بھی، بیادِ رخِ دوست — ہوں دل آزردہ، وہاں گل سے بہل جاؤں گا

مصحفیؔ جو مرے منکر ہیں، بقولِ سودا
''ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا''

6

بچا گر ناز سے تو اُس کو پھر انداز سے مارا — کوئی انداز سے مارا، تو کوئی ناز سے مارا
کِسی کو گرمیِ تقریر سے اپنی لگا رکھا — کِسی کو منھ چُھپا کر نرمیِ آواز سے مارا
ہمارا مرغِ دل چھوڑا نہ آخر اُس شکاری نے — گہے شاہین پھینکے اُس پہ، گاہے باز سے مارا
غزل پڑھتے ہی میری، یہ مغنّی کی ہوئی حالت — کہ اس نے ساز مارا سر سے، اور سر ساز سے مارا
نکالی رسمِ تیغ وطشت دلّی میں، جزاک اللہ — کہ مارا تو ہمیں تو نے، پر اک اعزاز سے مارا
نہ اُڑتا مرغِ دل تو چنگلِ شاہیں میں کیوں پھنستا — گیا یہ خستہ اپنی خوبیِ پرواز سے مارا
جہاں تک سازداری ہے، لکھی دشمن کے طالع میں — ہمیں بدنام کر کے طالعِ ناساز سے مارا

1۔ چھلنا (بروزن تلنا) دھوکا دینا مغالطے میں ڈال دینا، جُل دینا۔
2۔ چل = بازرہ، ہٹ 3۔ یعنی آواز بدل کر
4۔ رَلنا= گھل مل جانا۔ محمد حسین آزاد نے اِسے آبِ حیات میں امروہے کا محاورہ بتایا ہے، مگر یہ فصیح اردو کا محاورہ ہے۔ تفصیل دیکھو: شاراحمد فاروقی: ''دراسات'' میں مضمون ''مصحفی کی زبان''

ہزاروں رنگ اس کے خون نے یاروں کو دکھلائے
جب اس نے مصحفی کو اپنی تیغِ ناز سے مارا

7

صانع نے جو خم ابروے دلدار میں رکھا — سالح[1] نے بھلا کون سی تلوار میں رکھا

وہ رنگِ نزاکت نہ دیا عارضِ گل کو — جو رنگِ نزاکت ترے رخسار میں رکھا

پردا نہ اُٹھایا کبھی رخسار سے اس نے — تا زیستِ مجھے حسرت دیدار میں رکھا

خورشید خجل ہوگیا دیکھ اُس کی پھبن کو — طرے کو جب اس شوخ نے دستار میں رکھا

خوں روؤں کہاں سے میں، کہ اس رونے نے یارو — کیا خاک مرے دیدۂ خوں بار میں رکھا

صیاد، یہ شکوہ ہے کہ بُلبل کے قفس کو — لے جاکے کبھی تو نے نہ گلزار میں رکھا

قاصد نے دیا نامہ مرا اُس کو تو اس نے — کرچاک وہیں، رخنۂ دیوار میں رکھا[2]

دکّان پہ یوسف کی نہ کوئی نظر آیا — جب اس نے قدم مصر کے بازار میں رکھا

اے مصحفی میں وہ ہوں الم دوست کہ جس نے
برسوں دمِ خنجر دلِ افگار میں رکھا

8

جس دم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا — جس رہ گذر سے نکلا، عالم کو مار نکلا

خاکِ سیہ میں ہم نے اپنے تئیں ملایا — تو بھی نہ تیرے دل کا ظالم غبار نکلا

آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم — تیرا ہی نام منھ سے بے اختیار نکلا

باریک[3] ہوگیا ہوں عشقِ کمر میں لیکن — اِس رنج کا کسی سے ہرگز نہ تار نکلا[4]

1۔ سالح = اسلحہ بنانے والا۔ 2۔ پہلے زمانے میں یہ عام روش تھی کہ کاغذ چاک کر کے پھینکنے کی بجائے دیوار کے رخنے میں گھرس دیتے تھے۔ 3۔ قدیم محاورے میں باریک ہونا تب دق کا مریض ہونے کو کہتے تھے۔
4۔ تار نکلنا = سراغ ملنا۔

اس خانگی[1] سے از بس اک مجھ کو رنگی تھی　جب میں ادھر سے نکلا، کھانس و پکار[2] نکلا

ہاتھ اپنے دل پہ میں نے مارا جو وقتِ شیون　سینے کے نعل سے بھی سوز اں شرار نکلا[3]

کم بخت دل نے ہرگز میرا کہا نہ مانا　آخر گلی سے اُس کی ہو بے قرار نکلا

فرقت میں رات اس کی، میں زار زار رویا　یاں تک کہ خوب میرے دل کا بخار نکلا

میں ضبط تو کیا تھا اپنے تئیں بہت سا　آنکھوں سے خون دل کا پُر جوش مار نکلا

مژگاں کی اس کی سوئیاں مڑ مڑ گئیں و لیکن　تو بھی ہمارے دل کا ان سے نہ خار نکلا

تہمت ہے مصحفی پر، سیرِ چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

9

ہوا شعلہ جو میری آہِ آتش ناک سے پیدا　تو ہوویں گے شرارے خرمنِ افلاک سے پیدا

نہیں پیوند پایا بسکہ زخموں نے مرے اب تک　ہوا ہوتی ہے اکثر سینۂ صد چاک سے پیدا

کیا ہے خوں جنھوں کا اس کی دستارِ گلابی نے　گلابی لالہ ہوتا ہے اُنھوں کی خاک سے پیدا

گریباں کیوں نہ پھاڑیں میرزایانِ چمن اپنا　کہ وضعِ میرزائی ہے تری پوشاک سے پیدا

نہیں معلوم کس کے سر کو تو نے اس سے باندھا ہے　ہزاروں داغِ خوں ہیں دامنِ فتراک سے پیدا

قدم رکھتا ہوں میں گر موسمِ گل اُس کے سائے میں　جنوں ہوتا ہے مجھ کو داربستِ تاک سے پیدا

پہنچ سکتا ہے کب سروِ رواں اس کی روانی کو　کہ ہے اور ہی روش اُس قامتِ چالاک سے پیدا

گرا ہو جس زمیں پر خوں تری پلکوں کے زخمی کا　عجب کیا لالہ ہووے اس خس و خاشاک سے پیدا

نہیں اے مصحفی تہمت زدہ میں فسق کا ہرگز
صفائی دل کی ہے میرے اس عشقِ پاک سے پیدا

1۔ خانگی سے مراد رکھیل جس سے ناجائز تعلقات ہوں۔ 2۔ ''کھانس و پکار'' میں واؤ عطف کا استعمال غور طلب ہے۔ 3۔ نعل بہ سکونِ دوم استعمال ہوا ہے۔

10

رونے نے میرے ہوش تو طوفاں کا کھو دیا ٹک آنکھیں ڈبڈبائیں کہ عالم ڈبو دیا

اب جوہری کہاں ہے؟ کہ اک طشتِ آب نے کافر کے بال بال میں موتی پرو دیا

جانی نہ قدرِ لختِ جگر آہ کیا کہیں اک طرفہ لعلِ بیش بہا ہم نے کھو دیا

رسمِ حنا نہیں ہے کہ یوں پشت و رو لگے یہ ہاتھ کس کے خون میں تو نے ڈبو دیا؟

دامن جھٹک کے چلتے ہو تم، پاس ہے ضرور تربت کا میری دیکھیو ٹھنڈا نہ ہو دیا

ہاتھوں سے درد و غم کے دلِ زار مصحفی
اتنا ہوا بتنگ کہ بس اس بے نے رو دیا

11

شعلۂ آتش پہ جب میں اپنا داماں رکھ دیا پرزے پرزے کرکے دل نے بھی گریباں رکھ دیا

ہیں ابھی لاکھوں مسلماں خیل[1] میں تیری اسیر ہاتھ سے خنجر کو کیوں اے نامسلماں رکھ دیا

اڑتے اڑتے اس کے کوچے میں جو جا نکلے کہیں حاملوں نے دوش سے تختِ سلیماں رکھ دیا

دوست داروں کو خبر پہنچے کہ شب مقتل میں جا ہم نے سر اپنا تہِ شمشیر برّاں رکھ دیا

جب قسم کھانے لگا میں اختلاطِ غیر کی دوڑ کر کافر نے میرے سر پہ قرآں رکھ دیا

چشمِ تر کو دی بہار اس آہِ آتش بار نے جو یباروں پر میں کیا سروِ چراغاں رکھ دیا

جب حکایت ہائے رنگیں اس نے عاشق کی سنیں پڑھتے پڑھتے ہاتھ سے جزوِ گلستاں رکھ دیا

مہربانی دیکھیو کانِ ملاحت کی مرے زخمِ عاشق پر نگوں[2] کرکے نمک داں رکھ دیا

چاک در سے بھی نہیں کر سکتے ہم اس پر نگاہ کس نے دروازے پہ یہ اس کے نگہباں رکھ دیا

کیا نظر آیا مجھے اس میں، کہ میں روزِ وصال لب تلک لے جا کے جامِ آبِ حیواں رکھ دیا

عشق کے ہاتھوں سے جلتا ہوں کہ سینے پر مرے گرم گرم، آتے ہی اس نے، داغِ ہجراں رکھ دیا

1۔ خیل = گروہ، ٹکڑی۔ 2۔ اُلٹا کرکے۔

سودۂ الماس چاہے تھا مرا زخم، اے طبیب
تو نے کیوں مرہم کا پھاہا اُس پہ ناداں رکھ دیا

اُس نے سینے سے مرے پیکاں کو کھینچا تو و لے
جب یہ دیکھا دل بھی ہے اس میں، تو پیکاں رکھ دیا

جیسے گل ڈالی پہ پھولے، یوں نظر آیا وہ رُخ
یک بیک ہاتھ اُس نے جب زیرِ زنخداں رکھ دیا

سیم سی[1] سینے کی تختی سب نظر آنے لگی
کس نے وا اتنا ترا چاکِ گریباں رکھ دیا

مصحفی بارِ امانت کا نہ تھا حامل کوئی
اِس لیے اِس بوجھ کو بر فرقِ انساں رکھ دیا

12

دل کب متحمل ہو، جدائی کے الم کا
اِس حرف کے لکھنے سے جگر شق ہے قلم کا

ہووے نہ عذاب اُس پہ کبھی، جس کے پسِ مرگ
چھاتی پہ ہو تعویذ، ترے نقشِ قدم کا

آیا ہے عدم سے، سو عدم ہی کو سدھارا
ہستی میں کوئی رہ نہ گیا ملکِ عدم کا

ہوتا ہے مسافر کو دو راہے میں توقف
رہ ایک ہے، اُٹھ جائے جو شک دیر و حرم کا

اے مصحفی دنیا ہے سرا، اس میں مری جان
جوں ہووے غنیمت ہے، گذارا کوئی دم کا

13

نالۂ مرغِ سحر دل میں اثر کر ہی گیا
سنتے ہی اس کے، میں دنیا سے سفر کر ہی گیا

جس کی جس طرح کٹی غم کدۂ دنیا میں
عمر اپنی کی وہ اوقات بسر کر ہی گیا

چشمۂ آبِ حیات اُس کے دمِ تیغ میں تھا
خضر بھی اپنے لبِ خشک کو تر کر ہی گیا

دمِ شمشیر پہ تھی راہ مری، اُس کُو میں
کر کے بند آنکھیں، میں آخر کو گذر کر ہی گیا

بزمِ خوباں میں جو شب لے گیے مجھ کو احباب
میں بھی ہر ایک کی صورت پہ نظر کر ہی گیا

مل گیا تھا وہ، تیغوں کو کمر بیچ سجے
بانکپن دیکھ کے میں اُس کا، حذر کر ہی گیا

1۔ چاندی سی

کیا کہوں اس کی ادا، وقت پکڑنے کے وہ شوخ رات مجھ سے بھی اگر اور مگر کر ہی گیا

مصحفی کون سی ہے اب مرے بچنے کی امید
ناوکِ غمزہ تو سوراخ جگر کر ہی گیا

14

یک چند اُس طرف جو میں جانے سے رہ گیا رک رک کے وہ بھی کچھ ادھر آنے سے رہ گیا

کیوں کر کہوں نہ اس کو ترازو، کہ تیرِ عشق وہ تیر ہے جو لگ کے نشانے سے، رہ گیا

گردش کی آسماں کی وہی چال ڈھال ہے کس دن یہ بے کسوں کو ستانے سے رہ گیا

کس کی نگاہِ مست نے تجھ کو چھکا دیا[1] ساقی تو کیوں شراب پلانے سے رہ گیا

وہ نورِ دیدہ اُٹھ جو گیا سامنے سے رات مجھ کو اُسی گھڑی نظر آنے سے رہ گیا

قاصد کو اس نے جاتے ہی رخصت کیا تھا، لیک بدذات، ماندگی کے بہانے سے، رہ گیا

بسمل کی تیرے، کچھ نہ گئی پیش جستجو، آخر وہ ہاتھ پانو ہلانے سے رہ گیا

وہ لالہ رو نہ مجھ سے ملا مصحفی، دریغ
یہ داغ میرے دل پہ زمانے سے رہ گیا

15

مجھ تک یہ نہ آوے تمھیں منظور یہی تھا میں بیٹھ رہا، میرا بھی مقدور یہی تھا

دیکھا، کہ نہ دیکھا، اسے جاتے ہوئے تم نے اے کج کلہاں، ہاں بتِ مغرور یہی تھا

کیا اپنی خرابی میں کہوں، سنگِ جفا سے جس نے کہ کیا شیشۂ دل چور، یہی تھا

مدّت ہوئی ویراں ہے مرا کلبۂ احزاں کیا کہیے، کبھی جلوہ گہِ طور یہی تھا

سینے میں مجھے اپنے تجلّی نظر آئی میں عشق میں موسیٰ تھا، مرا طور یہی تھا

ہوجاتے تھے معشوق یوہیں دشمنِ عاشق؟ کیا اگلے زمانے میں بھی دستور یہی تھا

1۔ چھکانا= سیر کرنا، سیراب کرنا

اِک صانعِ قدرت کی جُدی[1] بات ہے، لیکن　　یوسف میں بھی ہاں حسن یہی، نور یہی تھا
بولا وہ صنم دل پہ مرے تیر لگا کر:　　کیا سچ ہے، ترے زخم کا انگور[2] یہی تھا؟
مجھ سے نہ گیا مرتے تلک عشق کا لپکا
سینے میں مرے مصحفی ناسور یہی تھا

16

جاتے جاتے راہ میں اُس نے، مُنھ سے اُٹھایا جوں ہی پردا
راہ کے جانے والوں نے بھی، مُنھ اُس کا پھر پھر کے دیکھا
قیس ملے تو اس سے پوچھوں، کیا ترے جی میں آئی دوانے
شہر کو تو نے کس لیے چھوڑا، کیوں کے خوش آیا تجھ کو صحرا
صبح سے لے کر شام تلک یاں، یہ وہ گلی ہے جس میں پھریں ہیں
چاک گریباں، موے پریشاں، ہم سے ہزاروں عاشقِ رسوا
اُس نے مزا کیا پایا ہوگا، دو چلّو مے پینے کا یاں
جس میکش کے ہاتھ نہ آیا، غبغب[3] ساغر، ساعدِ[4] مینا
سوختگی نے غم کی اثر جو دل میں کیا ہے، ہونے لگا ہے
تھوڑا تھوڑا، رنگ دھوئیں کے، سبزہ ہماری خاک سے پیدا
اک ٹھوکر میں مُردے ہزاروں، اُٹھ بیٹھیں ہیں، گور سے دو ہیں
لیتا ہے وہ وقتِ خرامش[5]، پانو سے اپنے، کارِ مسیحا

1- جُدی بمعنی جُدا، الگ　2۔ زخم کا اُبھار
3۔ غَبغَب = ٹھوڑی میں جو نشیب ہوتا ہے　4 ۔ ساعِد = بازو، کلائی
5۔ خرامش = خرامیدن سے حاصل مصدر، خرام

جاتے ہیں نا کسی کے گھر ہم اور نہ کوئی کچھ دیتا ہے ہم کو
قطع کیے ہیں ہم نے دونوں، پاے طلب اور دستِ تمنا

آنکھ لڑانا، سامنے آنا، مُنھ دکھلانا، اور چھپ جانا
یہ بھی ادا ہے کوئی ظالم، مان خدا کو، مت دے ایذا

مصحفی اس دل چسپ زمیں میں طبع کرے گر تیری رسائی
خامہ ترا کچھ کند نہیں ہے، ایک غزل تو اور بھی لکھ جا

17

دیکھ کر اک جلوے کو تیرے، گرہی پڑا، بے خود ہو موسیٰ
اُن آنکھوں کے صدقے جاؤں، جو ہیں ہر دم محوِ تماشا

زہد و ورع پر بھول نہ زاہد، حسن کا منکر ہو نہ دوانے
صنعاں سے کو[1]، لے گیا غافل، ایک ادا میں عشوۂ ترسا

دیکھ تجلی حسن کی تیرے، کوہ بہے جب ہو کر پانی
دیوانا سا بھاگا وو ہیں، چاک گریباں کر کے دریا

کیوں نہ گریباں پھاڑوں اپنا، ہاتھ اور میرا اس کا دامن
طالع ہیں، آ کر کے ہوا ہے، دامنِ یوسف دستِ زلیخا

روز کے وعدے، روز بہانے، روز یہ کہنا آؤں گا کل
فائدہ کیا ان باتوں کا ہے، ہم نے میاں بس تم کو دیکھا

زلفِ معنبر اس نے جو کھولی تو یوں محفل ساری مہکی
آوے چمن سے، موسمِ گل میں، بادِ صبا کا جیسے جھونکا

1۔ صنعاں سے کو = صنعاں جیسے زاہد کو

مَدھ[1] میں بھرا ہے جوبن کے وہ، حسن سے اس کے ٹپکے ہے مستی
چاہِ ذقن[2] ہے جام بلوریں، اور غبغب ہے شیشۂ صہبا

نیم نگہ پر دیتے ہیں دل کو، جانو تو کچھ لے لو صاحب
پھر نہ ملے گا ورنہ تم کو، ہرگز ایسا سستا سودا

کیوں نہ چھکے دل دیکھ کے اس کو، جس ساقی کا ہووے یارو
دست نگاریں پنجۂ مرجاں، ساعدِ سیمیں گردنِ مینا

مصحفی کر کے چاک گریباں، چل جنگل کو اے دیوانے
دیکھ تو کیا پھولا ہے لالہ، سرخ ہے کیسا دامنِ صحرا

18

آیا یہاں، سو وہیں بہانے سے اُٹھ گیا — آسودگی کا حرف زمانے سے اُٹھ گیا
گو اب ہزار شکل سے جلوہ کرے کوئی — اپنا تو دل اس آئینہ خانے سے اُٹھ گیا
دیوانۂ بہار جو تھا، اس بہار میں — صحرا کو، نو بہار کے آنے سے، اُٹھ گیا[3]
بیٹھا تھا آ کے قیس تو لیلیٰ کے در پہ، لیک — دیوانہ، کودکوں[4] کے ستانے سے، اُٹھ گیا

ہرگز نہ مصحفی کا رہا خاک بھی نشاں
نقشِ قدم کی طرح زمانے سے اُٹھ گیا

19

کچھ آرزو نہ تھی بُت و بُت خانہ دیکھنا — منظور تھا ہمیں رخِ جانانہ دیکھنا
اُلجھا ہے کس کی زلفِ پریشاں میں دل مرا — اے شانہ بیں، برائے خدا، شانہ دیکھنا

1- مَدھ = شراب 2- چاہِ ذقن = غبغب بھی وہی ہے جسے انگریزی میں (double chin) کہتے ہیں۔ 3- صحرا کو اُٹھ گیا = چلا گیا 4- کودکوں = بچوں

نکلیں ہیں اس میں، گردشِ چشمِ پری کے ڈھنگ ساقی، ادائے گردشِ پیمانہ دیکھنا
گھوریں ہیں ہم، بتوں کو رقیبوں کے ساتھ دیکھ کوئی سیکھ لیوے ہم سے حریفانہ دیکھنا
اے دل بس آنکھیں موند لے، اب کیا ضرور ہے نت اُٹھ کے روئے محرم و بیگانہ دیکھنا
کیا سہل سی طرح سے جلاوے ہے آپ کو اے شمع، جاں فشانیِ پروانہ دیکھنا
کرتا ہے نت تو زلف کا مذکور مصحفی
اک دن کھنچے گا طول یہ افسانہ، دیکھنا

20

سخت مشکل ہے اب اُس کوچے میں جانا اپنا کہ وہاں جان کا دشمن ہے زمانہ، اپنا
اس فریبی کا میں کشتہ ہوں کہ مجھ سے سرِ راہ مل بھی جانا، تو کبھی گھر نہ بتانا اپنا
آنکھ لڑ جائے کسی سے جو تری تو لڑ جائے لیک اے جان مری، دل نہ لڑانا اپنا
سینہ غربال ہی اُس کا نظر آیا آخر تیرِ مژگاں نے کیا جس کو نشانہ اپنا
ہو کے پروانہ جو اس بزم میں ہم جاتے ہیں ہم کو منظور ہے آتش میں جلانا اپنا
اگر اس شوخ کی مجلس میں ہوئی راہ ہمیں ایک دن ہم بھی سناویں گے فسانہ اپنا
چاک ہو جاویں گے لاکھوں ہی گریباں ظالم چاک پردے سے نہ یوں ہاتھ دکھانا اپنا
بولی وہ زلفِ سیہ کر کے گرفتار، مجھے: ''پھر تو دل عشق کے پھندے میں پھنسانا اپنا!''
کر کے میں چاک گریباں جو گیا یوں بولا: ''حال دکھلائے ہے کس کو یہ دوانہ اپنا''
مصحفی گو تری منت کرے ناصح آ کر
فصلِ گل میں تو گریباں نہ سلانا اپنا

21

تیرِ کرشمہ دل سے مرے پار ہو گیا آنکھیں لڑیں تو پھر جگر افگار ہو گیا
صیاد نے نہ ذبح کیا مرغِ دل کو ہائے یہ تو قفس کے بیچ ہی مُردار ہو گیا

ہے ہے ستم کے نام سے جو آشنا نہ ہو یہ کیا ستم ہوا کہ ستم گار ہوگیا
ظالم، خدا کے واسطے، اب تو بھی درگذر سینہ جراحتوں سے تو گلزار ہوگیا
برگشتگی کا بخت کی کس سے بیاں کروں دلدار تھا جو، اپنا دل آزار ہوگیا
کس کی بلائے زلف مری جان پر پڑی یا رب میں کس بلا میں گرفتار ہوگیا
دیکھا جو وقتِ شام اُسے پشتِ بام پر خورشید ہو خجل پسِ دیوار ہوگیا
دل سے خبر نہیں ہے مجھے اس کے مصحفی
آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا

22

کیا کہیے یار تھا سو وہ اغیار ہوگیا اس غم سے جل کے داغ، دل زار ہوگیا
آنکھ اس کی سُوے در ہی رہی رات دن لگی نظروں میں جس سے وعدۂ دیدار ہوگیا
سینہ جو چاک چاک ہوا، اس کی تیغ سے، یہ مرغِ دل قفس میں گرفتار ہوگیا
آیا اگر غبار کبھی، میرے، یار کے وہ بھی تو درمیان میں دیوار ہوگیا
سفاک ابتدا سے وہ بے رحم ہے، غلط کہیے گر اس کو، آج جفا کار ہوگیا
اتنی تو مجھ کو سیرِ چمن کی ہوس نہ تھی پر دل کی بے کلی سے میں لاچار ہوگیا
تعریف مجھ سے سنتے ہی اُس گل عذار کی بس پھول تو گلے کا مرے ہار ہوگیا
اب ڈھونڈتا ہے تیر کو ظالم کہاں کہ وہ سینے مین غرق تا لب سوفار[1] ہوگیا
یوسف بھی اپنے عہد میں، کچھ تجھ سے کم نہ تھا ق اُس کا بھی حسن، رونقِ بازار ہوگیا
پر تو وہ جنسِ نغز ہے، بازار دہر میں، سودے میں محو جس کے خریدار ہوگیا
بے وجہ مصحفی کے نہیں ہیں یہ اشک و آہ
ظاہر ہے یہ کہ اس کو کچھ آزار ہوگیا

1۔ سُوفار = تیر کی نوک، اگلا حصہ

23

اس کو دکھلائیو نقشا مری حیرانی کا　　جس سے نکلے ہے اک اندازِ پشیمانی کا

ضبطِ غم کوئی کہاں تک کرے، اس ضبط میں تو　　حوصلہ صرف ہوا طاقتِ انسانی کا

کہکشاں یہ نہیں گردوں پہ، اگر کیجیے غور　　تختہ پارہ ہے کِسی کشتیِ طوفانی کا

خنجر و تیغ ملے جاتے ہیں اس کے گھر میں　　آج سامان ہے شاید مری مہمانی کا

اے برہمن بچے، اس کی بھی خبر ہے جو غریب　　مرگیا دیکھ کے صندل تری پیشانی کا

آئینے کی تو عبث کرتا ہے اتنی تعریف　　آئنہ آپ ہے حیراں مری حیرانی کا

مصحفی میں وہ غزل خواں ہوں کہ جس کے آگے
ہو نہ سر سبز لحن بلبلِ بستانی کا

24

رُخ پہ عالم ہے یہ زلفوں کی پریشانی کا　　جوں پڑے روز پہ پردہ، شبِ ظلمانی کا

جب نہ تھا سلسلۂ زلف سے مجھ کو سروکار　　عشق باعث تھا مری سلسلہ جنبانی کا

کفر پھیلا ہے یہاں تک، کہ زمانے میں کوئی　　نام لیتا نہیں بھولے سے مسلمانی کا

ہوش اُڑ جائیں گے اے زلفِ پریشاں تیرے　　گر میں احوال لکھا اپنی پریشانی کا

ہوگیا حلقۂ زنجیر اُسے کام نہنگ　　پانو لوہے سے نہ نکلا ترے زندانی کا

پیچ جو زلف میں پڑتا ہے ہوا سے، اس کی　　وہی باعث ہے مری سلسلہ جنبانی کا

لا سکے حسن ترا اے صنمِ مہر جمال　　کس طرح صفحۂ کاغذ پہ قلم مانی کا

کلک صنعت نے نہ کھینچی ترے چہرے کی شبیہ　　دستِ قدرت نے بنایا نہ تری ثانی کا

مصحفی جھوٹ ہے کیا، ریختہ گوئی میں مجھے
ہوں تو میں مور پہ دعویٰ ہے سلیمانی کا

25

منھ دیکھوں میں روزِ عید تیرا　مقصود ہے مجھ کو دید تیرا

کہتے ہیں کہ خوں میں لوٹتا ہے　تیرا زخمی، شہید تیرا

ہیں زلف کے سلسلے میں لاکھوں　اک میں بھی سہی مرید تیرا

اے دل اِسے اور بھی سیہ کر　نامہ ہے ابھی سپید تیرا

آیا جو عدم سے میں، تو مجھ کو　منظور تھا بازدید تیرا

مطلب اُس بے وفا سے کیا ہے　کہہ اے دلِ نا امید تیرا

کہتی ہے جسے کہ مصحفی خلق

ہے بندۂ زر خرید تیرا

26

میں اس صنمِ ماہِ لقا کو نہیں دیکھا　جس طرح کہ بندے نے خدا کو نہیں دیکھا

پھولا ہے بہت لالہ جو رنگینی پہ اپنی　اُس نے ترے پانوؤں کی حنا کو نہیں دیکھا

اتنی ہے حیا تجھ میں، کہ افراط حیا سے　آنکھوں نے تری روے حیا کو نہیں دیکھا

ہم نام ہی سنتے ہیں سدا مہر و وفا کا　آنکھوں سے کبھی مہر و وفا کو نہیں دیکھا

ہنستا ہے جو ہر لحظہ پریشانی پہ میری　اُس گل نے زمانے کی ہوا کو نہیں دیکھا

زلفوں کے تموّج کو وہ کیا سمجھے گا جس نے　اُٹھتے ہوئے طوفانِ بلا کو نہیں دیکھا

دیکھا ہے تجھے رقص میں لاکھوں نے، ولیکن　آنکھوں سے مری تیری ادا کو نہیں دیکھا

یاروں کی فقط جنبشِ دامن پہ نظر ہے　افسوس کہ اُس جنبشِ پا کو نہیں دیکھا

اے مصحفی دل کیوں کے لگے باغ میں میرا

پھرتے ہوئے واں بادِ صبا کو نہیں دیکھا

27

ٹکڑا جہاں گرا جگرِ چاک چاک کا یاقوت سا دمکنے لگا رنگ خاک کا

لے جاتے ہیں اُٹھا کے مَلک اُس کی نعش کو یہ مرتبہ ہے تیغِ نگہ کے ہلاک کا

اے باغباں نہ مجھ سے ہو آزردہ، میں چلا اک دم خوش آگیا تھا مجھے سایہ تاک کا

ملنے میں کتنے گرم ہیں یہ، ہائے دیکھیو کشتہ ہوں میں تو شعلہ رخوں کے تپاک کا

اے شعلہ اپنی گرم رَوی پر نہ بھُولیو عالم ہے اَور، آہِ دلِ سوزناک کا

آتا ہے اپنے کشتے کی تربت پہ جب وہ شوخ اک نعرہ واں سے نکلے ہے، روحی فِداک[1] کا

شکرِ خدا کہ نام ہے عصمت کا مصحفی
روزِ جزا گواہ مرے عشقِ پاک کا

28

جانے سے جس گلی کے مجھے عار ہی رہا جب شب ہوئی میں واں پسِ دیوار ہی رہا

آخر نصیب غیر ہوئی وہ متاعِ نیک اک عمر تک میں جس کا خریدار ہی رہا

تخفیف دی نہ اس کو گریباں نے ایک دن دستِ جنوں گلے کا مرے ہار ہی رہا

مانند مرغِ رشتہ بپا، دستِ چرخ میں چھوٹے ہوئے پہ بھی، میں گرفتار ہی رہا

اک پَل لگی نہ آنکھ مری، اس کی یاد میں راتوں کو میں فلک زدہ بیدار ہی رہا

جس دن سے اُس کی تیغ کے جوہر نظر پڑے ہم کو تلاشِ مرہمِ زنگار ہی رہا

اوروں نے اُس سے کامِ دل اپنا کیا حصول میں ایک بوسے تک بھی طلبگار ہی رہا

اک زخم پر کبھی نہ تسلّی ہوا یہ دل بِت زخمِ تازہ اِس کو تو درکار ہی رہا

ہرچند لکھنؤ میں رہے ہم، پہ مصحفی
اس شہر سے دل اپنا تو بیزار ہی رہا

1۔ روحی فداک = میری جان تجھ پر قربان

29

ملنے سے میرے اُس کو زبس عار ہی رہا
جب تک جیا میں، وعدۂ دیدار ہی رہا

اُس لب سے کامیاب ہوئے تا بہ جام مے
محرومِ بوسہ اک یہ گنہ گار ہی رہا

مانندِ مرغ قبلہ نما، مرغ دل مرا
نکلا نہ آشیاں سے گرفتار ہی رہا

اندھیر تھا زبس تری زلفوں کے عہد میں
روزِ وصال، ہم پہ شب تار ہی رہا

کیا اعتماد یاں کی عمارت کا ہے کہ یاں
خورشیدِ زندگی سرِ دیوار ہی رہا

موسم میں خط کے، کیا ہوسِ بوسہ کیجیے
نے وہ صفا رہی، نہ وہ رخسار ہی رہا

اک بار تجھ پہ جس کی نظر پڑ گئی وہ شخص
دنیا میں روے خوش کا خریدار ہی رہا

رکھتے تھے جو زمیں پہ مُطلا[1] عمارتیں
اب وہ رہے نہ اُن کا کچھ آثار ہی رہا

غیروں کے گھر ہمیشہ گیا مصحفی وہ شوخ
پر میرے نام سے اسے انکار ہی رہا

30

باغباں، دیکھ کے کل، ضبطِ نفس بُلبُل کا
لے گیا سامنے ہی گُل کے قفس بُلبُل کا

کام اُن کا ہے یہ، جو لوگ کہ ہیں عاشق دوست،
شوق کرتے ہیں عبث اہلِ ہوس، بُلبُل کا

کر چلا کوچ مگر، قافلۂ فصلِ بہار
دل ہے فریاد سے مانندِ جرس بُلبُل کا

عشق وہ چیز ہے کیا، کچھ جسے جوکھوں[2] ہووے،
کبھی خواہاں نہ سنا ہم نے عَسس[3] بُلبُل کا

کون جانے تھا کہ اس طفل کے ہاتھوں میں ابھی
جی نکل جائے گا مانندِ مگس بُلبُل کا

آشیانے کے بنانے میں یہ دلسوزی کی
جلنے لاکھو[4] نہ ہوا ایک بھی خس بُلبُل کا

مصحفی دام ہے گل چہرہ بتوں کی خاطر
تو بھی گر شوق کرے اب کی برس بلبل کا

1۔ مُطلا = سنہری 2۔ جوکھوں = جوکھم، دشواری 3۔ عَسس = کوتوال
4۔ جلنے لاکھو = جلنے کے قابل

31

خوبی کو تری کس نے مری جاں نہ سراہا
صدقے میں ترے، تجھ کو صنم کس نے نہ چاہا

پونچھے[1] نہ کبھی تو نے مرے دیدۂ گریاں،
رکھا نہ کبھی تو نے مرے زخم پہ پھاہا

جو راہ پسند آوے تری، اُس میں قدم رکھ
مشہور ہے یاں مذہب و مشرب کا دوراہا

گر اس کی یہ صورت ہے، تو اس چاہ کے اوپر
کس طرح سے گذرے گی مری، بارِ الٰہا

خال و خط و زلف اس میں ترے سب ہیں قلم بند
ہے نامۂ اعمال کا اپنے جو سیاہا[2]

جب پردہ اُٹھاوے ہے کبھی مُنھ سے وہ اپنے
اس وقت مرے مُنھ سے یہی نکلے ہے "آہا"

زخمی وہ ترا کون ہے جو خوں میں نہ لوٹا
بیمار ترا کون ہے وہ جو نہ کراہا

ٹھوکر جو لگاتا ہے مرے دل کو تو ہر دم
راہ و روشِ ناز یہ ہے، جلوہ پناہا!

ہے کون سے مذہب میں روا، کس نے، بتا دے
مسجد کے تئیں، واسطے بُت خانے کے، ڈھاہا

کہتا تھا تو اے مصحفی عاشق میں نہ ہوں گا
قول اپنے کے تئیں تو نے غرض زور نباہا

32

ہے کسوں پر جو ذرا وہ بُت بے باک چڑھا
ہر گھڑی آئے ہے پنڈے[3] کے تئیں خاک چڑھا

قد کو یوں اس کے دھواں آہ کا میری لپٹا
جوں کسی نخل پہ ہووے شجرِ تاک چڑھا

جامۂ صبر کیا ماہِ فلک نے ٹکڑے
شب جو کوٹھے پہ وہ مہ، پہن کے پوشاک چڑھا

کون جُھک جُھولے[4] سہے، ہم سے ضعیفوں کے تئیں
نہ ہنڈولے[5] پہ تو اے گردشِ افلاک چڑھا

طلبِ بوسۂ رخسار عبث ہے اس سے
دُور سے دیکھ کے عاشق کو، جو لے ناک چڑھا

اس قدر تو ہے اُسے اپنی نزاکت کا گھمنڈ
گل بھی ہاتھ اُس کے میں دیجے، تو وہ لے ناک چڑھا

1۔ پونچھنا= صاف کرنا 2۔ سیاہہ= کچا چٹھا 3۔ پنڈا (بہ کسرِ اول) جسم 4۔ جُھک جھولے= گردش
5۔ ہنڈولا= میلے میں گھومنے والا بچوں کا کھیل

جب کبھی جاتے ہیں تربت پہ ترے کشتے کی جائے گل دیتے ہیں واں ہم جگرِ چاک چڑھا
دل ہے نازک مرا، ہاتھوں سے ترے ٹوٹ نہ جائے اس نگینے کو نہ تو چرخ پہ حکاک[1] چڑھا
اس طرح باغ میں نرگس کی جھکی ہیں آنکھیں کسی کیفی[2] کو ہو جوں نشۂ تریاک[3] چڑھا
مصحفی کشتہ ہے آگو ہی ترا، تو اس پر
آستیں کو نہ عبث او بتِ سفاک چڑھا

33

اُس نے جس وقت کہ خال اپنے زنخداں[4] پہ رکھا داغ اک اور مرے سینۂ سوزاں پہ رکھا
آ گیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھی میں نے رومال سمجھ، دیدۂ گریاں پہ رکھا
تو خراماں جو ہوا، باغ میں کل نرگس نے اپنی آنکھوں کو ترے گوشۂ داماں پہ رکھا
رات آنکھوں میں کٹی مجھ کو، جدائی کی تری میں نے اک پل بھی تو مژگاں کو نہ مژگاں پہ رکھا
دھجیاں ہو کے اُڑا میرا گریباں، میں نے ہاتھ جس وقت کہ سودے میں، گریباں پہ رکھا
مژدۂ قتل نہ پہنچا جو مجھے زنداں میں، رُک کے، میں اپنا گلا خنجرِ بُرّاں پہ رکھا
مصحفی، لعل لب اس کے کی کروں کیا تعریف
جس نے سو بار، سخن لعلِ بدخشاں پہ رکھا

34

جس سنگ پہ خونِ کوہ کن تھا وہ سنگ بھی تختۂ چمن تھا
اُس گل کو، میں اس ادا سے دیکھا، شبنم[5] کا گلے میں پیرہن تھا
دیکھا میں، ترے شہید کا رنگ جامہ جو گلے میں تھا، کفن تھا
باندھا تھا وہ چیرہ[6] اس نے سر پر ہر پیچ میں جس کے بانکپن تھا

1۔ حکاک = جواہر کو رگڑ کر شکل دینے والا 2۔ کیفی = مست 3۔ تریاک = افیون
4۔ زنخداں = ٹھوڑی 5۔ شبنم = باریک کپڑے کی ایک قسم 6۔ چیرہ = دستار

ہم اُس سے جو کھنچ رہے تھے زیں پیش، یہ بھی ایک عاشقوں کا فن تھا
اے شمع تو خوب سا نہ روئی آگے ترے صبح تک لگن تھا
میں نالہ بلند کیوں کے کرتا سر پر مرے گنبدِ کہن تھا
زلف اپنی جو رات اُس نے کھولی ہر چین میں اس کے، اک ختن[1] تھا
جاتے اُس کے، میں رہ گیا چپ، نالہ ہی تو اپنا ہم سخن تھا
اک بجلی کی کوند ہم نے دیکھی اور لوگ کہیں ہیں، وہ دہن تھا
اے مصحفی کیا گیا تھا تو رات؟
اس کوچے میں شورِ مرد و زن تھا

35

رات پردے سے ذرا مُنھ جو کسو کا نکلا شعلہ سمجھا تھا اسے میں، پہ بھبھوکا نکلا
مہر و مہ اُس کی پھبن دیکھ کے حیران رہے جب ورق یار کی تصویرِ دو رُو کا نکلا
یہ ادا دیکھ کے، کتنوں کا ہوا کام تمام، نیمچہ کل جو تک اس عَربدہ[2] جُو کا نکلا
مر گئی سرو پہ جب ہو کے تصدّق، قمری اُس سے اُس دم بھی نہ طوق اپنے گلو کا نکلا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

36

شب ترے کوچے میں کوئی[3] کہتے ہیں مر کر رہ گیا تو نہ آیا اور وہ مسکیں آہ بھر کر رہ گیا
قافلہ بادِ بہاری کا، یہ اس کو کیا ہوا، باغ سے جاتا تھا، کیوں عزمِ سفر کر رہ گیا
تو گیا پیارے سفر کو، چھوڑ کر میرے تئیں رفتہ رفتہ، میں ترے جی سے بِسَر کر، رہ گیا

1۔ ختن = چین میں ایک شہر کا نام جسے خوشبو سے نسبت ہے
2۔ عربدہ = جنگ جھگڑا 3۔ کوئی بروزن فَع باندھا ہے

ہے گذشت ایسی مزاج اپنے میں، دیکھا بارہا، اس نے دی گالی مجھے، میں درگذر کر، رہ گیا
اب جو بھولے سے ادھر آتا نہیں اس کا خیال ہائے کیا وہ بھی کسی کے جی میں گھر کر، رہ گیا
مُنھ پھرا کر[1] جب چلا وہ مجھ سے، ہنگامِ وداع، اُس کے چہرے پر میں حسرت کی نظر کر، رہ گیا
میں وہ بُلبل ہوں کہ جو بعد از رہائی کے دُو ہیں سامنے صیاد کے پرواز کر کر، رہ گیا
وصل کی شب آتے ہی مجھ سے جو وہ لڑنے لگا کام اپنا کچھ جو سنورا تھا بگڑ کر، رہ گیا

کیا کہوں حالت وداعِ یار کی اے مصحفی!
مُنھ لیا اُس نے پھرا، میں چشم تر کر رہ گیا

37

آنا ہے یوں محال تو اک شب بہ خواب آ مجھ تک خدا کے واسطے ظالم شتاب آ
دیتا ہوں نامہ میں تجھے اِس شرط پر، ابھی قاصد تو اُس کے پاس سے لے کر جواب آ
ایسا ہی عزم ہے تجھے گر کوے یار کا چلتا ہوں میں بھی، اے دلِ پُر اضطراب، آ
یہ خستہ چشم وا ہے، ترے انتظار میں اے صبح مُنھ دکھا کہیں، اے آفتاب آ
تا یہ شبِ فراق کی دیجور[2] دور ہو اے رشکِ ماہ گھر میں مرے بے نقاب آ
آبِ رواں و سبزہ و رُوے نگار ہے ساقی شتاب ایسے میں لے کر شراب آ
روئیں گلے سے لگ کے بہم، خوب کوئی دم کیا دیکھتا ہے اے دلِ بے صبر و تاب، آ
بحرِ جہاں میں دیر شد آمد روا نہیں مانندِ قطرہ جا، تو برنگِ حباب آ
قربانی آج در پہ ترے کرنی ہے مجھے لے کر کے تیغ تو بھی برائے ثواب آ

شاید وہ تجھ کو دیکھ کے غم کھائے مصحفی
تو اُس کے سامنے تو بہ چشمِ پُر آب آ

1۔ منھ پھیر کر کی جگہ استعمال کیا ہے
2۔ دیجور = گھور اندھیرا

38

کہوں کیا، ہجر میں صبر و شکیبائی پہ کیا گذرا　گئی طاقت کدھر تن کی، توانائی پہ کیا گذرا
گیا میں در سے تیرے، اور نہ پوچھا تو نے اتنا بھی　خدا جانے کہ اس کم بخت سودائی پہ کیا گذرا
تری زلفوں کی رعنائی جو دیکھی رات گلشن میں　کہوں کیا، طرّۂ سنبل کی رعنائی پہ کیا گذرا
ہوئی وہ شہر[1] بندِ خیمۂ شرم و حیا، اُس بن　خبر لیلیٰ کو کیا ہے، اُس کے صحرائی پہ کیا گذرا
مری آنکھوں کا جوہر جل گیا کل اک نظارے سے　نہ پوچھو حسن کے شعلے سے بینائی پہ کیا گذرا
غرض دل نے تو سو صدمے اُٹھائے، پر خدا جانے　فغانِ شب سے میری، چرخِ مینائی پہ کیا گذرا

نہ پوچھا تفرقے میں مصحفی اتنا بھی کافر نے
کہ اُس عزلت نشینِ کنجِ تنہائی پہ کیا گذرا

39

جہاں آمد شُدِ اغیار کا دن رات ہے کھٹکا　کروں تدبیر کیا اس کی، مرا دل بے جگہ اٹکا
نہ ترشی، اس کا جوں چاہے تھا جی، تصویرِ شیریں کی　بہت سا تیشۂ فرہاد نے پتھر سے سر پٹکا
اُسے گرمی جو پہنچی آہ آتش ناک سے میری　رقیب روسیہ شب کوئلے کی سی طرح چٹکا
غبارِ ناتواں تھا میں تو، کیا جانے وہ کیا سمجھا　کہ میرے ہاتھ سے دامن کو اِس انداز سے جھٹکا
دفینہ گھر میں کیا تھا اور تو ہم بادہ نوشوں کے　کُھدا جب شہر سارا واں سے نکلا مے کا اک مٹکا
خدا کے واسطے کوئی اس کو راہِ نجد بتلادو　کہاں تک ناقۂ لیلیٰ پھرے ایدھر اُدھر بھٹکا

ادا تو دیکھیو اے مصحفی اُس کی کہ وہ مجھ پر
لگاتا ہے بنا کر تازیانہ زلف کی لٹ کا

40

پردہ اُٹھا کے اس نے جو سینہ دکھا دیا　میں چاک کر کے اپنا گریباں اُڑا دیا

1۔ شہر بند = خانہ نشین کی طرح، شہر نشین

اک پل میں روزِ عیش مرا کردیا سیاہ
آنکھوں میں اس کی کس نے یہ کاجل لگا دیا

جب تک کہ مے نہ پی تھی، کہاں تھا ترا یہ حسن
اِک جام نے تو تجھ کو بھبھوکا بنا دیا

اُس حسنِ پردہ سوز کی تعریف کیا کروں
پردے میں مہر و ماہ کو جس نے بٹھا دیا

اے وائے آگیا مرے آرام میں خلل
خوابِ عدم سے کس نے یہ مجھ کو جگا دیا

کل دیکھتے ہی ہم اُنھیں بے ہوش ہوگئے
آنکھوں نے ان کی ہم کو دھتورا[1] کھلا دیا

ظالم ہے یہ بھی چال کوئی، ٹک خدا سے ڈر
اس چال نے تو خاک میں ہم کو ملا دیا

کیا جی میں اُس کے آئی کہ شعلے پہ شمع کے
اپنے تئیں پتنگ نے کیسا جلا دیا

بس عاشقی کرے کوئی کیا اور بے شعور
تیرے تو غم میں جی بھی میں اپنا کھپا دیا

رکھتا ہے مصحفی سے جو ناحق تو اتنی لاگ
اے چرخِ سفلہ، اس نے ترا کچھ لیا دیا؟

41

کیا تعجب ہے اگر پھر کے ہو اِحیا[2] میرا
کہ مری قبر پہ آیا ہے مسیحا میرا

گر یہی حال ہے اِس کا، تو انھیں گلیوں میں
مجھ کو بدنام کرے گا، دلِ شیدا میرا

مرغِ بسمل کی طرح خاک پہ تڑپوں ہوں پڑا
قاتل اس وقت تو آ دیکھ تماشا میرا

مجلسِ شادی و ماتم کا میں آئیں ہوں، ولیک
قابلِ داغ ہے جوں شمع سراپا میرا

جوں جوں کرتا ہے خط و خال کی وہ آرائش
دن بدن اور فزوں ہووے ہے سودا میرا

میں اگر نیک و گر بد ہوں، تو پھر اُن کو کیا،
ذکر کرتے ہیں عبث مردمِ دنیا میرا

مصحفی جب سے میں گلیوں میں پھرا خاک بسر
نام لڑکوں نے رکھا شہر کے، رُسوا میرا

1۔ دھتورا = بہت تیز قسم کی گھاس جس میں زہریلا اثر ہوتا ہے۔ اس سے کھانے کا تمبا کو بھی بنایا جاتا تھا۔

2۔ احیا = دوبارہ زندگی۔

42

کاٹ کر سر، میں تری راہ میں دھر جاؤں گا
جاں فشانی ہے مرا کام، سو کر جاؤں گا

دل کے دھڑکے سے مجھے نیند نہ آئی شب وصل
سوتے سوتے جو کہا اس نے: میں گھر جاؤں گا

اپنے کوچے سے تو مجھ کو نہ نکال او بے رحم
یاں سے اُٹھ کر کے، میں کس اُجڑے نگر جاؤں گا

یہی اندیشہ رہے ہے مرے دل میں دن رات
کہ میں اس در سے اُٹھا بھی تو کدھر جاؤں گا

ہوں مشوّش[1]، مجھے اس دم نہ لگا ہاتھ صبا،
ورنہ زلفوں کی طرح میں تو بکھر جاؤں گا

جس طرح جائے ہے گذرا ہوا، عالم سارا
میں بھی اک روز اسی طرح گذر جاؤں گا

مصحفی یہ ہی ادائیں ہیں گر اُس کی تو میاں
میں تو جینے کا نہیں، دیکھیو مر جاؤں گا

43

میں زلف مُنھ میں لی، تو کہا: مار کھائے گا؟
چومی جو بھَوں، تو بولا کہ تلوار کھائے گا

خنجر زنی کا صرفہ نہ کر ورنہ جان من
لوہے کو اُس کی تیغ کے زنگار کھائے گا

جب تک صبا نہ باغ سے لاوے گی برگِ گل
کب آب و دانہ مرغِ گرفتار کھائے گا

رو کش ہوا جو تجھ سے، تو دستِ نسیم سے،
ہر برگِ گل، طپانچہ بہ رخسار کھائے گا

دامن ترا، بنے گا گریبانِ عاشقاں،
گر یوں ہی ٹھوکریں دمِ رفتار کھائے گا

چن چن رکھا ہے خارِ مغیلاں کو قیس نے
لیلی کا ناقہ[2] یعنی کہ یہ خار کھائے گا

زہرہ[3] ہے کس کا، کھاوے اس ابرو کی تیغ کو
گر کھائے گا تو ہم سا جگر دار کھائے گا

عصمت میں اس کی شک نہیں، ہاں روز بازپرس
اس بات پر قسم یہ گنہ گار کھائے گا

ہم قافلے میں عشق کے ہیں، ہم کو کیا ہے غم،
غم قافلے کا، قافلہ سالار کھائے گا

1۔ مشوّش = تشویش زدہ، پریشان 2۔ ناقہ = اونٹنی

3۔ زہرہ = پتّا

ہے طُرفہ مخمصے میں کئی دن سے مصحفی
پوچھو تو کوئی، کچھ بھی یہ بیمار کھائے گا؟

44

عاشق تو ملیں گے تجھے، انساں نہ ملے گا
مجھ سا تو کوئی بندۂ فرماں نہ ملے گا

ہوں منتظرِ لطف کھڑا کب سے اِدھر دیکھ
کیا مجھ کو دل اے طرّۂ جاناں نہ ملے گا

کہنے کو مسلماں ہیں سبھی کعبے میں، لیکن
ڈھونڈو گے اگر، ایک مسلماں نہ ملے گا

ناصح اسے سینا ہے تو اب سی لے، وگرنہ
پھر فصلِ گل آئے، یہ گریباں نہ ملے گا

رہنے کے لیے ہم سے گنہ گاروں کے یارب
کیا شہرِ عدم میں کوئی زنداں نہ ملے گا

ہونے کی نہیں تیری خوشی، سروِ خراماں
تا خاک میں یہ بے سروساماں نہ ملے گا

دل اُس سے تو مانگے ہے عبث مصحفی ہر دم
کیا فائدہ اِصرار کا ناداں، نہ ملے گا

45

محنت کے لیے، یا ہوئے آرام کو پیدا
خالق نے کیا ہے ہمیں کس کام کو پیدا

نام آوری چاہے ہے تو ٹک سر کو جھکا چل
خم ہوتے ہی کرتا ہے نگیں نام کو پیدا

داغِ جگر سوختگاں، مثلِ کواکب
گر صبح کیے گُم تو ہوئے شام کو پیدا

چل باغ میں اے گل، تری مے نوشی کی خاطر
غنچے نے صراحی سے کیا جام کو پیدا

پھر فصلِ گرفتاریِ بلبل ہوئی، صیاد
کر جلد کہیں سے قفس و دام کو پیدا

مت زلفِ سیہ فام کو عارض سے جدا کر
جب تک وہ کرے خطِ سیہ فام کو پیدا

اے مصحفی، چاہے ہے اگر شوکتِ ظاہر
کر تو بھی زمانے میں سرانجام کو پیدا

46

حسن و خوبی میں تجھے یوسفِ ثانی سمجھا　　مرتبہ خوب ترے حُسن کا مانی سمجھا
جس کے آگے میں کہا، عشق کا اپنے قصہ　　قصۂ عشقِ زلیخا کو کہانی سمجھا
کیوں رکھی اُس نے مرے ساتھ بنا کینے کی　　خصم گر مجھ کو فنِ شعر کا بانی سمجھا
اُس کی فہمید کے صدقے ہوں، کہ اس چاہت پر　　دوست، دشمن کو مرا دشمنِ جانی سمجھا
اس نے گالی مجھے دی، ہو کے عتاب آلودہ　　اور میں سادہ اسے لطف زبانی سمجھا
اُس کی چتون کی ادا جس نے بھی دیکھی گا ہے　　وہی ہمدم تو مرا دردِ نہانی سمجھا

مصحفی نے کوئی مطلع جو لکھا درد آمیز
خصمِ بے درد اُسے شعرِ فغانیؔ سمجھا

47

میں تو دیکھا نہیں اس جلوہ گری کا سونا　　اُس کے سونے میں تو نکلے ہے پری کا سونا
اک ذرا دیکھیو اِس رشک پری کا سونا　　میں تو دیکھا نہیں اس بے خبری کا سونا
کس کی ٹھوکر یہ لگی کنجِ قفس کو یا رب　　جس نے برباد کیا کبکِ دری کا سونا
لے گئی سایۂ دیوار میں یوں ہم کو اجل　　بر سرِ راہ ہو جوں رہ گذری کا سونا
گل کے رخسار پہ مُنھ رکھ کے سوئی ہے نرگس　　اک ذرا دیکھیو اِس چاؤ بھری کا سونا
رات کو سیر کرے مجلسِ معشوقاں کی　　جس نے دیکھا ہو نہ ہم[1] حور و پری کا سونا
پہنچے منزل کو تو غفلت نے ہمیں آن لیا　　تعبِ[2] راہ سے ہو جوں سفری کا سونا

مصحفی، اب تو مری جان کہیں آنکھیں کھول
صبحِ محشر ہوئی، اِس بے خبری کا سونا!

1- ہم = یعنی باہم مل کر　　2- تعب = تھکن

48

شب کو نظروں میں خیالِ رخِ دلدار رہا دل کی بیداری سے تا صبح میں بیدار رہا

نالے بہنے سے تھمے، چلنے سے دریا ٹھٹکے اشک باری سے نہ یہ دیدۂ خوں بار رہا

بات کرتا ہوں تو کرتے ہو زباں میری بند بات کہنے سے بھی کیا اب یہ گنہ گار رہا

دل جو شیدا ہے مرا اس پہ، وہ جانے گو ہو، مجھ کو کیا اس دلِ شیدا سے سروکار رہا

جب نہ تب روے نکو ہی پہ پڑیں یہ آنکھیں حیف صد حیف کہ اِن کو یہی آزار رہا

مصحفی نے نہ خیال اُس کی گلی کا چھوڑا ق جب ہوئی رات، یہ جا کر پسِ دیوار رہا

نہ سنا پر نہ سنا اُس نے مرے کہنے کو دوستو میں تو بہت اپنا سا سر مار رہا

49

کون سے روز ترا وعدۂ دیدار نہ تھا کون سی شب میں ترے واسطے بیدار نہ تھا

تو نے نادان مجھے جرمِ وفا پر مارا گو گنہ گار تھا، اتنا تو گنہ گار نہ تھا

رکھ دیا زخمِ جگر پر میں نمک کا پھاہا شب کو بالیں پہ مری مرہمِ زنگار نہ تھا

اُس کے در تک ہی نہ پہنچا کہ ہوئی جان ہوا بسکہ قسمت میں مری سایۂ دیوار نہ تھا

سچ ہے اب کیوں نہ میاں اُس کی طرف کو لو گے[1] وعدے سب غیر سے تھے ہم سے کچھ اقرار نہ تھا

تو نے اوروں کو دیے، کیا کوئی گل، اے صیاد حقِ چاکِ قفسِ مرغِ گرفتار نہ تھا

باغِ جنت میں دل اپنا نہ لگا، ہاں سچ ہے باغِ جنت ترے کوچے سے ہوادار نہ تھا

ماہِ کنعاں جو گیا مصر میں، بکنے کے لیے، کوئی کنعاں میں مگر اُس کا خریدار نہ تھا؟

دل کے آجانے کی ہے بات جُدی اے قمری ورنہ کچھ سروِ سہی اتنا طرحدار نہ تھا

مصحفی کی جو میں بالیں پہ گیا وقتِ اخیر
آنکھیں کھولیں تو ذرا اس نے، پر ہشیار نہ تھا

1۔ طرف کو لینا = جانب داری کرنا

50

شبِ ہجراں تھی، میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا　غرض اُس شب عجب ہی بے سروپائی کا عالم تھا

گریباں غنچۂ گل نے کیا گلشن میں سو ٹکڑے　کہ ہر فندق پر اس کے طرفہ رعنائی کا عالم تھا

نہالِ خشک ہوں میں اب، تو یارو کیا ہوا، یعنی　کبھی اِس بیدِ مجنوں پر بھی شیدائی کا عالم تھا

لکھے گر جا و بے جا شعر میں نے، ڈر نہیں اس کا　کہ میں یاں تھا سفر میں، مجھ پہ بے جائی کا عالم تھا

حنا بھی تو لگا دیکھی، پہ وہ عالم کہاں ہے اب　ہمارے خوں سے جو ہاتھوں پہ زیبائی کا عالم تھا

چلا جب شہر سے مجنوں طرف صحرا کی، یوں بولا　نصیب اپنے تو اِس عالم میں رسوائی کا عالم تھا

یہ عالم ہم نے دیکھا مصحفی ہاں اپنی آنکھوں سے
کہ بندہ جی سے اُس معشوق ہرجائی کا عالم تھا

51

کیوں کھینچ کے تیغا[1] مجھے اک بار لگایا　کب تجھ کو گلے سے میں ستم گار لگایا

رکھتے ہی نہ تھے نقد کو کچھ، ہم نے سر اپنا　سودے میں تری تیغ کے ناچار لگایا

کاغذ جو شکایت کا تری ہم نے لکھا تھا　کوچے میں تیرے جا، سرِ بازار لگایا

آیا جو اُسے بوسۂ عاشق کا تصور　مُنہنال[2] سے حقّے کی نہ رخسار لگایا

کی اُس نے علم اپنی جو تیغِ خم ابرو　گذری کا تماشا سرِ بازار لگایا

جو زخم کہ آئے تھے ترے حسن سے اُن پر　سبزے[3] نے ترے مرہمِ زنگار لگایا

گذرا وہ مری خاک سے سو بار ولیکن　دامن نہ زمیں کو گہِ رفتار لگایا

1۔ تیغا میں ایک الف زائد ہے جیسے مرغ سے مرغا۔ 2۔ حقّے کی نے کا وہ حصہ جو منہ میں لے کر کش لیتے ہیں اس کے بعد اُسے رخسار سے چھُو کر گویا صاف کر دیتے ہیں اس تشبیہ سے مصحفی کے گہرے مشاہدے کی گواہی ملتی ہے۔ 3۔ یہاں سبزے سے مراد وہ ہلکا سبزہ ہے جو نو جوانوں کے رخساروں پر خط صاف کرنے کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ مرہم زنگار بھی سبز رنگ کا ہوتا ہے۔

آیا جو کبھی گھر وہ مرے تو وو ہیں چھپ کر ساتھ اس کے، طرح سائے کی، اغیار[1] لگ آیا

ہیں تیغ دو جانب سے علم، ہائے یہ کس نے سُرمہ تری آنکھوں میں جفا کار لگایا

کل دیکھ کے رونے جو لگا، لختِ جگر کا پھولوں کی طرح اس نے اک انبار لگایا

صیاد نے کیوں رخنۂ دیوارِ چمن سے روے قفسِ مرغِ گرفتار لگایا

اے مصحفی ہیں مرد وہی یار جنھوں نے
دل قحبۂ دنیا سے نہ زنہار لگایا

52

تو ایسا غیر کے حصے میں آیا کہ میں نے تجھ کو جب ڈھونڈا نہ پایا

ٹک اپنے جی میں تو انصاف تو کر مجھے کس کس طرح تو نے ستایا

تری تقصیر کیا، میرا ہی ہے جرم جو میں نے تجھ سے کافر، دل لگایا

طریقِ عاشقی میں ہوں میں ثابت مجھے سو بار تو نے آزمایا

نہ کرنا تھا بہاراب میں تو یہ کام گریباں کن دنوں ہم نے سِلایا

پکڑ کر ہاتھ مَیں، اُس کا لیا چُوم طپانچہ اُس نے جب مجھ پر اُٹھایا

وہ غافل تھا مزے داری سے یعنی ق مزا یوں چاہ کا اُس کو چکھایا

کبھی کپڑے رنگے میں اُس کے اوپر کبھی پھر بھیس جوگی کا بنایا

کبھی آپ ہی گیا بن کر کے قاصد کبھی خط ہاتھ قاصد کے بھجایا[1]

کبھی کی جا کے ہمدم کی خوشامد کبھی محرم کو دردِ دل سنایا

غرض سو سو طرح کے فن میں گانٹھے
تب اُس کو مصحفی قابو میں لایا

1۔ اغیار جمع ہے مگر یہاں غیر کے معنی میں آیا ہے۔ لگ آیا کا مفہوم ہے ساتھ میں آ گیا۔

2۔ بھجوایا کی جگہ بھجایا عوامی بولی ہے۔

53

غم کی شدّت میں کروں فکر میں شیدائی کیا — جان بھی لیوے گی تو اے شبِ تنہائی کیا

سن کے آواز مری گھر میں، یہ بولا کافر — دیکھیو در پہ کھڑا ہے وہی سودائی کیا

باندھ نکلا تھا جو وہ اپنی کمر سے، اُس کو — چشم بد دُور بھی ہے اُسے اک[1] لائی کیا

کرکے گلشن میں خرام اُس گل رعنا نے کہا — خاک میں مل گئی اے گل تری رعنائی کیا

گو زن و مرد کریں عشق کا اُس کے چرچا — مردِ عاشق کو ہے اندیشۂ رسوائی کیا

خونِ عشاق سے گلگوں ہے تری فندقِ دست — تجھ کو درکار ہے اب زینت و زیبائی کیا

مصحفی تو جو کرے عشق کا اُس کے دعویٰ
کتنا مقدور ترا اور توانائی کیا!

54

مجھ سے مطلب ہے ترا اے شبِ تنہائی کیا — جا کہیں، ہے تو، مرے درپئے رسوائی کیا

جس کو کہتے ہیں شب ہجر، خبر لیجو کوئی — جی دھڑکتا ہے مرا، پھر وہی شب آئی کیا

جب سے عاشق ہوا میں اُس کا، سمجھتا ہی نہیں — صبر کیا چیز ہے، ہوتی ہے شکیبائی کیا

اُس کے آنے کی خبر سن کے خیابانوں میں — دیکھیو بادِ صبا پھرتی ہے گھبرائی کیا

خاک سے اُٹھ نہیں سکتا ہوں میں، جوں نقشِ قدم — نہیں معلوم ہوئی میری توانائی کیا

حالِ دل کہنے لگوں ہوں تو مری صورت دیکھ — ہنس کے کہتا ہے وہ: بکتا ہے یہ سودائی کیا؟

مصحفی کے تئیں میں غش میں پڑا دیکھا کل
تیری تصویر کسی نے اُسے دکھلائی کیا

55

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا — اپنے رہنے کو مکاں چاہیے تنہائی کا

1۔ اِکلائی (جیسے دولائی) اکہری چادر

باغ میں اُگتے ہیں واں سے گلِ رعنا ابتک جس جگہ سایہ پڑا تھا تری رعنائی کا
رہ زنِ قافلۂ دل ہوئیں جب وہ مژگاں پہلے اسباب لٹا صبر و شکیبائی کا
ہیں جو حیراں ترے، صورت ہیں مرقّع کی تمام جن کو باہم نہیں کچھ ربط شناسائی کا
بزم میں شمع ہوئی، شرم سے پانی پانی شب جو مذکور چلا اُس کی خوش اعضائی کا
بات زنہار نہ کچھ مُنھ سے نکلنے پائی ہنسنے ہنسنے ہی میں گل کھل گیا[1] رسوائی کا
شیشۂ دل کو مرے چور کیا جو اُس نے کیا لیا تھا میں بھلا گنبدِ مینائی کا
مصحفی اک غزل اس مردہ زمیں میں لکھ اور
گر تجھے شعر میں دعویٰ ہے مسیحائی کا

56

گرچہ مذکور ہے ہر جا تری رعنائی کا پر فسانہ نہیں کم میری بھی رسوائی کا
پھول لالے کے نہیں یہ کہ زمیں سے ابتک جوش مارے ہے پڑا خوں کسی سودائی کا
یار کہتے ہیں مجھے یوں، تو شکیبائی کر کاش ہوتا مجھے مقدور شکیبائی کا
کیا تماشا ہے کہ آگے سے ترے کوچے کے قدم اُٹھتا نہیں آگے کو تماشائی کا
خونِ عشاق سے نت اُن کو حنائی رکھنا میں تو کشتہ ہوں ترے ہاتھوں کی زیبائی کا
تو نے جس دن سے تراشا ہے میاں اپنے تئیں شور عالم میں پڑا ہے تری مرزائی کا
مصحفی چاہے تو لکھ جائے غزل اور بھی تو
میں مُقِر ہوں ترے خامے کی توانائی کا

57

داغ دیکھے تھا کھڑا، لالۂ صحرائی کا زور عالم نظر آیا ترے سودائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا، عوض اپنے مدام کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

1۔ گل کھلنا = نیا شوشہ نکلنا، راز افشا ہونا

تو نہ بدنام کہیں ساتھ مرے ہو جاوے مجھ کو گر غم ہے تو پیارے تری رسوائی کا

عشوہ و ناز و ادا اُس کے یہی کہتے ہیں لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا

خوب روئی جسے کہتے ہیں سو ہے چیزِ دگر شوق یوں کس کو نہیں ورنہ خود آرائی کا

یہ بھی کوئی شرم ہے، آنکھوں کو اُٹھا کر صاحب لیجیے مجرا تو ذرا اپنے بھی مجرائی کا

مصحفی، ریختہ پہنچا ہے مرا رتبے کو
شور یاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

58

قاصد اُس کو سے پھرا یا نہ پھرا ہووے گا جی دھڑکتا ہے، خدا جانیے کیا ہووے گا

پا سے دیوارِ کفک[1] جلوہ نہ تھا یوں تو کبھی خوں کسی کا ترے کوچے میں بہا ہووے گا

اب کے گر فصلِ گل آئی تو جنوں کے ہاتھوں دھجیاں ہو کے گریبان ہوا ہووے گا

فصلِ گل، فصلِ خزاں دونوں گئیں اے صیاد مرغِ دل کون سے موسم میں رہا ہووے گا

درہمی وضع سے آج اُس کی نکلتی ہے بہت آرسی میں کہیں مُنھ دیکھ لیا ہووے گا

بے خبر، رنگ حنا میں تو نہ تھی یہ شوخی خوں کسی کا ترے تلووں سے لگا ہووے گا

میں تو جاتا ہوں مُوا خجلتِ رسوائی سے ہائے کس کس نے مرا قصہ سنا ہووے گا

پُوچھ مت حالِ دلِ مصحفیِ خستہ، میاں
وہ اگر صاف کہے گا تو خفا ہووے گا

59

غم ترا دل میں مرے پھر آگ سلگانے لگا
پھر دھواں سا اِس سے کچھ اُٹھتا نظر آنے لگا

1۔ پانو کے تلوے کی دیواریں (اطراف)

عشق کے صدمے اُٹھائے تھے بہت، پر کیا کریں
اب تو ان صدموں سے کچھ جی اپنا گھبرانے لگا

میں ہی کچھ بے صبر و طاقت عشق میں اُس کے نہیں
دل بھی اب بے طاقتی سے کام فرمانے لگا

دیکھتے ہی اُس کے، کچھ اِس کی یہ حالت ہوگئی
جو مجھے سمجھائے تھا، میں اُس کو سمجھانے لگا

رقص میں، اُس کے سنجافِ[1] سرخ کے عالم کو دیکھ،
شعلۂ جوالہ[2] دامن سے لپٹ جانے لگا

ہوچکی فصلِ گریباں چاکی، اب دستِ جنوں
دھجیاں کرکے مجھے دامن کی دکھلانے لگا

مُنھ سے نکلا تھا مرے اتنا ہی کیا اچھی ہے زلف
سنتے ہی اِس بات کے کچھ وہ تو بل کھانے لگا

کیوں نہ پھاڑوں میں گریباں، میرے ہوتے بزم میں
غیر سے بندِ قبا وہ اپنے کھلوانے لگا

مصحفی میں تو نہ لکھتا تھا ولے شوقِ فضول
اس زمیں میں پھر غزل اک مجھ سے لکھوانے لگا

60

حُسن اُس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا
چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا

ہاتھ پر دھر ہاتھ، اس کا بیٹھنا، ہے کیا غضب
اس ادا سے تو بس اپنا جی ہی ڈوبا جانے لگا

لاگ ہے کیا ساتھ عاشق کے، ٹک اس کو دیکھیو
یاں جو جی اُلجھا تو واں وہ زلف سلجھانے لگا

1۔ مُوباف۔ جس سے چوٹی گوندھ کر باندھتے ہیں 2۔ رقص کرتا ہوا شعلہ

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اُس سے واقف بھی نہ تھا	یا یہ عالم ہے کہ عالم اُس پہ مرجانے لگا
عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھر ناچار ہو	آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا
اُٹھتے اٹھتے اُس کے، کل میری یہ حالت ہو گئی	جی جو گھبرایا تو بس پھر میں بھی گھبرانے لگا
دل جو رہتا ہے گریزاں مجھ سے اتنا، کیا سبب	ظاہراً اب کچھ مرے پہلو سے دکھ پانے لگا
کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آ کر کہہ دیا	جس کو سن کر، سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا

مجھ کو ساقی کی یہ مجلس میں بہت بھائی ادا
مصحفی کو جام خالی سے جو ڈہکانے[1] لگا

61

ہاتھ میرے نہ کبھی دامنِ دلدار لگا	پھر رہے کیونکے گریباں میں بھلا تار لگا
خاکِ رہ ہیں جو تری، رحم کر اُن پر ظالم	یوں تو دامن کو نہ ٹھوکر گہِ رفتار لگا
ہائے عارض پہ ترے جلد نکل آیا خط	بے طرح آئینہ حسن کو زنگار لگا
خوں کو تا گوشۂ داماں بھی پہنچنے نہ دیا	بل بے چالاکی، الگ ہو گئے تلوار لگا
جس جگہ بیٹھ گیا کھول کے زلفیں وہ صنم	سودے والوں کا دو رستہ وہیں بازار لگا
جنسِ حسن اُس کی پہ جس دن سے پڑا ہے پردہ	ساتھ دلاّل کے پھرتا ہے خریدار لگا
شکوہ کرتا ہوں جو اُس کا تو رہے ہے یہی ڈر	کہ کہیں ہووے نہ دشمن پسِ دیوار لگا
ابرِ تر کو ہے اگر رونے پر اپنے دعویٰ	تو بھی ساون کی جھڑی دیدۂ خوں بار لگا

مصحفی عشق کی ہے گرمیِ ہنگامہ وہی
کشورِ حسن میں نت رہتا ہے بازار لگا

62

ایک ہچکی میں ٹھکانے دلِ بیمار لگا	اس پر اب تیر لگا خواہ تو تلوار لگا

1۔ ڈہکانا= ٹالنا، حقارت کے ساتھ، دھوکا دینا

کل جو میں شدّتِ گرما میں گیا سوے چمن　　کیسا مطبوع مجھے سایۂ دیوار لگا

جن کے سر زانو پہ ہیں اُن کے الم کیا جانو　　تم تو سو رہتے ہو گل تکیوں[1] پہ رُخسار لگا

خارِ صحراے جنوں، کاوشِ بے جا سے تری　　اپنے دامن میں تو ہرگز نہ رہا تار لگا

کیا ارادہ ہے جو آ بیٹھے ہو تم مجلس میں　　مسّی ہونٹوں کے تئیں اپنے دھواں دھار لگا

رنگ اور خون میں ٹک فرق کراے مرغِ چمن　　گل سمجھ کر نہ مرے زخم کو منقار لگا

پھر وہ بیمار بھلا کیوں کے پنپنے پاوے　　جس کو ہردم ہو غمِ دوریِ دلدار لگا

اس میں بوسے کا اک انداز نکلتا ہے صریح　　لب سے اپنے نہ مری جاں لبِ سوفار لگا

63

پاس میرے وہ ترا پیار سے آنا نہ رہا　　وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نہ رہا

ہے یہ قاروں کے دفینے سے کنایت کہ کبھی　　دہر میں پاس بخیلوں کے خزانہ نہ رہا

ہوش کا اُس کے میں کشتہ ہوں کہ وہ مایۂ ناز　　شب رہا گھر مرے اور غیر نے جانا نہ رہا

کب شبِ وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے　　درمیاں میں شبِ ہجراں کا فسانہ نہ رہا

ہو کے ناچار کہا، میں نہیں جاتا، اُس کو　　پاس سے جب مرے اُٹھنے کا بہانہ نہ رہا

پایا میں زلف بنانے ہی کا مائل تجھ کو　　ہائے کب دو دو گھڑی ہاتھ میں شانہ نہ رہا

مصحفی کا نہ نشاں پوچھ، کہ مدّت ہوئی میاں
پائنتی گھس گئی تربت کی، سرہانہ نہ رہا

64

کوچے سے ترے دل مجھے جانے نہیں دیتا　　اسبابِ سفر یاں سے اُٹھانے نہیں دیتا

ہے رشکِ فلک کو مری اوقات سے یاں تک　　غم کھاؤں تو غم بھی مجھے کھانے نہیں دیتا

شانے نے زبس اس کو اِجارے[2] میں لیا ہے　　زلفوں کو تری ہاتھ لگانے نہیں دیتا

1۔ گل تکیہ = چھوٹا تکیہ جس پر رخسار رکھ کر سوتے ہیں　　2۔ اِجارے میں لینا۔ ٹھیکہ لینا

یارب کہ شتاب اس کے اجل سامنے آوے　　جو مجھ کو ترے سامنے آنے نہیں دیتا
کہتے ہیں کہ پھر فصلِ گُل آئی ہے چمن میں　　کیوں دستِ جنوں دُھوم مچانے نہیں دیتا
دشمن ہے وہ یاں تک کہ نسیم اور صبا کو　　تربت پہ مری پھول چڑھانے نہیں دیتا
اے مصحفی سمجھا تو ہی اس دستِ جنوں کو
مجھ کو یہ گریبان سِلانے نہیں دیتا

65

قصد کرتا ہوں جو اُس در سے کہیں جانے کا　　دل یہ کہتا ہے کہ "تو جا، میں تو نہیں جانے کا"
آبرو تک بھی جو ہو عشقِ بتاں میں حاضر　　اس کو اندیشہ ہے پھر کیا دل و دیں جانے کا
رات اندھیری ہے، ستانے کا مرے قصد نہ کر　　یہ کوئی وقت ہے اے زُہرہ جبیں جانے کا
چین میں زلف کے ہم کو تو نظر آئی شام　　چین کو جائے جسے شوق ہو چیں جانے کا
بے اثر واں سے کئی بار پھری، سوے فلک　　تو تو اب قصد نہ کر آہِ حزیں جانے کا
کیا رہے چین سے ہم خاک کہ دنیا میں ہمیں　　غم رہا تا نفسِ باز پسیں، جانے کا
رہ گیا نالہ مرا کیوں فلکِ اوّل پر　　تھا گھمنڈ اِس کو تو تا عرشِ بریں جانے کا
تجھ سے ناچار ہیں اے مرگ، وگرنہ ہم تو　　قصد کرتے نہ کبھی زیرِ زمیں جانے کا
مصحفی آئے تھے ہستی میں عدم سے جو یار
پھر ارادہ کیے بیٹھے ہیں وہیں جانے کا

66

دمِ آخر ہے یہ، تجھ کو ہے روا مل جانا　　بر سرِ راہ ہیں ہم، ہم سے ذرا مل جانا
سر کو رکھ زانو پر روتا ہوں میں، جب آئے ہے یاد　　چوری چوری وہ ترا چپکے سے آ، مل جانا
ہم اسیرانِ قفس سے بھی ذرا بہرِ خدا　　باغ کو جائے تو اسے بادِ صبا، مل جانا
کیا گلہ تجھ سے کریں ہائے ہم اس چاہت پر　　ساتھ غیروں کے مناسب ہے ترا مل جانا؟

نہیں کچھ دور گیا قافلہ یاروں کا ابھی — جا کے اے دل بہ سرِ راہِ فنا مل جانا
تھی گلے لگنے کی تیرے جنھیں حسرت ان کو — تیرے خنجر کا میسّر نہ ہوا مل جانا
اُس کی لذّت کہوں کیا ہائے، وہ اک دل کے تئیں — ہجر کے بعد جو دیتا ہے مزا مل جانا
ہم بھی مشتاق ہیں مُدّت سے تمھارے صاحب — اِس طرف آؤ تو ہم سے بھی بھلا مل جانا
مصحفی عالمِ رنجش کا مزا رکھتا ہے
روٹھنا اُس کا، مرا ہو کے خفا مل جانا

67

جاؤ اُس کُو میں، تو اک اک سے جدا مل جانا — یارو تم ہم سے بھی از بہرِ خدا مل جانا
ہم نے باندھا ہے سرِ راہ پہ تیری تکیہ — جی میں آوے تو فقیروں سے ذرا مل جانا
کیا بُرا کام کیا تونے یہ ظالم، تجھ کو — میرے دشمن سے مناسب تو نہ تھا مل جانا
قسمت اس کوچے میں پامال کرے ہے تو کرے — خاک میں ہم کو ہے اے بادِ صبا مل جانا
ہاتھ قاتل کا مرے خون سے بھر جائے تو پھر — رنگ سے اُس کے تو اے رنگِ حنا مل جانا
اپنی قسمت کی قسم کھایئے، ہم کو اس کا — عید کے دن بھی میسّر نہ ہوا مل جانا
سچ تو یہ ہے، نہیں قسمت میں ہر اک بسمل کی — زخمِ شمشیر سے قاتل کے مزا مل جانا
خواہش وصل میں خلق اُس کی پڑی پھرتی ہے
مصحفی اس سے کچھ آسان ہے کیا مل جانا؟

68

نہ مرے دل کو گرفتار کرو تم اپنا — جاؤ جی اور کوئی یار کرو تم اپنا
ہر گھڑی پاس بلاؤ نہ مجھے جانے دو — کہیں موقوف بھی یہ پیار کرو تم اپنا
یوں جو چاہو تو چھپا لو کبھی مکھڑا ہم سے — اک تہِ زلف نہ رخسار کرو تم اپنا
پاس اس کے جو میں جاتا ہوں تو کہتا ہے یہی — مُدّعا بھی تو کچھ اظہار کرو تم اپنا

دلِ صد چاک مرا گُل سے تو کچھ کم بھی نہیں زیب دے، گر گلِ دستار کرو تم اپنا
مجھ کو رونا ہے تمھارا، مجھے کیا روتے ہو فکر اے دیدۂ خوں بار، کرو تم اپنا
یوں ہی اک روز میاں مصحفی کُھل جاؤ گے
کچھ علاجِ دلِ بیمار کرو تم اپنا

69

رہتا ہوں تجھے دیکھ کے میں ہاتھ ہی ملتا اے وائے کروں کیا، مرا بس کچھ نہیں چلتا
اُچھلا نہ یہ دل چاہِ زنخداں سے صد افسوس ڈوبا ہوا دریا کا جو ہوتا تو اُچھلتا
لایا درِ قاضی سے میں شب دخترِ رَز کو مستی میں غضب تھا جو مرا پانو پھسلتا
انداز سے خالی نہیں یہ بات کہ گھر کو میں تجھ سے کہوں چل، تو کہے: میں نہیں چلتا
شب مصحفی بیٹھا تھا بھرا، ہم نے نہ چھیڑا
اس ڈر سے، کہ کیا جانے وہ کیا زہر اُگلتا

70

تو جاتے سرِ رہ میں جس کو کہ نظر آیا وہ رفتہ دل اے ظالم پھر اپنے نہ گھر آیا
پھر آنکھوں کے آگے کچھ پردہ سا نظر آیا کوئی لختِ جگر شاید نوکِ مژہ پر آیا
کیا جانے کرے گی کیا، یہ کم نگہی تیری جوں شیشۂ مے ساقی، دل اپنا تو بھر آیا
اس گرمی سے روئے ہم، یعنی کہ شب آنکھوں میں پرکالۂ آتش تھا جو لختِ جگر آیا
خوں ریزی و جلادی، بے دردی و بیرحمی سب کام کیے تونے پر لطف نہ کر آیا
بے وجہ نہیں تیرا ایدھر سے گذر کرنا کہیں[1] رہ نہیں بھولا ہو، تو آج کدھر آیا
تکلیف نہیں دیتا میں آپ ہی اُسے ورنہ نالے کو مرے اکثر پیغامِ اثر آیا
واں بسکہ عزیزوں پہ تلوار برستی تھی اس کوچے سے جو آیا وہ خون میں تر آیا

1۔ کہیں کو کَہیں پڑھا جائے گا بروزن فَع

اے مصحفی پیری میں گھر بیٹھے نہیں بنتی
اُٹھ صبح ہوئی روشن اور وقتِ سفر آیا

71

دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہ گیں رہا　دل غم سے اور دل سے مرے غم قریں رہا
آئینہ بن کے گر میں گیا اُس کے روبرو　تو بھی تو میری شکل سے چیں بر جبیں رہا
جتنا تو چاہے اُتنا گریباں کو کر رفو　اب ہاتھ اپنے کام سے اے ہم نشیں رہا
گو گردشِ فلک نے ہے آوارہ کر دیا　مت جانو تم کہ اُس کا تعشق نہیں رہا
اِک بار پھر بھی یار کے کوچے میں مصحفی
آوے گا قصد کر کے، جو جیتا کہیں رہا

72

رونے سے کام بسکہ شب اے ہم نشیں رہا　آنکھوں پہ کھینچتا میں سرِ آستیں رہا
مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں　رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا
چینِ کمندِ زلف ہوئی وا نہ ایک دن　بھر عمر اُس کے شوق میں آہوے چیں رہا
ہم دم، جو دیکھتا ہوں تو پہلو میں دل نہیں　بیٹھا تھا اس کے پاس، مرا دل وہیں رہا
نازک مزاج تھا میں بہت، اس چمن کے بیچ　جب تک رہا تو خندۂ گل سے حزیں رہا
آخر کو ہو کے لالہ اُگا نو بہار میں　خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا
ہرگز ہوا نہ کام مرا ایک دن تمام　میں نیم کشتۂ نگہِ شرگیں رہا
دی جاں میں ایسے ہوش سے اپنی، کہ خلق کو　جینے کا میرے تا دمِ آخر یقیں رہا
یاران گرم رَو تو سب آگے نکل گئے　اُن سے میں تنگِ قافلہ پیچھے کہیں رہا
رکھوں میں روک کیوں کے، دل اپنے کو مصحفی
کہنے میں میرے اب تو مرا دل نہیں رہا

73

ہے یہ دلِ دیوانہ تو پروانہ پری کا　　کہتے ہیں اسے اس لیے دیوانہ پری کا
نکلے ہے نزاکت دلِ صد چاک سے میرے　　ازبسکہ کنگھی روزوں یہ تھا شانہ پری کا
کیا لے کے کرے حورِ بہشتی کو وہ، زاہد　　طالع نے کیا ہو جسے ہم خانہ پری کا
دیکھ آیا ہوں اک طفلِ پری زاد کو یارو　　اس شب تو سناؤ کوئی افسانہ پری کا
اے چشم نہ دوں گا میں تجھے اشک کو اپنے　　تعویذ ہے یہ گوہرِ یک دانہ پری کا
مستی سے تری چشم کی ہوتی ہے مقابل　　معمور ہوا چاہے ہے پیمانہ پری کا
بد بھی تو نہیں، کیجیے گر وقفہ جہاں میں　　عالم تو رکھے ہے یہ صنم خانہ پری کا
ہے دور ترے روے دل افروز کا عالم　　پھبتا ہے جو کہیے اسے جانانہ پری کا
دیکھے جو کوئی مصحفی دیوان کو تیرے
ہم حور کا قصہ ہے ہم افسانہ پری کا

74

ہردم ہے تیرے حسن کا حیران دوسرا　　زلفوں کا بھی کھڑا ہے پریشان دوسرا
ٹوٹے تھے اُس کے تیر جو سینے میں، اب تلک　　پیکاں کے بعد نکلے ہے پیکان دوسرا
اک جیب تھا، سو نذر کیا تیری، اے جنوں　　لاؤں کہاں سے اب میں گریبان دوسرا
گریہ کو میرے دیکھ کے کہتی ہے ایک خلق　　آیا ہے یہ زمین پہ طوفان دوسرا
تو ہے وہ بے بدل کہ تری شکل کا صنم　　پیدا کیا خدا نے نہ انسان دوسرا
عاشق تو یوں ہزار ترے ہوویں گے و لے　　مجھ سا ملے گا تجھ کو نہ اے جان دوسرا
اشک آیا چشم خانہ میں یوں لختِ دل لیے　　مہماں کے ساتھ جیسے ہو مہمان دوسرا
اک بوسہ لے کے لب کا ترے، کب ٹلوں ہوں میں　　جب تک کہ لوں نہ تجھ سے مری جان دوسرا

مدّت ہوئی کہ ایک تو دیواں میں کہہ چکا
اے مصحفی ہوا ہے یہ دیوان دوسرا

75

تم بھی آؤ گے مرے گھر جو صنم کیا ہوگا | مجھ پہ اک رات کرو گے جو کرم کیا ہوگا
ایک عالم نے کیا ہے سفر ملکِ عدم | ہم بھی جاویں گے اگر سوئے عدم کیا ہوگا
دمِ رخصت ہے مرا، آج مری بالیں پر | تم اگر وقفہ کرو گے کوئی دم کیا ہوگا
دیکھ اس چاک گریباں کو تو یہ کہتی ہے صبح | جس کا سینہ ہے یہ کچھ، اس کا شکم کیا ہوگا
چین ہو جائے گا دل کو مرے، از راہِ کرم | میری آنکھوں پہ رکھو گے جو قدم کیا ہوگا
صحبتِ غیر کا انکار تو کرتے ہو ولے | کھاؤ گے تم جو مرے سر کی قسم کیا ہوگا
شانہ اک عمر سے کرتا ہے دو وقتی خدمت | زلف بھی اُس سے اُگر ہووے گی خم کیا ہوگا
ابھی آغازِ محبت ہے، کچھ اس کا انجام | تجھ کو معلوم ہے اے دیدۂ نم کیا ہوگا

مصحفی وصل میں اس کے جو موا جاتا ہو
اُس پہ ایّامِ جُدائی میں ستم کیا ہوگا

76

کرتا تھا کہیں وصف میں اُس غنچہ دہن کا | بلبل نے اُڑایا وہیں انداز سخن کا
ایسا نہ خلل کچو کہیں اے دلِ بے تاب | چھالا نہ سرک جائے مرے داغِ کہن کا
دریا میں یہ لہروں کا تلاطم نہیں دیکھا | رخسار پہ عالم ہے جو زلفوں کی شکن کا
مہندی کو لگا کر وہ بُتِ شوخ گیا تھا | کیا جانے ہوا ہوئے گا کیا رنگ چمن کا
ہر موج دکھاوے شبِ مہتاب کا عالم | دریا میں پڑے عکس جو اس گورے بدن کا
کِس زلفِ سیہ فام کے آئی ہے مقابل | ہے شمع کے چہرے پہ اثر چاند گہن کا
اُس ساعتِ بد نکلے وطن سے کہ پلٹ کر | مُنھ ہم نے نہ دیکھا کبھی پھر صبحِ وطن کا

اے شمع خبردار ہو، یہ مجلسِ مے ہے ڈرتا ہوں کہ رپٹے نہ کہیں پانْو لگن کا
اے مصحفی سنتے ہیں وہاں قدرِ سخن ہے
بہتر تو ہے گر تو بھی کرے قصد دکن کا

77

کسی جنگل کے گل بوٹے سے جی میرا بہل جاتا ترے ہاتھوں سے عاجز ہوں، نہیں تو میں نکل جاتا
نہ پائی دسترس قاتل نے اتنی، ورنہ وہ اک دن ہماری خاک پر آ کر کفِ افسوس مل جاتا
لگی اے شمع، آتش جس طرح تیرے گریباں کو مزا ہوتا اگر فانوس کا دامن بھی جل جاتا
نہ پگھلا دل ترا گرمی سے میری آہ کی ظالم گر اِس دل کی جگہ پتھّر بھی ہوتا، تو پگھل جاتا
مزاج اُس کا سیہ پوشی پہ گر آتا محرّم میں تو میرا ذکر کیا ہے، رنگ عالم کا بدل جاتا
نہ آئی موت بھی ہم کو تو ایّامِ جُدائی میں جو آئے روز کے، یہ مرنے جینے کا خلل جاتا
صفِ مژگاں کے سنمکھ میں ثباتِ دل کا بندہ ہوں اگر اس معرکے میں کوہ بھی ہوتا تو ٹل جاتا
نہ پوچھا یار نے مستی میں میرا حالِ دل ورنہ مرے مُنھ سے خدا جانے کہ اُس دم کیا نکل جاتا
فراق اُس کی گلی کا مصحفی کو زار رکھتا ہے
جو واں یہ خستہ جاں رہتا تو بارے ٹک سنبھل جاتا

78

چاہنا یوں نہ دلِ نشیں ہوگا جان جاوے گی تب یقیں ہوگا
میرے پہلو میں اے دلِ بے تاب تجھ کو آرام بھی کہیں ہوگا
سنگ دل کا مرے بھی دل کبھی نرم تجھ سے اے آہِ آتشیں ہوگا
جب کہ ہم بزم سے اُٹھ آویں گے غیر واں کیوں نہ ہم نشیں ہوگا
کیونکے دیکھیں گے ہم اِن آنکھوں سے کہ تو غیروں پہ خشمگیں ہوگا
سوچ رہتا ہے اب یہی دن رات مہرباں کب وہ مہ جبیں ہوگا

جس زمیں سے یہ لالہ اُگتا ہے — خوں کسی کا تہِ زمیں ہوگا
پاک نظروں سے تجھ کو دیکھے گا — کوئی مجھ سا جو پاک بیں ہوگا
تیغ رکھ دی نہ، کیا کسی کا کام — تجھ سے اے طفلِ نازنیں ہوگا
ایک دن اشکِ خوں کے ہاتھوں سے — سرخ ہر تارِ آستیں ہوگا
مار سمجھا میں جس کو، سر پہ مرے — سایۂ زلفِ عنبریں ہوگا
اے جرس، مجھ کو نالہ یاد نہ دے — ورنہ تو اور بھی حزیں ہوگا

مصحفی گر یہ دل ہے تو ہم سے
کارِ دنیا نہ کارِ دیں ہوگا

79

ہائے اُس کا ہمک کے اُٹھ جانا — جیسے بجلی چمک کے اُٹھ جانا
قہر ہے یہ کہ میرے پہلو سے — اندک اندک سرک کے اُٹھ جانا
بیٹھنا خاک پر مری، وو ہیں — اس سے دامن جھٹک کے اُٹھ جانا
یہی اک بات تم کو آتی ہے — روٹھنا اور بک کے اُٹھ جانا

مصحفی در پہ اُس کے جانا رات
صبح کو سر پٹک کے اُٹھ جانا

80

اس دمِ سرد سے خطرہ نہ اگر کیجیے گا — نالۂ گرم سے للہ حذر کیجیے گا
اب کی آئے جو شبِ وصل تو اس شب کے تئیں — شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کیجیے گا
کیا شتابی ہے، ٹھہر، ہم بھی تو چلتے ہیں نسیم — رہ کے اس کوچے میں کیا خاک بسر کیجیے گا
کون کہتا ہے کہ تم زلف کو شانہ نہ کرو — پر مرے حالِ پریشاں پہ نظر کیجیے گا
کیوں نہ آگو ہی[1] سب اسباب بہم کر رکھیں — آخر اک روز تو دنیا سے سفر کیجیے گا

1۔ آگو = پہلے

میں تو گذرا ہی، پر اتنی سی وصیت ہے مری گاہ گاہے مری تربت پہ گذر کیجیے گا

مصحفی منزلِ ہستی نہیں رہنے کی جگہ
اس خرابے میں مری جان نہ گھر کیجیے گا

81

ابنِ مریم آسماں کا، میں زمیں کا ہو رہا جو کوئی ٹھہرا کہیں، بس وہ وہیں کا ہو رہا

بسکہ میں رکھا کیا شب دیدۂ خوں بار پر خوں کا ساغر، حلقہ میری آستیں کا ہو رہا

تھی دنی[1] جس کی طبیعت اُس نے کی دنیا کی میل اہلِ تقویٰ جو کہ تھا سو اہلِ دیں کا ہو رہا

جب تلک آوے ہی آوے محملِ لیلیٰ اُدھر کام اتنے ہی میں اس صحرانشیں کا ہو رہا

مصحفی کی پھر نہ آئی اُس کے کوچے سے خبر
جا کے بندھوا اُس کی زلفِ عنبریں کا ہو رہا

82

جفا و جورنت کی، اب تو یہ دل سہہ نہیں سکتا وگر چاہے کہ تجھ بن رہ سکے تو رہ نہیں سکتا

کرے ہے غیر سے باتیں وہ میرے روبرو لیکن مروّت کے سبب اک بات بھی میں کہہ نہیں سکتا

پھپھولا سا مرا دل پک رہا ہے تیرے ہاتھوں سے جو یہ چاہے کہ پھوٹے اور بہے تو بہہ نہیں سکتا

عبث ہر بار تو آئینہ میرے مُنھ پہ رکھتا ہے میں ہوں حیران تیرا، مجھ کو رشکِ مہ نہیں سکتا

ہزار احسنت[2] تیری طبع کو اے مصحفی، سچ ہے
غزل ان قافیوں میں تجھ سوا کوئی کہہ نہیں سکتا

83

جو تو اے مصحفی راتوں کو اس شدّت سے رووے گا
تو میری جان پھر کیونکے کوئی ہمسایہ سووے گا

1۔ دنی = پست، گھٹیا 2۔ احسنت (عربی) داد کا کلمہ، اچھا کہا

مرے رونے کا عالم دیکھ کے کہتے ہیں یوں مردُم
سرک کر رو یہاں سے، کیا کسی کا گھر ڈبووے گا

جو ناگہ میان سے نکلی وہ تیغِ آب دار اُس کی
تو میں کیا، خضر اپنی زندگی سے ہاتھ دھووے گا

تو اے قاصد مرے دل کو بھی اپنے ساتھ لیتا جا
نہیں تو مفت میں رو رو یہ اپنی جان کھووے گا

خیالِ زلف میں اُس کے نہ قصدِ گریہ کر اے دِل
اندھیری رات میں تو کس طرح موتی پرووے گا

نہ جاوے گا یہ تیرا داغِ احساں روزِ محشر تک
مری تربت پہ تو اے باغباں گر لالہ بووے گا

نہ مرنے پر مر اتنا مصحفی وہ دن بھی آتا ہے
کہ سب ہوویں گے عالم میں اور اک دن تو نہ ہووے گا

84

هوا ہے دشمنِ جاں بسکہ باغباں میرا
چمن میں رہنے نہیں دیتا آشیاں میرا

سبب ملال کا اپنے میں کیا بتاؤں تمھیں
گیا ہے رُوٹھ کئی دن سے مہرباں میرا

گلہ یہ تم سے ہے مجھ کو کہ اس محبت میں
یہ رنگ تم سے ہوا چشمِ خوں فشاں میرا

جو لے چلے ہو مرے دل کو تم، تو رکھیو عزیز
کہ شکلِ قبلہ نما ہے یہ عطر داں میرا

تمام عمر رکھا اس نے مجھ کو چکّر میں
کہاں کا دشمنِ جاں تھا یہ آسماں میرا

چمن میں ہوں میں ولیکن خموش بیٹھا ہوں
کہ اس چمن میں نہیں کوئی ہم زباں میرا

ہوئے ہو کاہے کو تم اپنی جان کے دشمن
نہ اُس کے آگے کرو ذکر دوستاں میرا

پکڑ کے گوشۂ داماں کو اُس کے کھینچ رکھوں
میں خاکِ رہ ہوں، یہ مقدور ہے کہاں میرا

عجب نہیں جو غزل دوسری میں لکھ جاؤں
کہ مصحفی ہے قلم اس گھڑی رواں میرا

85

کسو بھی طرح گذارا نہیں جہاں میرا — ذرا تو دیکھیو اٹکا ہے دل کہاں میرا

میں حسرتیں لیے ازبس جہاں سے جاتا تھا — جنازہ دوش پہ یاروں کے تھا گراں میرا

لپیٹ مُنھ کو، پڑا گھر میں گریہ کرتا ہوں — کہ آشکار نہ ہووے غم نہاں میرا

جگہ سے ہل نہیں سکتا ہے، کیا علاج کروں — برنگِ نقشِ قدم، جسمِ ناتواں میرا

جو کچھ کہوں بھی میں تجھ کو تو تو، برا مت مان — کہ میں تو صاف ہوں، پر دل ہے بدگماں میرا

لگی تھی آگ گلستاں کو، اور مرغِ چمن — کہے تھا یہ کہ جلا آج آشیاں میرا

فراقِ موکراں سے گھٹا ہوں میں یاں تک — کہ شکلِ نالِ قلم[1] ہے ہر استخواں میرا

تری گلی میں مجھے قتل اگر کریں دشمن — عجب نہیں جو نہ ہو واں سے خوں رواں میرا

ترے کہے سے چلا میں تو، پر تُو ڈھب پا کر[2] — سلام تو اُسے کہہ دیجو پاسباں میرا

کل اس کی بزم میں مذکور شعر ہوتا تھا ق کچھ اس میں آ جو گیا ذکر درمیاں میرا

لگا یہ کہنے کہ ہاں مصحفی کو لاؤ شتاب
کہ ایک عمر سے ہے وہ تو مدح خواں میرا

86

زلفیں دکھا کے اُس نے عالم کو مار ڈالا — کس روز تیغ کھینچی، کب نیمچہ سنبھالا

ہیں کیا مناسب اعضا، گویا کہ اپنے ہاتھوں — صنعت گر ازل نے سانچے میں اُس کو ڈھالا

1۔ نالِ قلم = نرکل کے قلم جو قدیم زمانے میں استعمال ہوتے تھے اُن کے اندر باریک ڈورا نکلتا تھا۔

2۔ ڈھب پا کر = موقع مناسب دیکھ کر

زلفوں کے حلقے خالی کیوں کر نہ ہوں کہ اب ہے گرداوری[1] میں دل کی کانوں کا اُس کے بالا

دیکھا ہے میں نے کس کو مہندی کے ہاتھ دھوتے جو چشم سے بہے ہے میری لہو کا نالا

واللہ گل فروشی وہ اپنی بھول جاوے سینے کے داغ میرے جو دیکھے پھول والا

میرا مزار تھا واں، تم یاد رکھیو اُس نے رستے میں چلتے چلتے دامن جہاں سنبھالا

ہر اک ورق پہ اُس کے تصویر حسن کی ہے
دیوان مصحفی بھی گویا ہے راگ مالا[2]

87

بلبلِ خوش صفیر ہوں گلشنِ روزگار کا کچھ میں نشید خواں نہیں، زمزمۂ بہار کا

وعدہ کیا جو تو نے شب، ملنے کا اپنے وقتِ صبح وعدے پہ تیرے دل جلا، صبح تک انتظار کا

سلسلہ اک نظر پڑا موجِ ہوا کے پانو میں پیچ جو کُھل گیا کبھی، سنبلِ تابدار کا

ہوں تو غبار راہ میں، لیک بہ وقتِ سرکشی اوجِ ہوا پہ پھیلنا دیکھ مرے غبار کا

لالہ کا تختہ ایک جا، دیویں گے ہم تجھے دکھا پردہ اگر الٹ گیا سینۂ داغ دار کا

ہوں وہ بخوں تپیدہ صید، جس کی زباں سے وقتِ ذبح شکر ادا نہ ہو سکا خنجرِ آب دار کا

اب تو پیالہ ہاتھ سے رکھ کہیں اے گل ایک دم رنگ معصفری[3] ہوا، نرگسِ پُرخمار کا

دیتا ہے بوسہ تو میاں دے بھی، وگرنہ میں کہاں آج لبوں سے وعدہ ہے، جانِ امیدوار کا

لالہ ہوا بروے خاک، رنگِ شفق برآسماں خون کہاں کہاں گرا، زخمِ دلِ فگار کا

سروقدوں کے پانو کی یوہیں لگیں جو ٹھوکریں خاک رہے گا مجتمع ڈھیر مرے مزار کا

تیغ لیے کھڑے ہو کیوں، ہاتھ میں اب میاں علم[4]
کام تو ہو چکا تمام مصحفی نزار کا

1۔ گرداوری۔ جمع کرنا، اکٹھا کرنا۔ گرداور تحصیل کا ایک عہدہ بھی ہوتا تھا۔ 2۔ راگ مالا = فن موسیقی کی باتصویر کتاب۔ 3۔ معصفری۔ ہارسنگھار کے پھولوں کا رنگ، گہرا سرخ۔ 4۔ عَلم۔ اوپر اُٹھائے ہوئے۔

88

ٹھکانا اک جگہ ہوتا نہیں اِس غم کے مارے کا		یہ گردش طالعوں کی، پھیر ہے گویا ستارے کا
خدا جانے پڑی ہے آنکھ واں کس بے محابا[1] کی		کئی دن سے جو روزن بند ہے اُس کے نظارے کا
دل اپنا اک نگاہِ ناز پر ہم تم کو دیتے ہیں		نہ چوکو لے چلو اس کو، کہ یہ سودا ہے وارے[2] کا
کہو ہو یک نگہ تم قیمتِ جان و دل و دیدہ		نہیں میں نے سنا ایسا کہیں سودا اجارے[3] کا
شبِ مہتاب میں جمنا کی لہروں کا سماں یوں تھا		کہ جیسے موج زن پیشِ نظر دریا ہو پارے کا
فراقِ دہلی سے روتا ہوں میں جب یاد آتا ہے		وہ پھرنا آب[4] جو کا، اور وہ عالم ہزارے[5] کا

غلط ہے عاشقی سے مصحفی کو متہم کرنا
نہیں مذکور ان باتوں میں ہرگز اُس بچارے کا

89

دامن اُس شوخ نے کھینچا جو جھٹک کر اپنا		پھاڑ ڈالا میں گریبان سراسر اپنا
جو کوئی آوے ہے ملنے کو، وہ پھر جاتا ہے[6]		سچ تو یہ ہے کہ نہیں وقت مقرر اپنا
آرزو میں ترے آنے کی ہم اے وعدہ خلاف		صبح تک بند نہیں کرتے کبھو در اپنا
مثل سائے کے میں پیچھے پھرا اس کے، جس نے		اپنے سائے کو دکھایا نہ کبھی گھر اپنا
باغ میں دیکھ خرامش کی ترے رنگینی		فرش کرتا ہے میاں مور بھی شہپر اپنا
خونِ بسمل سے ہے اِس ساعدِ نازک کی بہار		تم نے کیوں پھینک دیا ہاتھ سے خنجر اپنا
تیرے کوچے میں اُسے ہم تو نہ جانے دیویں		زور چلتا نہیں افسوس کہ دل پر اپنا
دوست رکھتی ہے جریدہ[7] کے تئیں راہِ عدم		چھوڑ جاتے ہیں شہاں تب تو یہ لشکر اپنا

1۔ بے محابا= بے جھجک 2۔ وارے کا = سستا 3۔ اِجارے کا= تھوک کا بھاؤ
4۔ یعنی نہر کی سیر کرنا 5۔ ہزارہ= منڈی جہاں ہر مال دستیاب ہو
6۔ پھر جاتا ہے = واپس ہو جاتا ہے، لوٹ جاتا ہے 7۔ جریدہ = تنہا، اکیلا

مصحفی گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے و لے
ذکر آجائے ہے اُس بزم میں اکثر اپنا

90

ہے آنسوؤں سے غوغا اِن پر کبوتروں کا — مژگاں ہیں یہ کہ یارب ٹھاٹھر[1] کبوتروں کا
صیاد کی گلی ہے، وہ کوچہ کیا کہ جس میں — سرخاک پر پڑا ہے اکثر کبوتروں کا
جو ہیں فرشتہ طینت، عالی مقام ہیں وہ — بامِ حرم پہ دیکھا میں گھر کبوتروں کا
اہلِ دول کی خاطر یہ مشغلے ہیں سارے — کرتے ہیں شوق ناحق، بے زر کبوتروں کا
اک غول ہے اِدھر کو بامِ ہوا پہ رقصاں — اک ساتھ اُڑ رہا ہے اُودھر کبوتروں کا
ہے صید[2] میری اس کی، انجام دیکھیں کیا ہو — اُمڈا ہے دو طرف سے لشکر کبوتروں کا
جانا گلی میں اس کی، عاشق کا نامہ لے کر، — یہ کام ہے عزیزاں، بے سر کبوتروں کا

اک پر بھی اُس گلی سے اے مصحفی نہ آیا
ناحق کو خوں لیا میں سر پر کبوتروں کا

91

اشکوں سے میرے لختِ جگر دور رہ گیا — اِس قافلے کے پیچھے یہ رنجور رہ گیا
آئے نہ تم کرم سے کبھی گھر مرے میاں — شکوہ یہ تم سے تا بہ لب، گور رہ گیا
میں جو کہا کہ بل بے تری زلف کی اکڑ — غصّے سے کچھ وہ میری طرف گھور رہ گیا
گردن تک آکے پھر گئی کل اُس کی آبِ تیغ — پیمانہ ہوکے عمر کا معمور رہ گیا
میں نے کہا تھا: اب مجھے مقدور صبر ہے — بولا یہ اک ادا سے، کہ مقدور رہ گیا
تقصیر کم نگاہیِ ساقی ہے، اور کیا — اس انجمن میں گر کوئی مخمور رہ گیا

1۔ ٹھاٹھر = کبوتروں کے لیے بنایا ہوا بانس کا اونچا مچان۔
2۔ صید ہونا = کبوتر بازوں کی اصطلاح ہے۔ جن دو فریقوں میں صید ہوتی تھی اُن کا کبوتر اگر دوسرے کے پاس چلا جائے تو واپس نہیں کرتے تھے۔

کیا کیا نہ دوستوں کے بھرے زخمِ جاں ستاں
اک داغِ دل مرا ہے کہ ناسور رہ گیا

حاتم رہا نہ رستم دستاں جہاں کے بیچ
ہمّت کا اُن کی خلق میں مذکور رہ گیا

جب اس میں خوں رہا نہ، تو یہ دل کا آبلہ
ہو خشک جیسے دانۂ انگور رہ گیا

کرتا ہے کوئی اتنا تغافل، خدا سے ڈر
مرنے میں میرے کیا بتِ مغرور رہ گیا

دنیائے دُوں نہ جائے اقامت ہے مصحفی
آیا جو اس سرا میں بدستور رہ گیا

92

غیر کے گھر میں یار رہنے لگا
ہم کو پھر انتظار رہنے لگا

پھر ہوئی تم کو اپنے حسن کی چاہ
آئینہ پھر دوچار رہنے لگا

کیا کسی سے کیا قرار اُس نے
دل جو یاں بے قرار رہنے لگا

پھر وہ بُت صاحبِ ارادہ ہوا ق پھر کمر میں کٹار رہنے لگا

مصحفی، یعنی میری جانب سے
اُس کے دل میں غبار رہنے لگا

93

پہلو سے اُٹھ کے شب جو وہ آرامِ جاں گیا
بے اختیار نالہ سوے آسماں گیا

کنجِ قفس میں لطف ملا جس کو، وہ اسیر
چھوٹا بھی گر، تو پھر نہ سوے آشیاں گیا

اُٹھنے کا قصد شب جو کیا اُس نے بزم سے
وو ہیں ہزار جا یہ دلِ بدگماں گیا

تکلیفِ سیرِ باغ نہ دے ہم کو ہم صفیر
مُدّت ہوئی کہ دل سے وہ شوقِ فغاں گیا

یارانِ رفتہ ہم سے مُنھ ایسا چھپا گئے
معلوم بھی ہوا نہ کدھر کارواں گیا

باہم جنھوں میں مہر و مروّت کی رسم تھی
وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانہ کہاں گیا

کیا جانتا تھا میں کہ نہ دیوے گا مصحفی
کیسا سوالِ بوسہ مرا رایگاں گیا

94

اک حرفِ کُن میں جس نے کون ومکاں بنایا
سارے جہاں کا تجھ کو آرامِ جاں بنایا

بوے محبت اپنی رکھی خدا نے اس میں
سینے میں آدمی کے دل عطرداں بنایا

اپنی تو اس چمن میں نت عمریوں ہی گذری
یاں آشیاں بنایا، واں آشیاں بنایا

محنت پہ ٹک نظر کر، صورت گر ازل نے
چالیس دن میں تیرا میم[1] وہاں بنایا

ازبسکہ اس سفر میں منزل کو ہم نہ پہنچے
آوارگی نے ہم کو ریگِ رواں بنایا

مغرور کیوں نہ ہووے صنعت پر اپنی صانع
ق
کس واسطے، جب اس نے یہ گلستاں بنایا

خونِ جگر سے میرے، گُل کی شبیہ کھینچی
نالے کو میرے لے کر سروِ رواں بنایا

آتا ہے مصحفی تو، یہ کس کے زخم کھائے
ق
تیرِ جفا کا کس نے تجھ کو نشاں بنایا

سو ٹکڑے ہے گریباں، دامن لہو میں تر ہے
یہ رنگ تونے ظالم اپنا کہاں بنایا

95

دل گرا، یا جگر اِس دیدۂ گریاں سے چُوا
نہیں معلوم کہ شب کیا مری مژگاں سے چوا

اس نے تیر اپنا جو کھینچا مرے پہلو سے بزور
خون تا دیر زمیں پر دلِ پیکاں سے چوا

دیکھ کر رنگِ حنا ہاتھ پہ تیرے قاتل
رشک کے مارے لہو پنجۂ مژگاں سے چوا

اس قدر تشنۂ خوں تھا کہ دم ذبح مرے
ایک قطرہ بھی نہ اس خنجرِ بُراں سے چوا

ہم نے ہشیاری سے ہاتھوں پہ لیا اُس کے تئیں
قطرہ مستی میں جو مے کا لب جاناں سے چوا

کیا گریبان کی پوچھو ہو کہ ہم شب اُس بن
اس قدر روئے کہ خوں گوشۂ داماں سے چوا

1۔ دہن کو میم سے تشبیہ دیے ہیں اور حرفِ میم کے عدد چالیس ہوتے ہیں!

تربتِ قیس پہ اک دن جو ہوا ان کا گذر　　اس قدر روئے کہ خوں چشمِ غزالاں سے چوا
آگ دی دل کو محبت نے تو گُل[1] ریز کی طرح　　اشک کے ساتھ ہی اک شعلہ بھی مژگاں سے چوا
مصحفی میں نے یہ جانا کہ ستارے ٹوٹے
جب عرق یار کے روے عرق افشاں سے چوا

ب

96

دنیا سے اپنے بار کو لدوایئے شتاب　　سازِ سفر بہم ہو تو اُٹھ جایئے شتاب
ہونٹوں پہ آ رہی ہے یہ جاں اضطراب میں　　آنا ہے آپ کو، تو کہیں آیئے شتاب
شب تھوڑی رہ گئی ہے، یہ منزل ہے پُر خطر　　بارے کجاوے اونٹوں کے کسوایئے شتاب
پڑنے لگی ہیں پھر تری آنکھیں ادھر اُدھر　　یہ طور ہے بُرا، اِنھیں سمجھایئے شتاب
دل دے کے آپ کو میں کہاں تک کھڑا رہوں　　قیمت جو کچھ کہ دینی ہو، فرمایئے شتاب
ایسا نہ ہو کہ یارو دل آوے کہیں نکل　　سینے کا زخم ہے، اسے سلوایئے شتاب
مل جائے روزِ عید تو واللہ دوڑ کر　　اب کی گلے سے اُس کے لپٹ جایئے شتاب
بیٹھے ہیں ہم بھی آپ کے یاں انتظار میں　　تشریف اِس طرف بھی کہیں لایئے شتاب
تا دیر کیوں زمیں پہ رہے خون مصحفی
اچھا نہیں، اسے کہیں گڑوایئے شتاب

97

شاید کسو نے پھر اُسے برہم کیا ہے اب　　ملنا جو اُس نے ہم سے بہت کم کیا ہے اب
یوں سر کے بال اُس کے پریشان ہیں تمام　　گویا کسی کے مرنے کا ماتم کیا ہے اب
رہ اے مسیح، اِس کی تو پھر کیجیو دوا　　میں نے علاجِ دیدۂ پُرنم کیا ہے اب

1۔ گلریز = پھول جھڑی (آتشبازی)

رکھنا عصا کا شیخ جی تم کو ضرور ہے پیری نے قد تمھارا بہت خم کیا ہے اب
وہ بند و بست اُس کا جو آگے تھا، اُٹھ گیا جس تس کو بزمِ وصل کا محرم کیا ہے اب
آتش کدوں کو آہ مری سرد کر چکی بل بے گھمنڈ، قصدِ جہنّم کیا ہے اب
سو غم تھے، جب تلک کہ نہ تھا وعدہ درمیاں امیدِ وصل نے مجھے بے غم کیا ہے اب
آدے وہ دم میں کیونکے کسی کے کہ اِن دنوں واں خصم نے کچھ اور فسوں دم کیا ہے اب
ہے مصحفی غریب تو کس کے شمار میں
تسخیر اُس کی زلف نے عالم کیا ہے اب

98

ہم کو دینے لگے تم چھیڑ کے گالی کیا خوب آپ نے ہم سے بھی یہ چھیڑ نکالی کیا خوب
کیوں نہ سو جان سے صدقے ہوں ترے صانع نے طرح ترکیب تری سانچے میں ڈھالی کیا خوب
بارے اب تم بھی لگے خونِ غریباں کرنے ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی کیا خوب
تم نے حسن اپنے کو دو چند کیا نام خدا موتیوں کی بھی لڑی کان میں ڈالی کیا خوب
جب کہ تو اس میں سے جھانکے ہے، ستاروں کی طرح جگمگاتی ہے ترے غرفے کی جالی کیا خوب
کیجیو ساعدِ[1] گُل خوردہ پہ میرے بھی نگاہ ہاتھ آئی ہے مرے پھولوں کی ڈالی کیا خوب
آرسی لے کے ذرا تو بھی تو دیکھ اپنے لب مسّی پر کھلتی ہے یہ پانوں کی لالی کیا خوب
مصحفی واہ، غزالانِ معانی کے تئیں
صید کرتی ہے تری ہمّتِ عالی کیا خوب

99

بام تک اُس کے جو ہوتا گذرِ نالۂ شب کچھ نہ کچھ ہم کو بھی آتی خبرِ نالۂ شب

1۔ ساعدِ گل خوردہ، کلائی جس پر گُل چھلّے بنے ہوں، محبت کی نشانی کے طور پر کلائی داغنے کا عشاق میں رواج تھا اسی کو اردو میں ''گُل چھلّے اُڑانا'' (یعنی عیش و مستی کرنا) کہا گیا ہے۔

مر گئے ہم تو دلا نالے ہی کرتے کرتے
ہم نے اک روز نہ دیکھا اثرِ نالۂ شب

نالہ پرواز میں آتا ہے دعا سے، یعنی
ہیں مرے دستِ دعا بال و پر نالۂ شب

لے اُڑا نالہ مرا مجھ کو فلک پر گویا
تھی مرے ہاتھ میں محکم کمرِ نالۂ شب

اس کو آسان نہیں آگ پہ رکھنا ظالم
پر کبوتر کا نہ ہووے یہ پرِ نالۂ شب

راہ نالے کی، رفاقت سے تری کٹ جاوے
تو بھی اے آہ جو ہو ہم سفرِ نالۂ شب

تو بھی آوے جو تماشے کو تو مانند انار[1]
پھول رکھتا ہے ہزاروں شجرِ نالۂ شب

نالۂ شعلہ فشاں دل سے نہ نکلا ورنہ
تجھ کو اے آہ دکھاتے ہُنرِ نالۂ شب

صورتِ تودۂ باروت ہے گردوں، اس میں
ہو تماشا جو پڑے ٹک شررِ نالۂ شب

آگ نکلے ہے جو نالوں سے مرے، رہتا ہے
میرے ہمسایوں کو ہر شب خطرِ نالۂ شب

صبح دم لختِ جگر کیوں مری پلکوں سے گرے
مصحفی میں نے یہ پایا ثمرِ نالۂ شب

100

کیوں نکلتا سوتے سوتے مُنھ سے اپنے: یا نصیب
جاگنا راتوں کا ہم کو بھی اگر ہوتا نصیب

جن کی ہے معشوقۂ دنیا بغل میں رات دن
سچ اگر پوچھو تو ہاں وے لوگ ہی ہیں با نصیب

دیکھ کر مجنوں کے طالع کو منجم نے کہا
بعد مکتب ہووے گا اس طفل کا صحرا نصیب

کون مانے ہے بُرا خوباں کے نکتوڑوں[2] سے ہائے
ہووے یا رب مجھ کو ان لوگوں کا نکتوڑا نصیب

ٹوٹے پیالے میں بھی جو دیتا نہیں ساقی شراب
پھوٹ گئے ہیں ایسے میرے یا الٰہی کیا نصیب

قسمت اپنی میں تو، فردائے قیامت پر ہے صرف
بخت اُن کے ہیں جنھیں ہے وعدۂ فردا نصیب

خوش نصیبی کا ہماری جس جگہ مذکور ہے
اس جگہ قسمت کہاں کی اور میاں کس کا نصیب

1۔ یہاں انار سے مراد وہ آتش بازی ہے جو خوشی کے موقع پر چھوڑی جاتی ہے۔ آتش بازی کے انار سے ایک آتشیں درخت سا پیدا ہوتا ہے اور اس سے پھول جھڑتے ہیں۔ 2۔ نکتوڑے = نخرے

جن دنوں تھوڑی سی قسمت اپنی تھی اُس کی شریک
ہم کو تھا اس بزم میں تہ جُرعۂ صہبا[1] نصیب

دین و دُنیا سے ہمیں کیا کام ہے اے مصحفی
ہیں جو طالب، اُن کو ہووے دین اور دُنیا نصیب

101

باتیں بنا کے مجھ کو شیدانہ کیجے صاحب
رسوا کو بس زیادہ رسوانہ کیجے صاحب

گو تیرہ بخت ہوں میں، پر میری یہ خوشی ہے
ایک اونگلی مسی کا صرفہ نہ کیجے صاحب

مجلس میں مدّعی کی بن ٹھن کے جائیے، لیک
جا کر کے دیر تک واں بیٹھا نہ کیجے صاحب

کیا مجھ میں اور تم میں اب کچھ دوئی رہی ہے
جو کیجے اس کا مجھ سے پردانہ کیجے صاحب

کیجیے نظر کرم کی، ایک ناتواں پر اپنے
گر اس میں بھی زیاں ہو اچھا نہ کیجے صاحب

طرز خرام اپنی ہر ایک کو دکھا کر
کوچہ گلی میں فتنہ برپا نہ کیجے صاحب

آتا ہے رشک مجھ کو، مُنھ اپنا آرسی میں
حیرت بھری نگہ سے دیکھا نہ کیجے صاحب

جاتا ہوں دم بدم تو جھنجھلا کے بولتا ہے
اتنا بھی میرے گھر میں آیا نہ کیجے صاحب

جو میں کہوں ہوں: "میری تقصیر؟" تو کہے ہے:
"بس بس سر کیے مجھ کو رسوانہ کیجے صاحب"

میاں مصحفی کہا میں، یہ بات حد بُری ہے
ہر اک سے راز دل کا افشا نہ کیجیے صاحب

102

کس دن گلی سے اُس کی پھرا نامہ بر شتاب
کب خوش ہوا میں؟ اور کب آئی خبر شتاب

اب دیر چاہیے ہے اِسے جاتے تا فلک
وے دن گئے کہ نالہ کرے تھا اثر شتاب

کھینچی نہ دیر فصل گل آنے تلک دریغ
اب کی برس میں، اپنے جھڑے بال و پر شتاب

ایسا نہ ہو کہ آتش دل سینہ پھونک دے
مشکیزہ لے کے پہنچیو اے چشمِ تر شتاب

1۔ تہ جُرعہ = تل چھٹ، دُردِ تہِ جام

کیا امتحاں کرے ہے تو اے داغ غم کہ یاں　　جلنے کے داعیہ پہ ہے دل سے جگر شتاب
اِن پردہ داریوں کے تصدّق کسی کی جان　　خواہش جو دیکھنا، تو چرانا نظر شتاب
رہنے کا لطف اب نہیں یاں خاک مصحفی
اس منزلِ خراب سے کیجے سفر شتاب

103

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب　　کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب
یوں آنکھیں لڑا جس سے کہ تو چاہے ولیکن　　آگے مرے، ہر اک سے اشارات نہیں خوب
کیا جانیے کیا سمجھے کوئی ملنے کو صاحب　　اتنی بھی تو بندے پہ عنایات نہیں خوب
مت پانو رکھ اے لختِ جگر دیدۂ تر میں　　کہتے ہیں سفر موسمِ برسات نہیں خوب
کس سے کہوں ایاّم کی اپنے میں زبونی　　گر سوچ کے دیکھوں ہوں تو دن رات نہیں خوب
آخر کو خطا پاؤ گے تم، حق میں تمھارے　　کرتے ہو جو لُچّوں[1] کی مدارات، نہیں خوب
کیوں خوار پھرا کرتے ہو تم اُس کی گلی میں
میاں مصحفی جانے دو، یہ اوقات نہیں خوب

104

دن کو تو نہیں کوئی ملاقات کی تقریب　　منظور ہو ملنا، تو ہے اِک رات کی تقریب
اشکوں کے تئیں خوشۂ انگور بنا کر　　ہم بھیجتے، سو واں نہیں سوغات کی تقریب
اے ابرِ کرم کیا ہو، جو تو گھر میں ہمارے　　رہ جائے کبھو آن کے برسات کی تقریب
اک شب مرے گھر یار کا آیا جو تصوّر　　جاں نذر کی اُس کی، میں مدارت کی تقریب
گالی بھی اگر دیجیے تو مانیں نہ بُرا ہم　　پر جان مری ہو جو عنایات کی تقریب
واں کیونکے اشاروں میں کہوں حالِ دل اپنا　　جس جا کہ نہ ہو دور سے اِک بات کی تقریب

1۔ لُچّوں کا لفظ مصحفی کے سوا شاید کسی دوسرے شاعر نے استعمال نہیں کیا۔

سن سن کے مرے ذکر کو کہتا ہے وہ کافر ہر ایک کرے ہے اُسی بدذات کی تقریب

اے مصحفی سو آنکھیں لگیں دیکھنے، اس سے
نکلی جو کبھی حرف و حکایات کی تقریب

105

جی چلے تیرا تو لے چکھ تو بھی، اے مستِ شراب
ہیں مرے لختِ جگر، مژگاں پہ تکّوں کے کباب[1]

یوں ہے اُس گورے بدن سے جلوہ گر لوہو کا رنگ
دستِ قدرت نے ملایا جیسے مَیدے میں شہاب

بیچ دریا کے پڑا ہے کس مہِ تاباں کا عکس
شمع سے خالی نہیں جو ایک فانوسِ حباب

بال بکھرے گورے مُنھ پر، جیسے سورج کی کرن
زلف کے حلقوں میں عارض، سُنبلے[2] میں آفتاب

ہائے کیا کیا صحبتیں رہتی تھیں معشوقوں کے ساتھ
کس قدر حسرت فزا ہے، یادِ ایّامِ شباب

میں تو کل غش کر گیا تھا دیکھ کر اُس گل کا رنگ
اشک نے بارے، مرے مُنھ پر ذرا چھڑکا گلاب

ایک دن مرنے کے آگے ہم نے دل اس کو دیا
جوں مسافر وقت چلنے کے کرے ہے پا تُراب[3]

سر پٹکنا، گریہ کرنا، ہاتھ دے دے مارنا
ہم نے بھی دیکھے ہیں کیا کیا، ہجر کی شب کے عذاب

1۔ تکّوں کے کباب= بوٹی کباب 2۔ سنبلہ ایک برج کا نام جسے انگریزی میں Virgo کہتے ہیں
3۔ پاتراب = یہ غالباً سفر پر جانے سے پہلے کی کوئی رسم ہے

گرچہ تو پاکیزہ گو ہے سر بسر، پر مصحفی
یہ غزل ہم نے ترے دیواں سے کی ہے انتخاب

106

یہ حالت ہے کہ دل سینے میں گھبراتا ہے، بے موجب
طبیعت پر تکدّر اپنی آجاتا ہے بے موجب

نہ میں اُس کی طرف دیکھوں ہوں، نے کچھ مُنھ سے کہتا ہوں
مگر محبوب میرا، مجھ سے شرماتا ہے بے موجب

مری مجلس میں گر وہ آکے بیٹھے ہے، تو پھر وو ہیں
یکا یک بیٹھے بیٹھے ہنس کے اُٹھ جاتا ہے بے موجب

نہیں تقصیر کچھ ثابت مری اے یارو، وہ بانکا
سپر تلوار لے کر مجھ کو دھمکاتا ہے بے موجب

جو ہوتا ہوں میں حاضر، اُس کی عیّاری تو تم دیکھو
بہ رغمِ غیر مجھ کو کام فرماتا ہے بے موجب

نہ خواہش ہے اُدھر سے، نے اِدھر سے کچھ تقاضا ہے
نہیں معلوم کافر، دل کو کیوں بھاتا ہے بے موجب

نہیں اے مصحفی گر مجھ سے لاگ اس کے تصوّر کو
تو وہ راتوں کو میرے پاس کیوں آتا ہے بے موجب

107

دلِ دیوانہ اُس کی گالیاں کھاتا ہے بے موجب
جو اُس کے منھ میں آتا ہے سو کہہ جاتا ہے بے موجب

گلی میں اُس کی جاتا ہوں تو یوں لوگوں سے کہتا ہے:
ہوا ہے اِس کو کیا، یہ کیوں یہاں آتا ہے بے موجب

نہ روزوں کا مہینا ہے، نہ یہ ماہِ محرّم[1] ہے
ہمیں وہ طفلِ بدخو تیغ دکھلاتا ہے بے موجب

جو ہم اک بات کہتے ہیں، تو وو ہیں درجواب اُس کے
ہمارے سر پہ سو سو بات ٹھہراتا ہے بے موجب

میں آخر اُس گلی سے اُٹھ گیا، وہ اُٹھ کے جاتا ہے
کسو سے گر کوئی اے یار دکھ پاتا ہے بے موجب

کوئی کیا مصحفی سے دردِ دل کا ماجرا پوچھے
کہ آنکھوں میں یہ آنسو اپنی بھر لاتا ہے بے موجب

پ

108

کِھل کِھلا کر نہ ہنسا کیجیے آپ ایسی باتوں سے حیا کیجیے آپ

تم سے ہرگز نہیں کچھ کام ہمیں لاکھ پردے میں چھپا کیجیے آپ

کوئی ہو کیونکے تمھارا شاکر نہ مروّت نہ وفا کیجیے آپ

دردِ سر ہووے ہے گر تیرے تئیں سرکہ صندل نہ ملا کیجیے آپ

"چال یہ حق میں تمھارے نہیں خوب ق ہر کسی سے نہ ملا کیجیے آپ"

میں تو کہنے کو تمھارے مانا اتنا میرا بھی کہا کیجیے آپ

کیوں میاں مصحفی جاں دیتے ہو
درد اپنے کی دوا کیجیے آپ

1۔ رمضان اور محرم کے مہینوں میں نیا چاند دیکھ کر تلوار دیکھی جاتی تھی۔ یہ ایک شگون تھا

ت

109

البتہ فنِ عشق میں ہو جس کو مہارت سمجھے وہ مرے نامۂ پُرخوں کی عبارت
رستوں میں زن و مرد کے ستھراؤ پڑے ہیں اک شہر کیا ہے تری رفتار نے غارت
قاتل، تو وضو کر کے، مرے تیغ لگانا قربانی کو کہتے ہیں کہ ہے شرطِ طہارت
آنکھوں کا میں کس شوخ کی کشتہ ہوں جواب تک کرتے ہیں غزالاں مری تربت کی زیارت
کیا پوچھتے ہو حادثۂ حضرتِ دہلی واں خاک برابر ہوئیں کیا کیا نہ عمارت
کیا جانے وہ کیا لائے ستم سر پہ ہمارے سونپی ہے شہِ حسن نے غمزے کو نظارت
جب مصحفیِ خستہ لگا جان کو دینے
مرتے ہوئے کی اُس نے طرف دل کے اشارت

110

ہر چند اس نے میری طرف سے بنائی بات قاصد کو اُس کے سامنے پر کہہ نہ آئی بات
اُس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات غنچے نے مسکرا کے کہا: 'ہم نے پائی بات!'
نزدیک اس کے، وقتِ جفا و ستم گری خنجر زنی ہے حرف، تو تیغ آزمائی بات
کہتا تھا یہ کہ دل نہ کسی سے لگایئے اک قصہ خواں کی رات مجھے کیا خوش آئی بات
آنے کی تیرے کہہ کے مرا دل تو خوش کیا قاصد نے گو کہ اپنی طرف سے بنائی بات
آگے کسی کے بات نہ کہیے کہ ہے مثل ہو جاتی ہے نکلتے ہی مُنھ سے پرائی بات
آہ و فغاں سنے ہے مری، آ کے در پہ روز پر اپنے مُنھ کی اُس نے نہ ہم کو سنائی بات
مانگا جو میں نے بوسہ تو آنکھیں جھکا دیاں اس ڈھب مری زمین پہ اس نے گرائی بات
وہ مجھ سے اِن دنوں میں جو کچھ بولتا نہیں شاید کسو نے جا کے اُسے کچھ لگائی بات

رتبے کو میرے پہنچے ہے کب کوئی مصحفی
روح القدس کہے ہے مجھے: "سن تو بھائی بات!"

111

خدا نے حور و پری کو کب ایسی دی صورت — تری سی پائی کہاں حور اور پری صورت
ہے جس کے شورِ ملاحت کا لیلیٰ اک شمّہ — سمائی ہے مرے دل میں وہ سانوری صورت
عبث بلاتے ہو تم، مجھ کو کب گوارا ہے — کہ صبح آ کے میں دیکھوں مَلی دَلی صورت
زمانہ خط کا ہے، اب وہ بہارِ ناز کہاں — کسی زمانے میں اُس گل کی یار و تھی صورت
وہ مجھ کو دیکھے ہے، میں اس کو دیکھا کرتا ہوں — ہے میری اُس کی یہ اب اختلاط کی صورت
سجا نہیں یہ بتاں تم نے سر پہ اک پیچا — پکڑ کے آئی ہے طرزِ ستم گری صورت
تری تو بزم میں ہے، ازدحامِ خلق چلا — کہاں تلک کوئی دیکھے بُری بھلی صورت
تمھاری سحر نگاہی ہے اور عالم، لیک — اس آئینے کی بھی رکھتی ہے رفتگی صورت
وہ دن بھی کیا تھے کہ جا کر کے دیکھ آتا تھا — میں اپنی آنکھوں سے اُس کی کبھی کبھی صورت

کرے ہے عشق کا دعویٰ میاں اسی مُنھ سے
ٹک آئینے میں تو دیکھ اپنی مصحفی صورت

112

منعم تو ہو رہا ہے گرفتارِ سنگ و خشت — کعبے کو جائے کیونکے یہ معمارِ سنگ و خشت
میرے جنوں کے عہد میں لڑکوں کے ہاتھ سے — ثابت رہا زمیں پہ نہ آثارِ سنگ و خشت
دلّی سے پختہ محلوں کے وارث کدھر گئے — اب تک ڈھی پڑی ہیں جو دیوارِ سنگ و خشت
لعل و گہر کی قدر کو کیا جانتے ہیں وہ — بھر عمر جو رہے ہیں خریدارِ سنگ و خشت
لڑکوں کی خالی اب نظر آتی ہیں جھولیاں — بس ہم تلک تھی گرمیِ بازارِ سنگ و خشت
پکّی عبث بناتے ہو زاہد کی قبر کو — یارو کب اس گدھے سے اُٹھا بارِ سنگ و خشت

شورِ جنوں یہی ہے تو دیکھو گے شہر میں　　　لڑکے پھریں گے ڈھونڈتے انبارِ سنگ وخشت

جو دیکھتا ہے سینۂ مجروح کو مرے　　　کہتا ہے: ہے یہ سینہ تو افگارِ سنگ وخشت

رکھ اک غزل کی اور بِنا، گو کہ مصحفی

ہے دامن اس زمیں کا تہِ بارِ سنگ وخشت

113

ہرگز کھلا نہ شیخ پہ اسرار سنگ وخشت　　　کعبے میں وہ رہا، پسِ دیوارِ سنگ وخشت

پھڑیاں[1] نہ پتھروں کی، پڑاووں[2] کے ہیں نہ ڈھیر　　　کچھ ان دنوں تو سرد ہے بازارِ سنگ وخشت

پکّی عمارتوں کا جنھیں شوق تھا کبھی　　　اب وہ دبے پڑے ہیں تہِ بارِ سنگ وخشت

رستے کے بیچ پھینکیں ہیں بھر بھر کے مشت خاک　　　طفلانِ شہر مجھ کو سمجھ عار سنگ و خشت

سختی سے اب زمانے کی، پتھر تلے ہے ہاتھ　　　اُن کا جو تھے ہمیشہ خریدارِ سنگ وخشت

جاوے کدھر نکل کے، کہ طفلانِ حی[3] نے آج　　　مجنوں کو کر رکھا ہے گرفتارِ سنگ وخشت

دلّی کی وہ عمارتیں آتی ہیں جب کہ یاد　　　مرتے ہیں ہم بہ حسرت دیدارِ سنگ وخشت

محلوں کی واں کے کیا میں کہوں خوب صورتی　　　دیکھا نہ اس طرح کا کہیں کارِ سنگ وخشت

شورِ جنوں نہ اِس سے گیا ہائے مصحفی

یہ سر رہا ہمیشہ طلب گارِ سنگ و خشت

114

خواب میں آئے ہے جب اس کی میاں آدھی رات　　　سوتے سوتے میں کر اُٹھتا ہوں فغاں آدھی رات

مانگ کی راہ میں ششدر سا کھڑا ہوں کب کا　　　نابلد ہوں میں، بھلا جاؤں کہاں آدھی رات

ہے مہِ نیم شبی چہرۂ نورانی یار　　　اور دو زلفوں سے ہوتی ہے عیاں آدھی رات

ہیں جو آگاہ دل، اُن لوگوں کی سوتے سوتے　　　آنکھ کھل جاتی ہے، بجتی ہے[4] جہاں آدھی رات

1۔ پھڑیاں (پھڑ) جہاں بہت سے پتھر جمع ہوں 2۔ پڑاووں (پڑاوہ) یہ اصل میں پزاوہ ہے جہاں اینٹیں پکائی جاتی ہیں 3۔ حَی = محلّہ، علاقہ 4۔ یعنی آدھی رات کا گھنٹہ بجتا ہے

وہی سمجھے گا تری مانگ کا جلوہ جس نے شبِ مہتاب کا دیکھا ہو سماں آدھی رات
ہاتھ جب زلف و رخِ یار پہ جا ہی نہ سکا پھر برابر ہے بہار اور خزاں آدھی رات
مصحفی تھا دلِ بیمار کا احوال بتر
دے کے میں خط کیا قاصد کو رواں آدھی رات

115

اے زبانِ تیشہ کہہ، کچھ کوہ کن کی سرگذشت یعنی آخر کیا ہوئی اُس بے وطن کی سرگذشت
سر سے اک شعلہ لگا ایسا کہ ساری جل گئی کچھ نہ پوچھو ہم سے شمعِ انجمن کی سرگذشت
طشتِ آتش تھا لگن، جب دن کو لائی تھی وہ رات شمع کا قصہ کہوں، میں یا لگن کی سرگذشت
سر پھنسایا جا اُنھوں نے دام میں صیاد کے یہ ہوئی آخر کو مرغانِ چمن کی سرگذشت
مصحفی کہتے ہیں راہ عشق میں مارا پڑا
کون جانے کیا ہوئی اس بے وطن کی سرگذشت

116

میانِ عالمِ مستی اگر ہے سجدہ درست تو پائے خُم ہی پہ یاں بیشتر ہے سجدہ درست
شہیدِ طرزِ جفا دیر و کعبہ کیا جانے جھکے وہ تیغ جدھر کو، اُدھر ہے سجدہ درست
کہے ہے شیشۂ مے یوں ہر اک سے مجلس میں کہ اہلِ درد کو با چشمِ تر ہے سجدہ درست
گرا جو پانو پہ قاتل کے کٹ کے سر میرا کہا یہ اُس نے: اِس انداز پر ہے سجدہ درست
جو بے بصر ہوں اُدھر رُو نہ کیجیے، ورنہ بر آستانۂ اہلِ نظر ہے سجدہ درست
وہ آفتاب جو آوے نکل تو اُس کے حضور خود آفتاب کو وقتِ سحر ہے سجدہ درست
گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ
یہ مصحفی سے نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست

117

گلی میں اُس کی نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست　قدم قدم ہمیں واں خاک پر ہے سجدہ درست
جہاں کہ ہو تری ابرو کی شکل پر محراب　وہاں بہ چشم تر، اہلِ نظر ہے سجدہ درست
نمازِ عشق میں ہرگز نہیں تعیّنِ وقت　فراغ ہووے تو آٹھوں پہر ہے سجدہ درست
نیاز و عجز کو خلوت کی کچھ نہیں حاجت　حرم میں بھی پسِ دیوار و در ہے سجدہ درست
ہر ایک چشم کو مانند مُہرِ بادامی[1]　ہمارے نامے پر اے نامہ بر ہے سجدہ درست

جب آستانۂ دل پر سرِ نیاز رکھا
تو مصحفی تجھے کب در بدر ہے سجدہ درست

118

تھی میرے ہاتھ ہی میں، تمھاری کمر تو رات　کچھ تم میں ہم میں فرق نہ تھا اس قدر تو رات
آیا نہ تو ہی ورنہ ترے انتظار میں　تا وقتِ صبح، باز[2] رہا اپنا در تو رات
کیا کہیے اُس کے دستِ حنائی کی یاد میں　پلکوں پہ آ رہا تھا ہمارا جگر تو رات
آیا تھا بے حواس وہ سر کھولے بام پر　نالے نے میرے اتنا کیا تھا اثر تو رات
ہرجائی میرے، یہ بھی کوئی اختلاط تھا　میں تیری جستجو میں پھرا در بدر تو رات
دامن میں کیو نکے اشک مسلسل نہ اب رہے　پلکوں کے ہاتھ میں تھی یہ سلکِ گہر تو رات
لیتا تھا بے خبر ترے بوسے میں دم بہ دم　اِس بات کی تجھے بھی نہ تھی کچھ خبر تو رات
گر شانہ چیر کر نہ چھڑاوے، تو قہر تھا　باہم لپٹ گئے تھے وہ زلف و کمر تو رات

انگڑائیاں نہ لے، کہیں اب اُٹھ کے گھر کو چل
سنتا ہے مصحفی تو، بجی دوپہر تو رات

1۔ مُہر جو کاغذوں، دستاویزوں پر لگائی جاتی تھی وہ مربع یا بادامی وضع کی ہوتی تھی اُسے مُہر بادامی کہا ہے

2۔ باز رہا = کھلا رہا

119

ہائے اس کے وہ ننھے ننھے ہات — ہائے اُس کی وہ گوری گوری گات

شربتِ وصل جس کو کہتے ہیں — حق میں عاشق کے ہے وہ آبِ حیات

تو تو کیا جانے، بے کسی پہ میری — شمع روتی رہی ہے ساری برات

ہے تجھی تک یہ اشک و آہ اے عشق — ساتھ دولھا کے جس طرح ہو بارات

بسکہ اس قافلے میں ہے شر و شور — نہیں سنتا کوئی کسی کی بات

ہے اجل یوں کمیں میں انساں کی — مُوش پر گُربہ جوں لگائے گھات

قطب صاحب کی، اب کے چھڑیوں میں — ق — اُمنڈ آئی ہے جو سبھی میوات[1]

چھاتیاں دیکھ سادہ وضعوں کی — دلّی کے نوجواں ملیں ہیں ہات

پردگی ہے کوئی تو اس میں بھی — ق — ہے کھنچی یہ جو آسماں کی قنات

یہ تمام اہتمام ہیں اُس کے — دن کہاں کے میاں، کہاں کی رات

مجھے وہ ماہِ خانگی نہ ملا — گئی اَب کے بھی یوں ہی بارہ وفات[2]

مصحفی اپنی نا امیدی پر
ہاتھ مَل کر کہوں نہ کیوں ہیہات

120

رخسار پر ہے زلفِ پریشان کی اوقات — بازاری تو رکھتے ہی ہیں دکّان کی اوقات

کیا یار پریکھا[3] ہے بُرے اور بھلے کا — ہر طرح گذر جاتی ہے انسان کی اوقات

محتاج نہیں غیر کا، صدقے سے جنوں کے، — ہاتھ اپنے ہی ہے اپنے گریبان کی اوقات

گر خونِ جگر ہو نہ، تو کیا خاک پیے وہ — ہے خونِ جگر پر مرے، پیکان کی اوقات

1۔ خواجہ قطب صاحبؒ کے عرس میں میوات علاقے کے رہنے والے کثیر تعداد میں آتے تھے

2۔ بارہ وفات سے مراد بارہ ربیع الاول۔ اُس زمانے میں ایسی تقریب اور تہوار میں محبوب سے ملاقات کا اچھا بہانہ ہوتا تھا۔ 3 ۔ پریکھا = امتحان، امتیاز

کیا سمجھے ہے وہ یاروں کی صحبت کے مزے کو غیروں میں کٹی اس بُتِ نادان کی اوقات

ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے
کیا پوچھو ہو اُس بے سر و سامان کی اوقات

ٹ

121

لے کے دل زلف میں رکھتا ہے لپیٹ یاد ہیں اُس کو کیا لپیٹ سپیٹ[1]
ہے جہاں طُرفہ خواب گہ جس میں یار کیا کیا رہے ہیں آکر لیٹ
کیونکے اٹکے نہ اُس کی ناف سے آنکھ صاف ہی اس قدر ہے اُس کا پیٹ
کیا رہا اب کہ اُس گلی سے صبا لے گئی میری خاک بھی تو سمیٹ

دور ہے مصحفی فرنگوں کا۔
کام ایسا نہ کر کہ کھاوے کیٹ[2]

122

آئی ہے یہ کچھ آہ کے صدمے سے دل پہ چوٹ جوں صید تیر خوردہ کہ ہو جائے لوٹ پوٹ
خوبی جواب دینے کی ٹک اُس کے دیکھیو گر میں پکارتا ہوں تو کہتا ہے مجھ کو ''پھوٹ''[3]
کھاتا ہے چرخ شعلۂ جوالہ رات دن ٹوپی کے گرد اُن نے لگائی ہے جب سے گوٹ
ہیں اس گلی میں حسن کے تودے لگے ہوئے خورشید و ماہ لے لے گئے باندھ باندھ پوٹ

کہتا تھا میں کہ دل تو نہ دے اس کو مصحفی
لے کر مُکر ہی جائے گا وہ شوخ ہے نلوٹ[4]

1۔ لپیٹ سپیٹ = ترکیبیں، بہانے 2۔ انگریزی لفظ 3۔ پھوٹ۔ عوامی بولی، مراد دور ہو جا، بھاگ، دوسرا مفہوم یہ کہ ''بول کیا چاہتا ہے؟'' 4۔ یہ بھی عوامی بولی ہے، دھوکہ باز

ث

123

جیسے کسی چیز پر ہوتی ہے طفلاں میں بحث
تیرے لیے شب رہی میرے دل و جاں میں بحث

زلف و رخ اپنا کہیں اُس نے دکھایا تھا ٹک
آج تک ہوتی ہے جو گبر و مسلماں میں بحث

وعدہ تری تیغ کا کیا کسی گردن سے ہے
کرتے ہیں زندانیاں آج جو زنداں میں بحث

کاٹ کا دعویٰ اُسے، شور کا لاف اِس کو تھا
اس ہی سخن پر رہی تیغ و نمکداں میں بحث

کوہ ہے تمکیں کے ساتھ، اور دل اُس کا وسیع
اس لیے ہوتی نہیں کوہ و بیاباں میں بحث

مکتبِ اطفال ہے مجمعِ دیوانگاں
رہتی ہے یاں روز و شب دست و گریباں میں بحث

دل سے اور اُس چشم سے لاگ ہے اِس طور کی
ہوتی ہے کیا لطف سے دونوں سخن داں میں بحث

کلبۂ شوریدگاں، شور سے معمور ہے
کرتے ہیں لڑکے تمام جیسے دبستاں میں بحث

دعویِ شعر اس قدر، تس پہ بھی اے مصحفی
بیٹھ کے تو نے نہ کی مجلسِ یاراں میں بحث

124

یار ملتا ہے کوئی، یہ آہ و زاری ہے عبث،
اے دل، اتنی بے کلی اور بے قراری ہے عبث

دن میں جو سَو سَو کرے یار اور پھرے اک اک کے گھر
سچ اگر پوچھے کوئی ایسے سے یاری ہے عبث

رام ہوتا ہے کوئی معشوقِ ہرجائی، دِلا
بے قراری، بے خودی، بے اختیاری ہے عبث

کوئی اس مجلس میں ہرگز دادِ غم دیتا نہیں
شمع سے کہہ دو کہ تیری اشک باری ہے عبث

غنچہ ایدھر مسکراتا ہے، اُدھر ہنستا ہے گل
اس چمن میں گریۂ ابرِ بہاری ہے عبث

یہ نہیں وہ شب کہ جس کی صبح ہووے گی طلوع
دم شماری کر دِلا، اختر شماری ہے عبث

وعدہ کر کے مصحفی کس دن وہ آیا تیرے پاس
تجھ کو اُس پیماں شکن کی انتظاری[1] ہے عبث

ج

125

تا بفلک تو گئی، اشک کے طوفان کی موج
دیکھ جسے رہ گئی، راہ میں عمّاں کی موج

حسن کا دریا ترے، آوے ہے جب زور پر
رُو بہ ہَوا جائے ہے، زُلف پریشاں کی موج

کیونکے بیاباں سے قیس آوے طرف شہر کے
پانو کی زنجیر ہے ریگِ بیاباں کی موج

اب تئیں کھاتی ہے وہ، رشک سے اک پیچ و تاب
برق نے دیکھی تھی ٹک اس زہِ داماں کی موج

دیکھ اُسے کیوں نہ میں چاک گریباں کروں
صورت آغوش ہو جس کے گریباں کی موج

چشمۂ حیواں ذقن، اور ہے جو غبغب[2] کا طوق
اُس کے تئیں جان تو چشمۂ حیواں کی موج

لکھی[3] شفق کی نہیں، چرخ پہ یہ مصحفی
اُڈی ہوئی جائے ہے خونِ شہیداں کی موج

126

نہ تو اس شہر میں دوا کا رواج
اور نہ ہو ہم سے دردِ دل کا علاج

کس کو بھاتا نہیں ہے اپنا جگر
گل ہے ہر شاخِ گل کے سر کا تاج

گر ہمیں اتنی دسترس ہوتی
نذر زلفوں کی کرتے شانۂ عاج[4]

مفلسی اِک تو، تس پہ بیماری
یہ مثل ہے وہی کہ کوڑھ میں کھاج

نالہ جاتا ہے تا بہ عرشِ بریں
ہے شبِ ہجر کی یہی معراج

1۔ انتظاری میں یاے معروف زائد ہے، جیسے آتش نے کہا: خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے!
2۔ یہاں غبغب سے مراد گردن میں جلد کا اُبھار بہ صورتِ طوق 3۔ لکھی = دھاری، اُبھار
4۔ شانۂ عاج = ہاتھی دانت سے بنی ہوئی کنگھی

کام کیا مجھ کو شورِ بلبل سے میں ہوں اک طوطیِ نفیس مزاج
مصحفی گلستانِ گیتی میں
ڈھونڈ لاوے تو کوئی، مجھ سا آج

127

یوں ہوا معلوم ہم کو دل کی بے تابی سے آج نیند آنے کی نہیں تا صبح بدخوابی سے آج
کیا وہ ماہِ چار دہ آیا ہے پشت بام پر لگ رہی ہے چشمِ مہ جو اُس کی مہتابی سے آج
سرخیِ پاں کا لکھوٹا[1] لب پہ کس دن تھا کبھو نکلے ہے کچھ اور بُو اُس رنگِ عنابی سے آج
کل نہیں رہنے کا یہ عالم ترا، اے ماہ رو روکشی کر لے تو اس ابروے محرابی سے آج
کب سے مصرِ عشق میں قحطِ متاعِ وصل ہے شکوہ ہم کرتے نہیں کچھ اُس کی نایابی سے آج
یا تو ندیاں بہہ رہی تھیں یاں، یہ کل کی بات ہے یا اُڑے ہے خاک ان آنکھوں میں بے آبی سے آج
کوزۂ دولاب[2] ہے ہر اشک اپنا مصحفی
ہم کو یہ خدمت ملی ہے چرخ دولابی سے آج

128

عیسیٰ سے کیونکے ہو دلِ بیمار کا علاج مشکل بہت ہے عشق کے آزار کا علاج
جوں شانہ جس نے ہاتھ لگایا ہو زلف کو ہے تازیانہ ایسے گنہ گار کا علاج
آ کر اجل نے موند دی آنکھ اپنی سہج میں کیا ہوگیا ہے حسرت دیدار کا علاج
ناسور سینہ بند کرے اوّلاً کوئی عاشق کے تب ہو دیدۂ خوں بار کا علاج
پر باندھ کر قفس میں جو صیّاد نے رکھا اچھا کیا یہ مرغ گرفتار کا علاج
موے سفید میرے یہ اتنے بُرے نہیں نرگس کرے جو زردیِ رخسار کا علاج
جاتا ہے کیسہ پُر کوئی دیری[3] طبیب کی لیتا ہے کم بغل کوئی عطار کا علاج

1۔ لکھوٹا = سرخی کی دھاری 2۔ دولاب = جس میں کئی ڈول اک ہار کی طرح لگے ہوتے ہیں، اُن کے گھومنے سے پانی اوپر آتا رہتا ہے۔ 3۔ دیری بجائے دہلیز استعمال کیا ہے (عوامی)

اپنی شفا تو ہاتھ ہے اب اُس کے مصحفی
کرتا ہے مفلسی میں جو نادار کا علاج

129

نکلا ہے سرخ پوش ہو وہ نوجوان آج — آتش میں پھک رہا ہے زمیں آسمان آج
میں اس قدِ خمیدہ سے ماروں گا خصم کو — برسوں میں میرے ہاتھ لگی ہے کمان آج
کیا مے کدہ سے آتے ہو تم کچھ نشہ پیے — کتنی بہک رہی ہے تمھاری زبان آج
ہم تم بھی شب میں، آؤ نہ مل بیٹھیں دو گھڑی — خورشید و ماہ کا ہے فلک پر قِران آج
اے گل، وہ عندلیب کہ یاں نغمہ سنج تھا — کنجِ قفس میں کہتے ہیں دی اُس نے جان آج
وے دن گئے کہ دبدبۂ خسروی تھا یاں ق — سُونے پڑے ہیں دیکھ تو کیا کیا مکان آج
جن کے جلو میں چلتے تھے لاکھوں نشان، واں — دیکھو تو کچھ زمیں پہ ہے اُن کا نشان آج؟
جا کر گلی میں اُس کی، پھر آئی بصد غرور — طاقت کا اپنی ہم نے کیا امتحان آج

کہتے تھے مصحفی جسے ہم، اُس کی راہ میں
بسمل پڑا ہوا تھا وہی نوجوان آج

130

خسرووں کے سر سے کب جاوے، ہوائے تخت و تاج
یاں سلیماں تک، میں پایا مبتلائے تخت و تاج

دل شکستہ کر نہ عاشق کا، کہ شہرِ عشق میں
قیمت اک دل کی نہیں ہوتی بہائے تخت و تاج

تاج جس کا ہووے سر، اور تخت ہو نعلینِ پا
کیوں نہ ہم ایسے کے پھر ہوویں فدائے تخت و تاج

کیجیے کا ہے کو پھر اس جاہِ دنیا کا غرور
خاک میں ملنا ہی جب ہو مدّعاے تخت و تاج

صفحۂ کاغذ پہ رزمیہ سے ہرگز کم نہیں
بسکہ رنگیں ماجرا ہے، ماجراے تخت و تاج

شاہنامے کو ذرا تو دیکھ تو اے مردِ ہوش
ہے لکھا کچھ اور بھی اس میں وَراے تخت و تاج

خاک اس امرِ خلافت پر کہ جس میں خلق نے
ذلتیں کیا کیا اُٹھائی ہیں براے تخت و تاج

سلطنت غصبی ہے شاہانِ جہاں کی سر بسر
فی الحقیقت ہیں نہیں کچھ یہ سزاے تخت و تاج

حضرتِ مہدیؑ اگر ہوتے تو ہاں اے مصحفی
حضرت مہدیؑ کے میں جاتا فداے تخت و تاج

131

کچھ ان دِنوں ہے اور ہوا گلستاں کے بیچ
بلبل سے یہ کہو کہ رہے آشیاں کے بیچ

صیّاد نے قدم جو رکھا گلستاں کے بیچ
کیا کیا نہ مرغ سرد ہوئے آشیاں کے بیچ

اب اُن مسافروں کا نشاں کس سے پوچھیے
جو خاک ہو کے مل گئے ریگِ رواں کے بیچ

کرتا نہیں جو رحم کبھی میرے حال پر
ہے کیا غضب ترے دلِ نامہرباں کے بیچ

مت پوچھ حال نزع میں، ظالم میں کیا کہوں
اب طاقتِ سخن نہیں اپنی زباں کے بیچ

پھینکا کیا ہوں شب جو میں آہوں کی برچھیاں سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسماں کے بیچ
خورشید جا کے قوس میں خجلت سے چھپ گیا وقتِ کشش مُنہ اُس کا جو آیا کماں کے بیچ
صیّاد سے کہو کہ اگر ہم اسیر ہوں ہم کو چمن کا منھ نہ دکھاوے خزاں کے بیچ
آتا ہے جی میں یوں کہ چلے جایئے کہیں شہرِ بتاں سے، مل کے کسی کارواں کے بیچ
تو گو کہ پاک صاف ہے، لیکن میں کیا کروں یاں سو مخاطرے[1] ہیں دلِ بدگماں کے بیچ
اے مصحفی تو قصّۂ عصمت کو پھر کے کہہ
اپنا تو جی لگا بہت اِس داستاں کے بیچ

132

ہم کو ناکامیِ طالع نے رکھا کام کے بیچ عمر آخر ہوئی بس نامہ و پیغام کے بیچ
اب وہ ایّام اسیری کے، کہاں اے صیّاد کہ گرفتار پھریں تھے قفس و دام کے بیچ
یہ کوئی وقت ہے اے شورِ قیامت تو نے کیا ستایا ہے ہمیں آن کے آرام کے بیچ
خونِ عشاق ہے کیوں مذہبِ خوباں میں حلال دِیت[2] اِس خون کی شاید نہیں اسلام کے بیچ
ہم کو اس آئینۂ دل میں نظر آتی ہیں وہی اشکال کہ جم دیکھ گیا جام کے بیچ
شب کہ تا صبح ہم آغوش مرا تھا وہ صنم کشمکش زور رہی بوسہ و دشنام کے بیچ
مصحفی کم نظر آتا ہے مجھے ان روزوں
آگیا ہو نہ کہیں گردشِ ایّام کے بیچ

133

لے گیا شوق قفس کو دلِ ناکام کے بیچ وائے وہ مرغ کہ پھنستے ہی مُوا دام کے بیچ
کس نے بیدار کیا خوابِ عدم سے ہم کو ہم تو سوتے تھے پڑے زور ہی آرام کے بیچ
سن کے بیمار نہ پوچھا جو مجھے یاروں نے کیا مگر رسمِ عیادت نہ تھی اسلام کے بیچ

1۔ مخاطرہ (خطرہ، خطرات) ذہن میں گذرنے والے خیالات 2۔ دِیَت = خوں بہا

تو بھی ہم یار کے قاصد سے لگے جاتے ہیں　گرچہ اک حرفِ مروّت نہیں پیغام کے بیچ
مطمئن بس کہ نہیں میری طرف سے صیاّد　کس کے رکھتا ہے قفس کو مرے، نت دام کے بیچ
آخری دَور میں پہنچے تھے، گئے ہم وہ چڑھا　تھا کوئی جرعہ جو یاروں سے بچا جام کے بیچ

مصحفی فصلِ گل آئی ہے نہ رہ گھر میں میاں
جاتے ہیں لوگ بیاباں کو اس ایاّم کے بیچ

134

جی جگر سب ہوگیا قاتل مرے لوہو کا خرچ
یہ تو بتلا کیا ہوا اِس خنجرِ ابرو کا خرچ

چشم و مژگاں میں مرے یکساں نہیں لوہو کا خرچ
یاں کٹورے چاہیئں اور واں ہے دو چلّو کا خرچ

دم بدم پھول اور پھلیل[1] اِدھر اُدھر سے آئیں ہیں
بس کہ لازم لالہ رویاں میں ہے، رنگ و بو کا خرچ

دیکھ تو قاتل ذرا تو بھی، ترے مقتول پر
اور کس کس کے ہوا ہے دست اور بازو کا خرچ

مفلسی مجھ پر گذرتی تھی تو تھا اے چشمِ تر
تیرے ہی ذمّے مرے جامے کی شست و شو کا خرچ

کاجل اور سُرمے کی فرمایش کے ہم پامال تھے
جن دنوں تھا اپنے سر اُس نرگسِ جادو کا خرچ

مصحفی دیتے ہیں جو کچھ ہم کو یہ اہلِ دُوَل[2]
سچ اگر پوچھو تو ہے وہ تیل و تمباکو کا خرچ

1۔ پھلیل = خوشبودار چیزیں، اُبٹن　2۔ دُوَل = دولت کی جمع، اہلِ دُول = اُمراء

ح

135

ملتے ملتے وو ہیں ہو جاتا ہے بیگانے کی طرح
یاد ہے کافر کو کیا عاشق کے تڑپانے کی طرح

میرزائی کا نہ کیوں مرغ چمن دعویٰ کرے
آشیاں میں اُس کے، اک نکلے ہے خس خانے کی طرح

شوق تو دیکھو کہ شب پرزے گریباں کے مرے
شمع پر جا کر جلے اِک مشت پروانے کی طرح

کھینچتے ہو، تنتے ہو، کہتے ہو ہردم آپ کو
ہے میاں یہ بھی کوئی آغوش میں آنے کی طرح

اک نہ اک ٹکڑا جگر کا آن رہتا ہے وو ہیں
نوکِ مژگاں پر مری، یاقوت کے دانے کی طرح

میں تو ہوں دیوانہ شفّافی کا اپنے اشک کی
کیا جھمکتا ہے پڑا، الماس کے دانے کی طرح

ساقیِ دوراں کو یا رب اس سے کیا منظور ہے
چرخ کو گردش میں کیوں رکھتا ہے پیمانے کی طرح

میں تو بندہ ہوں غرض اپنے دلِ صد چاک کا
رات دن زلفوں میں جھولا جھولے ہے، شانے کی طرح

مصحفی تو نے تو پہنچے کو جلا ڈالا تمام
یہ بھی اے ناداں کوئی ہوتی ہے گُل کھانے کی طرح

136

ہوتی ہے کیا یہی مرے صاحب حیا کی طرح
جاتے ہو دور دور جو نا آشنا کی طرح

آ کر مسافروں نے تری کُو میں یوں کہا
پانو کو پکڑے ہے یہ زمیں کربلا کی طرح

تقصیر کیا ہے میری، کوئی پوچھتا نہیں
پیچھے پڑی ہیں کیوں تری زلفیں بلا کی طرح

رنگینیِ مزاج تو تم اس کی دیکھیو
ہاتھوں سے میرے خوں کو ملا ہے، حنا کی طرح

صیاد کے شعور کا کشتہ ہوں میں کہ ہائے
باندھا ہے پَر سے پَر مرا، بندِ قبا کی طرح

بلبل کو اُس کے اُنس جو تھا مجھ سے، بعدِ مرگ
ہر استخواں پہ بیٹھے ہے آ کر ہُما کی طرح

بلبل تو میرزائی پر اپنی بہت نہ پھول
دیکھی نہیں ہے تو نے مرے میرزا کی طرح

گلچینِ روزگار سے فرصت اگر ملی
تو ہم چمن کی سیر کریں گے صبا کی طرح

روتا ہے زار زار جو بیٹھا تو مصحفی
کیا دل میں کھب گئی ہے کسی خوش ادا کی طرح؟

137

رات کاٹی ہم نے تجھ بن جس طرح
دن نہ دشمن کا بھی کٹیو اِس طرح

آتش سوزندہ ہے رنگِ کفک
لوں کفِ پا کا میں بوسہ کس طرح

داغِ دل شعلے سے غم کے مل گیا
ساتھ سونے کے ہو جیسے مِس طرح

مصرعِ قدِ سَرو سے ہم وزن ہے
ساتھ اُن آنکھوں کے ہے نرگس طرح

بخت کی برگشتگی سے پھر گیا
اس کو گھر لایا تو تھا جس تِس طرح

مرتے مرتے تک نہ بولا مصحفی
جان دی آخر کو اُس نے اِس طرح

138

تا چند کرتے خدمتِ گُل، باغباں کی طرح
ڈالی قفس میں ہم نے تو اب آشیاں کی طرح

سر وِ سہی، کہا نہ اکڑ اتنا باغ میں دیکھی نہیں ہے تو نے کسی نوجواں کی طرح
عاشق کو مارتے نہیں یوں جان سے میاں گر امتحاں کریں ہیں، تو اک امتحاں کی طرح
ممنون ہوں میں جی سے، سگِ کوے یار کا نامے کو لے چلا ہے مرے استخواں کی طرح
تو بھی تو چشمِ غور سے، ٹک دیکھیو نسیم ہنسنے میں غنچے کی ہے سب، اُس کے دہاں کی طرح
سر کھینچتا ہے غرفہ و روزن سے عاقبت حسنِ نہاں بھی قہر ہے، عشقِ نہاں کی طرح
کبکِ دری نہ چال پہ بھول اپنی، دور ہو کب چل سکے ہے تو مرے سروِ رواں کی طرح
کس طرح کوئی روک رکھے اُس کو، کیا کرے عمرِ رواں تو جاتی ہے آبِ رواں کی طرح
قبضے میں غیر کے وہ بر و دوش آ گیا خمیازہ کھینچتے ہی رہے ہم کماں کی طرح
کیوں کر کہوں میں چین ہوا دل کو، اب تلک نالے وہی ہیں، اور وہی آہ و فغاں کی طرح
وہ رشکِ ماہ، جب سے ہماری نظر پڑا دن رات ہم پھرا ہی کیے آسماں کی طرح
تم جا کے گھر میں غیر کے واں سو رہے میاں آنکھوں میں رات کاٹی میں یاں، پاسباں کی طرح
ترچھی نگہ میں کاٹ ہے شمشیرِ تیز کا سیدھی نگاہ چبھتی ہے دل میں سناں کی طرح
عاشق کو قتل کرکے جو یہ پوچھتے نہیں پوچھے کوئی بتاں سے، کہ یہ ہے کہاں کی طرح

ناحق کو شور ہے یہ ترا، تو تو عندلیب
بولی کبھی نہ مصحفیِ خوش زباں کی طرح

139

سینے سے جلوہ گر ہے ترے، ابتداے صبح گُل کھائے[1] ہے بیاضِ گلو پر صفاے صبح
اے ماہ، شگفتگی ترے برقع کی دیکھ کر تہ کی سپید بافِ فلک نے رِداے صبح
ہم نے تو تیرے عہد میں ہاں اے شبِ فراق دیکھا نہ خواب میں بھی رخ جاں فزاے صبح
کھل جائے آنکھ اگر تری شب سے تو بے خبر قابل ہے سیر کے چمنِ دل کشاے صبح
جلتا ہوں میں کہ آکے ابھی کوے یار سے بھڑکا گئی ہے آتشِ دل کو ہواے صبح

1۔ گُل کھانا = رشک کرنا

مُنھ دیکھ کر میں کس کا اُٹھا تھا جواب تلک ہوتی نہیں قرینِ اجابت دعاے صبح
نے شام لگ سکے تری زلفوں کے حسن کو نے آب و تاب صبح بُنا گوش پاے صبح
ہستی سے درگذر، جو تو چاہے ہے وصلِ دوست جلوہ ہے آفتاب کا بعد از فناے صبح
لطفِ جبیں سے تیری خجل ہوگئی تھی کل کس مُنھ سے تجھ کو آکے پھر اب مُنھ دکھائے صبح
ہم تو شب فراق سے مجبور ہوگئے اس شب کو تو ہی صبح کر اب اے خداے صبح
تقصیر وار گو کہ تمھارا ہے مصحفی ق پر وہ نہیں کہ بھولے یہ عہد و وفاے صبح
پیارے شب وصال میں اس کو کرو نہ قتل
موقوف صبح پر ہی رکھو ماجراے صبح

140

گالیاں دیتے ہو تم مجھ کو مری جاں صریح آپ کی بھی واہ وا، کیا ہی زباں ہے فصیح
زلف و رخِ یار کا، حسن بیاں کیا کروں شام نہ اتنی ملیح، صبح نہ اتنی صبیح
عشق کے آزار کی؛ عشق کے بیمار کی کر نہیں سکتا دوا، عہد میں تیرے مسیح
گرچہ ملاحت ترے حسن کی ہے دل فریب حسنِ خطِ سبز ہے اور ہی اُس سے ملیح
سُقم و غلط کو نہیں دخل ترے شعر میں
مصحفی جو کچھ لکھا تو نے وہ سب ہے صحیح

خ

141

اپنا تو مرغِ دل ہے گرفتارِ حسنِ شوخ لگتا ہے اِس کو خوش گل وگلزارِ حسنِ شوخ
اب تو فسردہ ہوگئے ہم، آہ تھا کبھی اپنا بھی عشق گرمیِ بازارِ حسنِ شوخ

ہر ایک خوب رو میں نہ دیکھی یہ چال ڈھال　　سچ ہے کہ اور ہوتی ہے رفتارِ حسنِ شوخ
چھپتے ہیں کوئی مُنھ کے چھپانے سے خوبرو　　وضعوں سے جلوہ کرتے ہیں آثارِ حسنِ شوخ
عاشق جو چشمِ غور ذرا اُس پہ وا کرے　　نقشے ہزار رکھتے ہیں معمارِ حسنِ شوخ
موسیٰ ہی ہو تو سمجھے تجلّی کے رمز کو　　کھُلتا ہے کب ہر ایک پہ اسرارِ حسنِ شوخ
کیا وہ بھی دن تھے آہ کہ ہم اُس حجاب پر　　جی بیچ کر ہوئے تھے خریدارِ حسنِ شوخ
لالہ سے جلوہ گر ہے کہ فصلِ بہار میں　　کرتی ہے مشتِ خاک بھی اظہارِ حسنِ شوخ
آنکھیں اگرچہ اپنی وہ آنکھیں نہیں رہیں　　ہے تو بھی اُن کو خواہش دیدارِ حسنِ شوخ
کرتے ہیں، جس لباس میں ہو، کوچہ گردیاں　　رہتے ہیں بیٹھ کوئی طلب گارِ حسنِ شوخ
رعنائیاں یہی ہیں تو ہرگز نہ جائے گی　　آنکھوں سے میری، حسرتِ دیدارِ حسنِ شوخ
صنعاں کا ذکر کیا ہے کہ صنعاں سے پیشتر　　تھی دوشِ اصفیا پہ بھی زنّارِ حسنِ شوخ

لُولی وَشانِ[1] ہند کے قائل ہیں مصحفیؔ
ہم وہ نہیں کہ ہم سے ہو انکارِ حسنِ شوخ

142

اُس مست کو ہوا ہے جو شوقِ شراب و سیخ　　مژگاں سے لختِ دل بھی رکھے ہے کباب و سیخ
روزِ شکار اُس کی سواری میں جا بجا　　حاضر رہے ہے مجمرہ[2] آفتاب و سیخ
صیدِ زبوں ہوں گرچہ، پہ میرا قبول دیکھ　　رکھے ہے لاگ مجھ سے بھی تیغِ خوش آب و سیخ
اِس مست کی گزک کے لیے، جوں جہندہ برق　　اک جا کیا ہے میں دلِ پُر اضطراب و سیخ

قربانیانِ تیغِ محبت کو مصحفیؔ
بیت الحرم میں چاہیے برق و سحاب و سیخ

1۔ لُولی وش = یہاں طرح دار، شوخ مراد ہے۔ مگر فارسی میں لُولی فاحشہ عورت کو کہتے ہیں

2۔ مجمرہ (میم مکسور، جیم ساکن، میم مفتوح) = انگیٹھی

143

لباس پہنے ہے اکثر وہ شوخِ پُرفن سرخ — کہ ہو نہ خونِ شہیداں سے اُس کا دامن سرخ

دلِ گداختہ پہلو سے یوں نظر آیا — کہ جیسے کورۂ[1] آتش میں ہو ہے آہن سرخ

لباسِ سرخ نے اُس کے یہ اُن میں رنگ بھرا — کہ مجھ کو آئے نظر جالیوں کے روزن سرخ

مِسی کا رنگ جو دیکھا ہے اُس کے ہونٹوں پر — ہوا ہے مارے خجالت کے رنگِ سوسن سرخ

کبھی تو سیر کو چل تو بھی جانبِ صحرا — کہ جوشِ لالہ ستاں سے ہیں سارے گلشن سرخ

شہید گر نہیں رنگِ حنائے خوباں کا
رہے ہے خون سے کیوں مصحفی کا مدفن سرخ

144

کچھ اپنی جو حرمت تجھے منظور ہو اے شیخ — تو بحث[2] نہ مے خواروں سے، چل دور ہو اے شیخ

مسجد میں ذرا وقتِ سحر دیکھ تو جا کر — شاید کوئی اُس چشم کا مخمور ہو اے شیخ

صد دانۂ تسبیح رکھے ہاتھ میں اپنے — چونکے تو جو یک دانۂ انگور ہو اے شیخ

تو مجھ کو کہے ایک، میں سَو تجھ کو سناؤں — اے کاش کہ اتنا مجھے مقدور ہو اے شیخ

آیا ہے وہ بدمست، لیے ہاتھ میں شمشیر — مجلس سے شتابی کہیں کافور ہو اے شیخ

کرتا ہے ہمیں منع تو پیمانہ کشی سے — پیمانہ تری عمر کا معمور ہو اے شیخ

البتہ کرے منع ہمیں عشقِ بتاں سے — تجھ سا جو کوئی عقل سے معذور ہو اے شیخ

پھر دُم ہے وہ شملہ جو ہوا حد سے زیادہ — رکھ شملہ[3] تو، شملے کا جو دستور ہو اے شیخ

ہر حرف میں سختی ہے ترے، سنگِ جفا سی — ڈرتا ہوں نہ پھر شیشۂ دل چور ہو اے شیخ

کیا حور کی باتوں سے لبھاوے ہے تو مجھ کو — حاشا کہ مجھے آرزوے حور ہو اے شیخ

1۔ کورہ = بھٹی 2۔ بحث نہ = بحث نہ کر، (گویا بحثنا مصدر سے صیغۂ امر بنالیا) یہ عوامی بولی ہے

3۔ شملہ = پگڑی، دستار

شیخی میں تُو سنتا ہی نہیں بات کسی کی — اس داڑھی پر اتنا بھی نہ مغرور ہوا ے شیخ

کیوں مصحفی کو اتنی تو کرتا ہے نصیحت
سر چڑھ نہ بہت اُس کے، جو مجبور ہوا ے شیخ

د

145

کس کے یاد آئے تجھے دستِ نگاریں فرہاد — جو ہوا تیشہ ترا، خون سے رنگیں فرہاد

تو سزاوار نہ تھا اس کا، عبث تو نے کیا — دعویِ عشق، بایں عزت و تمکیں فرہاد

ایک دن خواب میں آئی نہ ترے شیریں ہائے — نہ ہوئی شاد تری خاطرِ غمگیں فرہاد

تو سمجھ سختیِ بیداریِ شب کو میری — کیوں کہ خارا[1] ہے ترا بستر و بالیں فرہاد

سن کے شیریں نے سر اپنے کو وُہیں پیٹ لیا — جب سنا یہ کہ موا کوہ میں مسکیں فرہاد

کیا تصوّر کی قلم قابلِ تحریر نہ تھی — دل پہ کیوں نقش نہ کی صورتِ شیریں فرہاد

گر سنے تو، تو دمِ تیشہ یہی کہتا ہے — اب کوئی دم کو تو پا جائے گا تسکیں فرہاد

قلمِ تیشۂ فولاد سے اِس خارا پر — تو نے کیا خوب لکھی صورتِ شیریں فرہاد

جو کوئی دیکھے ہے صنعت کو تری کہتا ہے — تجھ کو احسنت[2]، ترے کام کو تحسیں، فرہاد

مصحفی تجھ کو یہ کہتا ہے، نہ رہنا غافل
عشقِ شیریں ہے ترا دشمن دیریں، فرہاد

146

آئینے کو ہے ترے حسن کی خدمت شاید — شانہ رکھتا ہے خمِ زلف سے بیعت شاید

دِل دیوانہ مرا اُس کی گلی سے نہ پھرا — اِن دنوں اُس کے تئیں ہوگئی رجعت شاید

1۔ خارا = پتھر 2۔ احسنت کہنا = داد دینا

میں نے جانا جو کیا کم، وہ لگا یوں کہنے — اس کو اب آنے کی ملتی نہیں فرصت شاید

بعضے کر بیٹھے ہیں دعویٰ جو شکیبائی کا — سہل سمجھا ہے انھوں نے غمِ فرقت شاید

بوے یاس آتی ہے اِس لالہ ستاں سے مجھ کو — یاں ہے مدفون کوئی کشتۂ حسرت شاید

کردیا آنکھ ملانا ہی بتاں نے موقوف — اب جہاں میں نہ رہی رسمِ مروّت شاید

تو جو اودھر ہی کو مائل ہے میاں، کرتی ہے — آنکھ تیری طرف آئینے کے رغبت شاید

جرسِ نالۂ بلبل کی فغاں، صبح سے ہے — باغ سے نکہتِ گل ہوگئی رخصت شاید

تم نے موقوف کیا ہم سے جو ملنا یک بار — ایک ہی بار کی ہوتی ہے محبت شاید

مصحفی کا کرو تم گورِ غریباں میں سراغ
اسی انبوہ میں ہو اُس کی بھی تربت شاید

147

ناوک سے نگہ کے تری، ہرگز نہ بچا صید — یاں ہوتے ہوئے دیکھے ہیں عنقا و ہُما صید

آہو تو ہیں کیا چیز کہ شیرانِ حرم کو — کرتی ہے کمندوں میں تری زلفِ رسا صید

ہاں سچ ہے ترے دام میں اے گیسوے پُرخم — ہووے گا کوئی ہم سا گرفتار بلا صید

آہو کہیں مارے کہیں صحرا کے چکارے[1] — کس کس کو تری زلفِ سیہ نے نہ کیا صید

جب زلف کو کھولا، تو پھنسے جال میں اپنے — جب آنکھ اُٹھائی ہوئے مرغانِ ہوا صید

کچھ بحری و برّی میں نہیں فرق اب اس کو — پاتی ہے جسے، کرتی ہے وہ زلفِ دوتا صید

اُس طفل نے جب شوق کیا تیر و کماں کا
تب مرغِ دلِ مصحفی خستہ ہوا صید

148

کس طرح جھانکے کوئی واں کرکے اب گردن بلند — واں کہ دیواریں بلند اور واں کے سب روزن بلند

اُس کے کوچے سے نکالا جب مُجھے، دیکھا کیے — منظروں سے دُور تک سر کرکے مرد و زن بلند

1۔ چکارا = ہرن کی نسل کا جنگلی جانور

پست فطرت پا سکے کب اُس کے معنی کے تئیں مطلعِ ابرو ترا ہے اے بُتِ پُرفن بلند
مجھ دوانے کی خبر اُن کو نہیں ورنہ ابھی کرتے دیوارِ چمن سے سرگل و سوسن بلند
چھوڑ کر سینے کو، میرے سر پہ وہ آ کر پڑا ہاتھ اپنا جب کیا میں نے گہِ شیون بلند
اُس تلک میری رسائی کس طرح ہو مصحفی
دست کوتہ اپنا اور اس شوخ کا دامن بلند

ذ

149

ہم نے خط لکھنے کو اس کے جب اُٹھایا کاغذ لکھتے ہی ہاتھ میں پھر اپنے نہ پایا کاغذ
بسکہ اُس طفل کو تھا شوقِ کبوتر بازی کر کے پرزے مرے نامے کے اُڑایا کاغذ
در جواب اس نے یہ لکھا کہ بھلا سمجھوں گا لکھ کے میں نے جو کبھی اس کو بھجایا کاغذ
نامہ قاصد کو دیا ہم سے بھی یہ چوک ہوئی اس کی دیوار پہ لکھ کے نہ لگایا کاغذ
دل جلے کیو نکے نہ میرا، کہ غضب کے مارے آگے قاصد کے، مرا اس نے جلایا کاغذ
ہم تو لکھتے ہی رہے پرزوں پہ دل کے غمِ دل ہم نے بازار سے کس روز منگایا کاغذ
دیکھ قاصد کی طرف ہنس کے وہ کافر بولا، ق میں مکرّر جو اسے لکھ کے بھجایا[1] کاغذ
مصحفی نے تجھے بھیجا ہے نہ؟ لا دیکھوں تو
اب کی شاید نئے مضمون کا لایا کاغذ

ر

150

آیا جو وہ کل تیر و کماں ہاتھ میں لے کر دوڑا مہِ نو اپنا نشاں ہاتھ میں لے کر

1۔ بھجایا بجائے بھیجا، بھجوایا۔ عوامی بولی

مہندی کی یہ رنگت نہیں، کافر نے ملا ہے
خونِ دلِ خونیں جگراں ہاتھ میں لے کر

رہ جاؤں ہوں میں کیسی غریبی سے ذرا دیکھ
دامن ترا اے سروِ رواں ہاتھ میں لے کر

ساقی کی نزاکت پہ ہنسی آئے ہے مجھ کو
رکھ دے ہے وہ جب رطل گراں ہاتھ میں لے کر

یہ شیشہ نہیں وہ کہ گیا ہاتھ پھر آوے
پٹکو نہ مرے دل کو میاں ہاتھ میں لے کر

بھائی یہ ادا مجھ کو جو کافر نے ادا سے
شب پھینک دیا بیڑۂ پاں ہاتھ میں لے کر

مُنھ دیکھنے لگتا ہوں میں، جب دیکھیں ہیں مکھڑا
آئینے کو ہر لحظہ بتاں ہاتھ میں لے کر

کیا چوک ہوئی مجھ سے جو شب چھوڑ دیا میں
جُوڑا ترا اے آفتِ جاں ہاتھ میں لے کر

اِس رات اندھیری میں، مجھے یہ تو بتا دے
جاتا ہے تو تلوار کہاں ہاتھ میں لے کر

یہ خاک غریباں کی ہے تو یاں سے چلا کر
دامن کو ٹک اے سروِ رواں ہاتھ میں لے کر

اے مصحفی اُس شہر میں ہم نے کیا سودا
جاتے ہیں مکر دل کو جہاں ہاتھ میں لے کر

151

آتا ہے جی میں یوں کہ کسی گُل کو تاڑ کر
جا بیٹھیے چمن میں گریبان پھاڑ کر

اس طفلِ بے شعور نے مانجھے کے واسطے
شیشے دلوں کے چُور کیے توڑ تاڑ کر

کس کس کو یاد کیجے کہ اس خاک داں سے ہائے
کیا کیا نہ گل چلے گئے دامن کو جھاڑ کر

مشہور ہے کہ رستم دستانِ چرخ کو
سو بار ہم نے چھوڑ دیا ہے پچھاڑ کر

عالم کو لولیوں کے محرّم میں دیکھیے
سنوریں ہیں کیا یہ حسن کے نقشے بگاڑ کر

آیا جو ہیں چمن میں تو اس طفلِ شوخ نے
پودھے گلوں کے پھینک دیے ہیں اُدھاڑ کر[1]

کہتے ہیں واں سے خون کا نالہ بہا ہے ایک
آئے ہیں ہم جہاں ترے کشتے کو گاڑ کر

بادِ خزاں کا ہووے بُرا جس نے مصحفی
میدان کر دیا ہے چمن کو اُجاڑ کر

1۔ ادھاڑ کر بجائے اُدھیڑ کر استعمال کیا ہے

152

ہم کو ترساتے ہو تم کیوں یہ ادا دکھلا کر
مُنھ چھپایا نہ کرو بہرِ خدا دکھلا کر

شرطِ یاری یہی ہوتی ہے کہ بس پھر گئے آپ
چار دن مہر و محبت کا مزا دکھلا کر

حسن کہتا ہے اُسے، پردہ اُٹھا دے، پر شرم
یوں سکھاتی ہے کہ لے مُنھ کو چھپا دکھلا کر

دل کو ہاتھ اُس کے جو بیچوں ہوں تو کہتے ہیں رقیب
لیجیو تم اِسے بازار ذرا دکھلا کر

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپا لے مُنھ کو
اپنا دیدار ہمیں روزِ جزا دکھلا کر

چاک چاک اپنے گریباں کو کیا ہے میں نے
اُسی دن سے، کہ وہ ہاتھ اپنے گیا دکھلا کر

غنچۂ گل سے مرا غنچۂ دل نازک ہے
لیجیو تو اسے اے بادِ صبا دکھلا کر

ان کے ہاتھوں سے بھلا کیوں کے کوئی بچ نکلے
لیویں جو دل کو لبھا رنگِ حنا دکھلا کر

نالہ سر کھینچے ہے خاک شہداء سے ابتک
تم چلے آئے تھے اک دن کفِ پا دکھلا کر

تیرے بیمار کو دے کر کے پشیمان ہوئے
لائے تھے وہ جو مسیحا سے دوا دکھلا کر

کیجو قاصد مرے پیارے سے جدائی کا گلہ
وقت فرصت مرے نامے کو جُدا دکھلا کر

خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجھ کو
مصحفی میں اُسے حال اپنا چلا دکھلا کر

153

ہم نے لُٹا دیا ہے گھر بار تیری خاطر
بیٹھے ہیں ہم پہن کر زنّار تیری خاطر

جب صبح کو اُٹھیں ہیں سوتے سے، سن رہیں ہیں
ہم ہر کسی کی باتیں دو چار تیری خاطر

شاید کسی بہانے تو اُٹھ کے آوے ہم تک
راتوں کو ہم رہیں ہیں بیدار تیری خاطر

گر تو نہ ہو تو پیارے کیا کام یاں ہمارا
آتے ہیں اس گلی میں ہر بار تیری خاطر

نازک مزاج تھے ہم، پر کیا کریں کہ اب تو
سُنتے ہیں ہر کسی کی ناچار تیری خاطر

اے حور جلوہ سن لے، ہم سے کہ ہم نے چھوڑا
حورِ بہشت کا بھی دیدار تیری خاطر

کیوں مصحفی جہاں میں رُسوا ہوا ہے، کہہ دوں
تیرے لیے ستم گر، خوں خوار تیری خاطر

154

نکلے ہے یہی دل کے مرے ساز سے باہر — وہ بات نہ کہیے جو ہو انداز سے باہر
ہر چند کہ حسن اُس کے پہ ہیں سیکڑوں پردے — لیکن وہ نہیں چشمِ نظر باز سے باہر
جاتا ہوں گھر اس کے تو وہ بے رحم مقرّر — سن نام مرا نکلے ہے سو ناز سے باہر
ہر چند قفس میں ہوں پڑا، پھر بھی نہیں ہے — یہ سیرِ چمن تو مری پرواز سے باہر
دل چھیدے ہوئے نکلے ہے صاحب نظروں کا — نوکِ نظر اس نرگسِ غمّاز سے باہر
کیا اُس کے سراپا کو بتاوے کوئی، جو شے — انجام سے ہووے الگ، آغاز سے باہر
معشوق وہی ہے جو کسی بات میں ہرگز — ہووے نہ کبھی عاشق جاں باز سے باہر

اے مصحفی راکض[1] ہوں میں میدانِ سخن کا
یہ عرصہ نہیں میری تگ و تاز سے باہر

155

وہ دن گئے کہ تھا تو شیریں مقالیوں پر — تیری زباں کھلی ہے ان روزوں گالیوں پر
شب اک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا — اب تک وُہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر
اک بال سی کمر کے باندھیں گے لاکھ مضموں — آئی جو طبع اپنی نازک خیالیوں پر
مے پی کے اس چمن سے کون اُٹھ گیا ہے، جو ہے — انگڑائیوں کا عالم، پھولوں کی ڈالیوں پر
لاکھوں مثال تیری، نظروں میں جلوہ گر ہیں — تو کس قدر عیاں ہے ان بے مثالیوں پر
کہہ دو صبا سے کوئی جلدی انھیں کھِلا دے — ہوتے ہیں خون ناحق غنچے کی لالیوں پر

اے مصحفی بتا تو، کیا کچھ خوشی ہوئی ہے
ہے ان دنوں جو چہرہ تیرا بحالیوں پر

1۔ راکض = سواری کرنے والا

156

دیکھیے کیا جی پہ گذرے نو بہار آئی ہے پھر
گل نے بعد اک سال کے شکل اپنی دکھلائی ہے پھر

رُت بُری ہے یہ، خدا جانے مرا کیا حال ہو
اس ہَوا میں یعنی مجھ کو بیم رُسوائی ہے پھر

جوش ماریں ہیں دلوں میں مرد و زن کے ولولے
چھوڑ گھر کو خلق بُستانی و صحرائی ہے پھر

دم بہ دم بادِ صبا سے آئے ہے بٹنے[1] کی بُو
غارتِ آرام و تاراجِ شکیبائی ہے پھر

مصحفی چل تو بھی صحرا کو کہ ظالم ان دِنوں
سبزہ و گلزار کا عالم تماشائی ہے پھر

157

سر پہ گل طرّہ[2] کا گڑوا[3] رکھ کے لائی ہے بہار
ہم سے بھگوا[3] مانگنے اس سال آئی ہے بہار

جب پکڑ کر لے چلا صیّاد بلبل کے تئیں
مُنھ سے نکلا اس کے یہ، تیری دُہائی ہے بہار

یہ جو اک لالہ کا تختہ آئے ہے مجھ کو نظر
اس کی سرخی نے مری چھاتی جلائی ہے بہار

کس طرح تیری وفا کا معتقد ہووے کوئی
عارضِ گل پر تو رنگِ بے وفائی ہے بہار

جس زمیں سے لالہ اُگتا ہے کسی مُدّت کے بیچ
اُس زمیں میں ہم نے جوئے خوں بہائی ہے بہار

رہ کوئی دن اور گلشن میں کہ بعد اک سال کے
تو نے مشتاقوں کو شکل اپنی دکھائی ہے بہار

ایک تنکا صحنِ گلشن میں نہ آوے گا نظر
کیوں کہ رنگ اکثر گلوں کا کہربائی ہے بہار

نالۂ بلبل کو گل کیوں کان دھر سنتا نہیں
تجھ سے پوچھوں ہوں یہ کیا بے اعتنائی ہے بہار

آب جو سے آئینہ رکھتی ہے اپنے سامنے
ٹک ادھر تو دیکھ یہ کیا خودنمائی ہے بہار

مصحفی میں کیا کروں گا جا کے اب گلشن میں میاں
چشمِ پُرخوں نے یہیں مجھ کو دکھائی ہے بہار

1۔ بٹنا= اُبٹن، عورتیں جلد کی صفائی کے لیے زمانہ قدیم میں استعمال کرتی تھیں۔ 2۔ گل طرّہ: مٹکی پر سجا ہوا پھول 3۔ چھوٹی مٹکی 4۔ پھگوا۔ بسنت کی رسم

158

رہتا ہے دل اُس زلفِ پریشاں میں گرفتار
وہ اُس میں گرفتار، میں زنداں میں گرفتار

اے قوّتِ پرواز مدد کیجیو اس کی
ہو جائے نہ پروانہ چراغاں میں گرفتار

کس طرح چھڑاؤں میں یہ کنجشک دل اپنا
اس طفل کے ہے گوشۂ داماں میں گرفتار

وہ ترکشِ پُر تیر ہوا کیا کہیں خالی
جو صید نظر آئے نیستاں میں گرفتار

اندیشہ ہے کس زلف کا مجھ کو کہ رہوں ہوں
شب تا بہ سحر خواب پریشاں میں گرفتار

چشم اُس کی ہے وہ باز کہ دل جس نے کیا ہے
جوں صیدِ زبُوں پنجۂ مژگاں میں گرفتار

کس طرح سے سُلجھائے تری زلف پریشاں
یہ ہاتھ تو رہتا ہے گریباں میں گرفتار

تعلیم گرفتاریِ دل قیس نے لی ہے
اس وقت کہ وہ تھا نہ دبستاں میں گرفتار

اس شوخ نے پھر مصحفیِ خستہ کے دل کو
لے جا کے کیا چاہِ زنخداں میں گرفتار

159

عالم ہے تری زلفِ پریشاں میں گرفتار
کیوں تو نے کیا ہے مجھے زنداں میں گرفتار

جس سر کے پھرا گرد ترا دَورۂ دامن
وہ سر ہوا پھر گردشِ دوراں میں گرفتار

اُس آہوے وحشی کو کوئی کیوں کے کرے صید
دن رات وہ رہتا ہے دبستاں میں گرفتار

آتا ہے مجھے پُر دلیِ دل کا تاسّف
جا کر یہ ہوا ہے صفِ مژگاں میں گرفتار

ہے زلف سیہ سایۂ ہر شاخ خمیدہ
ہو جائیو مت جا کے گلستاں میں گرفتار

اس چشم کے ہیں سیکڑوں کشمیر میں کشتہ
اُس زلف کے ہیں لاکھوں صفاہاں میں گرفتار

اے مصحفیؔ ہم سے نہ گئی حسن پرستی
نت ہم تو رہے الفتِ طفلاں میں گرفتار

160

میری اُس کی ہے ملاقات کچھ اور گرمیاں رہتی ہیں دن رات کچھ اور

حسن اتنا تو نہ تھا لیلیٰ میں دل کے آجانے کی ہے بات کچھ اور

ذکر میرا جو چلا کچھ، تو کہا ہے زمانے سے وہ بد ذات کچھ اور

گل کی پتّی[1] اُسے کب لگتی ہے اے گلِ تر ہے تری گات[2] کچھ اور

یارِ صادق نہ رہے دُنیا میں اب کی یاروں کی ہیں نیّات کچھ اور

لگ سکے ہے کوئی اس کو ساون چشمِ گریاں کی ہے برسات کچھ اور

مصحفی تو ہے وہ مردِ کامل

جس کی عالم سے ہے اوقات کچھ اور

161

یوں ہے یہ نقاب اُس بُتِ بے پیر کے مُنھ پر جیسے ورقِ سادہ ہو تصویر کے مُنھ پر

کیا جانے کسے ذبح کیے آئے ہے کافر ہے آج تو سرخی تری شمشیر کے مُنھ پر

کس زلف کے حلقے کا تصوّر ہے جو ہر دم ہے آنکھ مری حلقۂ زنجیر کے مُنھ پر

گو غیر کی خواہش ہے ترے دل میں تو ہووے یہ بات نہ کہہ عاشقِ دلگیر کے مُنھ پر

عزّت نہیں اُس صید کی کچھ صیدِ حرم میں جو صید کہ آیا نہ ترے تیر کے مُنھ پر

برسات میں شق[3] پڑتی نہیں اس میں، یہ منعم ہنستی ہے خرابی تری تعمیر کے مُنھ پر

منھ جس نے کیا تیری طرف، چشم نے تیری جو تیر بھی مارا، اُسی نخچیر کے مُنھ پر

اے مصحفی کر شکر کہ ہے رنگِ اجابت

اِس رات تری آہ کی تاثیر کے مُنھ پر

1۔ پتّی لگنا = مقابلہ 2۔ گات = بدن 3 ۔ شق پڑنا = برسات میں دیوار کے اندر شگاف آنا

162

ارجن سا بشر آ نہ سکا تیر کے مُنھ پر دشوار ہے چڑھنا تری شمشیر کے مُنھ پر
کچھ بھا جو گیا جی کو تو بس ہو گیا بے خود منھ اپنا میں رکھ کر تری تصویر کے منھ پر
مت چشمِ حقارت سے مرا زخمِ جگر دیکھ بوسے دیے ہیں اس نے ترے تیر کے منھ پر
وہ تجھ کو نگل جائے گا اے شمع کے شعلے کہتا ہوں نہ چڑھ اتنا تو گلگیر[1] کے منھ پر
گیرندہ تر اُس سے ہے تری زلف کا حلقہ ہم تو یہ کہیں حلقۂ زنجیر کے مُنھ پر
اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے منھ پر

163

کیا ہی شیریں زبان ہے کافر کیا ہی مصری کی جان ہے کافر
لاغری اس کمر کی تو دیکھو کس قدر ناتوان ہے کافر
نازکی اُس بدن کی کیا کہیے تو کہے[2] دھان پان ہے کافر
تو تو کافر نہیں، خدا کی قسم تیری کافر زبان ہے کافر
دل مجھے چھوڑتا نہیں اک دم کِس قدر بدگمان ہے کافر
چین سے کیا زمیں پہ بیٹھیں ہم سر پہ یہ آسمان ہے کافر
مصحفی پوچھ مت صنم کا حال
اب تو نا مہربان ہے کافر

164

چنداں رہِ کرم سے چلے آؤ میرے گھر اک آدھ شب جو چاہو تو رہ جاؤ میرے گھر
باور تو جب کروں میں جو ملنے کی غیر سے اپنی خوشی سے آ کے قسم کھاؤ میرے گھر

1۔ گُل گیر= شمع کی لو کا دھاگا جب زیادہ جل جاتا ہے تو اُسے گُل گیر سے کاٹ دیتے ہیں
2۔ تو کہے = گویا کا ترجمہ ہے اور گویا گوئیا کا مخفف ہے

بیٹھے رہو خدا کی قسم کون وضع ہے کیدھر چلے ہو دھوم نہ مچواؤ میرے گھر
یہ جانیو کہ آج ہے وعدہ کسی کے ساتھ وحشت میں دوستوں جو مجھے پاؤ میرے گھر
واشُد[1] ہر اک کے گھر میں مناسب نہیں تمھیں زلفوں کے بال بیٹھ کے سُلجھاؤ میرے گھر
کہتا ہے مصحفی کہ بہ تقریبِ بازدید ق اے دوستاں گر آب کی اُسے لاؤ میرے گھر
یہ جام دوں کہ ہو کے وہ مستی میں بے حواس
گھر آ کے یوں کہے: مجھے پہنچاؤ میرے گھر

165

ہم تو سوئے نہ فراغت سے کبھی بستر پر ہم نے سر اپنا رکھا بھی تو دمِ خنجر پر
دل سے کرتا ہوں میں یوں کسبِ حرارت دن رات ہاتھ جاڑے میں رہیں جیسے سدا مجمر[2] پر
میں تو کیا چیز ہوں، لیکن ترے کوچے کے گدا پشت پا مارتے ہیں حشمت اسکندر پر
حسنِ سادہ کے جو عالم میں تماشائی ہیں آنکھ پڑتی ہی نہیں اُن کی زر و زیور پر
زخم سینے میں لگے ہیں مرے اُس تیغ کے یوں جیسے پرکار سے خط کھینچے کوئی مسطر پر
اُن کو پاپوش میسّر نہ ہوا جسم کے تئیں کفشِ پا رکھتی تھی جن کی کہ شرف افسر پر
کہہ تو کیا وصف ہے اے چاہِ زنخداں تجھ میں نہیں جاتا جو ترا تشنہ لبِ کوثر پر
مصحفی سمجھے وہ کیا حالِ فقیراں جس نے
گرم پہلو نہ کیا ہو کبھی خاکستر پر

166

پھولوں کی چھڑی کھائے ہے گل بندِ قبا پر ہے آبِ رواں غش ترے سینے کی صفا پر
کیا عشق کے کوچے میں نہیں امن کی جا گہ ہر لحظہ بلا ہوتی ہے نازل جو بلا پر
اس شوخ کے کوٹھے سے پڑے برسے ہیں پتھر اے راہ رواں، تم بھی نظر کیجو ہوا پر
تم دیکھو ہو واں آئینہ، یاں آنکھوں میں جی ہے اب دیکھیے کیا ہو، نظر اپنی ہے خُدا پر

1۔ واشُد = بے تکلف ہونا 2۔ مجمر (بروزن مسطر) انگیٹھی

کیا دیجیے دعا اُس کو کہ یہ رسم ہے یاں کی　گر دیجیے دعا، ملتی ہے دشنام دعا پر
آیا تھا وہ پانْوں کو کفک[1] اپنی لگائے　دل لوٹ گیا رات مرا رنگِ حنا پر
کیا چاہیے بستر کو تجھے مخمل و قالیں
اے مصحفی گر رہ نہ کہیں فرشِ گیا[2] پر

167

ہم صبح کو کوچے سے ترے رہ گئے چل کر　دیکھا کہ گیا قافلہ منزل سے نکل کر
کیا قہقہہ اک مار کے اُس دم وہ ہنسا ہے　مجلس میں گرے اُس کی جو ہم رات سنبھل کر
پڑتا ہے ترے پانْو پہ کیا لطف سے آکر　دامن ترا، ہردم تری ٹھوکر سے اُچھل کر
پا بوسی کو سر ہم نے جھکایا تھا کہ وو ہیں　کل رہ گئی اُس شوخ کی تلوار اُگل[3] کر
تھا تر مرے گریہ سے زبس سنگِ دراس کا　مجلس سے جو نکلا سو گرا وو ہیں پھسل کر
آ لاش پہ کشتہ کی ترے، اہلِ تماشا　پھر پھر گئے آخر کفِ افسوس کو مل کر
شب شمع کے شعلے نے جو کی چرب زبانی　پروانہ ہوا خاک کی ڈھیری[4] وو ہیں جل کر
اے مصحفی ہے کہنہ زمیں یہ تو ولی کی
کہہ اور غزل، قافیہ تو اس کا بدل کر

168

اتنا تو نہ جینے سے فلک مجھ کو خفا کر　جو مرنے کی مانگوں میں دعا ہاتھ اُٹھا کر
غنچہ سا دہن جن نے ترا آپ بنایا　غنچے سے کہا پیرہنِ صبر قبا کر
میں آہ کے شعلے سے بھڑک اُٹھا ہوں سارا　کیا جانیے کیدھر گئے تم آگ لگا کر
لائی جو قضا مقتلِ تسلیم میں تجھ کو　ہم بیٹھ گئے تیغ تلے سر کو جھکا کر

1۔ کفک = ہتھیلی یہاں مہندی جو کفِ پا پر لگی ہو　2۔ گیا = گیاہ (گھاس)

3۔ اُگلنا (تلوار کا) = نیام سے باہر آنا　4۔ ڈھیری بجائے ڈھیر (روزمرہ)

پروانہ جلا شمع پہ جس وقت، یہ بولا　　لے میں تو چلا تو کفِ افسوس ملا کر
گر خونِ جگر ہو نہ سکے اشک کا قطرہ　　یا رب تو اسے پنجۂ خوباں کی حنا کر
صیّاد تو رہنے دے مجھے کنج قفس میں　　جب تک کہ بہار آوے قفس سے نہ رہا کر
اے مصحفی مت دیکھ کسی زلف کے خم کو
دیوانے، دل اپنا نہ گرفتارِ بلا کر

169

کافر یہ جو بکھرے ہیں ترے بال ہوا پر　　مارا ہے عجب طرح کا اِک جال ہوا پر
لوہو ہی برستا ہے تری تیغِ نگہ سے　　دیکھا تو عجب رنگ ہے اس سال ہوا پر
آہیں جو مری ہیں رخِ خورشید کے دَرپے　　دوڑا ہوا جاتا ہے وہ شہ چال[1] ہوا پر
بلبل وہ مُوا کون گلستاں میں کہ جس کے　　اُڑتے ہوئے پھرتے ہیں پَر و بال ہوا پر
یہ ابرِ سیہ تاب نہیں، اُڑ کے گیا ہے　　عاشق کا ترے نامۂ اعمال ہوا پر
اے مصحفی گر یہ ہے تری آہ کی گرمی
تو کیوں کے اُڑے طائرِ ذی بال[2] ہوا پر

170

سنبلِ تر کے تئیں پردۂ رخسار نہ کر　　دلِ مرغانِ چمن اس میں گرفتار نہ کر
مُنھ دکھا دے کہ دمِ نزع ہے بیمار ترا　　حشر پر اس سے میاں وعدۂ دیدار نہ کر
سایۂ تیغ میں لے جا تو سر اپنے کے تئیں　　گر ہے عاشق، ہوسِ سایۂ دیوار نہ کر
اے اسیرِ قفسِ محنتِ دوریِ فراق　　اس ہوا میں تو ہَوائے گل و گلزار نہ کر
کل ترا نقشِ قدم طیش سے میرے آگے　　کبک کو کہنے لگا دعویِ رفتار نہ کر
صحبتِ شب کا سماں ہے تری آنکھوں سے عیاں　　بادہ نوشی کا میاں مجھ سے تو انکار نہ کر

1۔ شہ چال = گھوڑے کی تیز رفتار　　2۔ ذی بال = پَروں والا

مصحفی عشق چھپانا ہی بھلا ہوتا ہے
گو تو عاشق ہے پر اس بات کا اقرار نہ کر

171

جانِ من جلوہ گری برسرِ بازار نہ کر — جنسِ حسن اپنی کا ہر اک کو خریدار نہ کر
کیا سروکار تجھے میری حزیں نالی سے — ہر دم اے مرغِ چمن اس کی تو تکرار نہ کر
اِس شب و روز کے قصّے سے میں تنگ آیا ہوں — اتنا اے عمر مجھے زیست سے بیزار نہ کر
تیرے بن دیکھے، جو اک دم میں، مُوا جاتا ہو — ایسے بے صبر سے تو وعدۂ دیدار نہ کر
منھ دکھا اپنا، کہ سکتہ نہیں، ہے نزع کا حال — غافل آئینہ مرے سامنے ہر بار نہ کر
لاش رہنے دے مری خاک میں پنہاں، گے روز[1] — قاتل اس فتنۂ خوابیدہ کو بیدار نہ کر
کعبہ و قبلہ میاں یار ترے ہوویں گے — کہہ کے یہ بات عبث ہم کو گنہ گار نہ کر
اور ہووے گا غرور اُس کو، تو اے آئینے — خوبیِ حسن سے یاں تک تو خبردار نہ کر

مصحفی چاہیے کچھ ضبط بھی ہو عاشق کو
آگے ہر اک کے، میاں، دردِ دل اظہار نہ کر

172

جتنا کہ سراہا وہ ہوا اور بھی مغرور — جوں جوں اُسے چاہا وہ ہوا اور بھی مغرور
اُن بن ہی رہی واں تو، و لے اپنی طرف سے — میں نے جو نباہا وہ ہوا اور بھی مغرور
تعریف میں اُس کی جو زباں سے مری نکلا — خوش وقتی میں "آہا" وہ ہوا اور بھی مغرور
گر اُس شہِ خوباں کو کہا پیار سے میں نے — خورشید کلاہا[2]، وہ ہوا اور بھی مغرور

اے مصحفی روؤں نہ کہ لگ چلنے سے میرے
آہا و فآہا[3] وہ ہوا اور بھی مغرور

1۔ گے روز = چندروز 2۔ خورشید کُلاہا = معزّز، جس کی کُلاہ خورشید کی طرح بلند ہو
3۔ آہا و فآہا = افسوس صد افسوس

173

جامہ مِلتا ہے بدن سے ترے چسپاں ہو کر
ہم تو جاویں گے نکل چاک گریباں ہو کر

اس کے کوچے میں مری خاک تھی مجھ تک ہی نسیم
اُٹھ گیا میں، تو گئی وہ بھی پریشاں ہو کر

جب ترے سامنے آتا ہے سحر گہ خورشید
صورتِ آئینہ رہ جائے ہے حیراں ہو کر

بوئے پیراہنِ گل اس سے مجھے آتی ہے
شاید آئی ہے صبا طرفِ گلستاں ہو کر

کیا فضا باغ کا ہے، جان مری ایسے میں[1]
کر خجل کبک دری کو تو خراماں ہو کر

شعلۂ شمع گیا اُس کے جو دامن سے لپٹ
جل گئے رات کو فانوس چراغاں ہو کر

آدمیت کی جو ہو وضع، نہ دے ہاتھ سے وہ
آدمی چاہیے حیواں نہ ہو انساں ہو کر

معجزہ دیکھ ترے روئے کتابی کا صنم
دین میں آتے ہیں ہندو بھی مسلماں ہو کر

مصحفی مرغ چمن زمزمہ پیرا ہیں سبھی
ان دنوں باغ میں چل تو بھی غزل خواں ہو کر

174

باندھی ہے ہم نے از بس جوں نے کمر فغاں پر
نالوں سے میرے آفت ہر شب ہے آسماں پر

مرہی گیا نہ بلبل، صیاد کیا کیا یہ
رکھنا نہ تھا قفس کو دیوارِ گلستاں پر

ہم نے بھی کل تماشا جا کر انھوں کا دیکھا
انبوہ ہو رہا تھا اک اُس کے کشتگاں پر

قد کی لچک کسو کی آتی ہے یاد مجھ کو
پڑتی ہے آنکھ اپنی جب شاخِ ارغواں پر

ہوتا ہے دیکھ جس کو شرمندہ برگِ سوسن
مسّی کی یہ اُداہٹ[2] کافر کی ہے زباں پر

تو گھر سے گر نہ نکلا تو سر پٹک پٹک کر
دیویں گے جان[3] اپنا ہم تیرے آستاں پر

جب وہ گیا چمن میں لے ہاتھ میں کماں کو
دو چار تیر پھینکے بلبل کے آشیاں پر

1۔ فضا کو مذکر باندھا ہے　2۔ اُداہٹ = مسّی کا اُودا رنگ، مسّی کی دھڑی بھی کہتے ہیں

3۔ جان کو مذکر باندھا ہے

گو خاک میں ملے ہیں ہم گرد باد[1] آسا لیکن دماغ اپنا اب بھی ہے آسماں پر

اے مصحفیؔ گئے ہیں کیا لے کے حسرتیں وے
آتا ہے گریہ مجھ کو احوالِ رفتگاں پر

ز

175

کس کے مجروح یہ مدفوں ہیں تہِ خاک ہنوز گل زمیں سے جو نکلتے ہیں جگر چاک ہنوز
ہے مری خاک بگولے کی طرح چکّر میں دست بردار نہیں گردشِ افلاک ہنوز
یار مل جائے گا اتنی بھی نہ بے صبری کر ابتدا عشق کا ہے، اے دلِ غمناک ہنوز
نعش پر نعش چلی آتی ہے اُس کوچے سے بر سرِ رحم نہیں غمزۂ سفاک ہنوز
کس کی مست آنکھیں میں دیکھی ہیں جو ٹپکے ہے پڑا رگِ مژگاں سے مری خونِ رگِ تاک[2] ہنوز
خالِ عارض کو ترے اس نے کہیں دیکھا تھا باغ میں لالہ کو ہے نشۂ تریاک[3] ہنوز

قتل کا مصحفیِؔ خستہ کے انکار نہ کر
شاہدِ خوں ہے ترا دامنِ فتراک ہنوز

176

بیگانگی ہے اُس کی ملاقات میں ہنوز وا حسرتا کہ فرق ہے دن رات میں ہنوز
فندق اُن انگلیوں پہ نہیں ہے تو کیا ہوا رنگینیاں وہی ہیں اشارات میں ہنوز
دیکھا تھا بات کرتے اُسے ساتھ غیر کے سو اپنا جی کھپے ہے اسی بات میں ہنوز
کیا شے ہے تو کہ کچھ نہیں آتا سمجھ میں ہائے ہم خوض کرر[4] ہے ہیں تری ذات میں ہنوز

1۔ گردباد = بگولا 2۔ خونِ رگِ تاک = شرابِ ارغوانی 3 ۔ تریاک = افیون
4۔ خوض = گہری سوچ، غور وفکر

اِک دن کفک کو اس کے میں دیکھا تھا پیار سے — خوں رو رہا ہوں اُس کی مکافات میں ہنوز
وہ نازکی کے دن نہیں، پر تو بھی ہے صنم — لطفِ صفائے صبح، تری گات میں ہنوز

سمجھا ٹک اپنے دیدۂ تر کو تو مصحفی
باقی کئی مہینے ہیں برسات میں ہنوز

177

خوں ٹپکتا ہے مرے دیدۂ گریاں سے ہنوز — دل کو پیوند ہے اُس خنجرِ مژگاں سے ہنوز
اُس کے ہاتھوں سے کہاں جاؤں کہ یہ دستِ جنوں — دست بردار نہیں میرے گریباں سے ہنوز
یار مارے گئے سب کوہکن و وامق و قیس — بچ کے آیا نہ کوئی عشق کے میداں سے ہنوز
شبِ ہجراں کے اُٹھائے ہیں میں کیا کیا صدمے — تب تو دل کانپے ہے نامِ شبِ ہجراں سے ہنوز
ایک شب خواب میں دیکھا تھا کہیں اس کے تئیں — جی اُلجھتا ہے تری زلفِ پریشاں سے ہنوز
دیکھ کر کشتہ مجھے در پہ ترے کہتی ہے خلق — یہ عمل تو نہ ہوا تھا کسی انساں سے ہنوز

مصحفی گبر ہے یارو نہ مسلماں لیکن
جی سے نفرت ہے اُسے گبر و مسلماں سے ہنوز

178

طوطی میں کہاں ہے تری گفتار کا انداز — لہجے کی ادا اور یہ تکرار کا انداز
تصویر جو کھینچی بھی مری مانی نے اُس میں — گردن سے تو نکلے تھا گنہ گار کا انداز
نازاں ہے بہت طرّۂ زرتار پہ خورشید — دیکھا نہیں تیرے گلِ دستار کا انداز
تا دیر میں کل تاک کے سائے میں رہا بیٹھ — نکلے تھا ترے سایۂ دیوار کا انداز
نیچے ہی کو دیکھے ہے زبس سیکھ گئی ہے — نرگس بھی تری نرگسِ بیمار کا انداز
اک عمر جو کی سعی بہت کبکِ دری نے — آخر کو اُڑایا تری رفتار کا انداز
ہر چند کہ ہے سادگی بھی اُس کی اک آفت — پر قہر ہے غصّے کی ادا، پیار کا انداز

کچھ اور ہے اِس دیدۂ خوںبار کا انداز نے ابرِ بہاری ہی لگے اُس کے نہ شبنم

اے مصحفی مت کر ہوسِ مجلسِ آصف
معلوم نہیں ہے تجھے دربار کا انداز

س

179

دور سے دیکھتے ہیں یار کا دیدار اور بس فقط اک دید کے ہیں ہم تو گنہ گار اور بس

تو ہی اے یوسفِ ثانی جو نہ ہو، تو کیا ہے ہے ترے حسن سے ہی گرمیِ بازار اور بس

نیم بسمل کی طرح خاک پہ کب تک تڑپھوں صدقے تیرے، تو لگا ایک ہی تلوار اور بس

اُس نے کیوں چاک کیا پڑھ کے، مرے خط میں تو تھا سراسر گلۂ چرخِ ستم گار اور بس

کچھ طمع اور زیادہ نہیں رکھتے تجھ سے جی سے ہم ہیں تری چاہت کے گرفتار اور بس

تیرے کوچے سے سفر میں نے کیا تھا جس دن تھے مرے ساتھ مرے دیدۂ خوں بار اور بس

مصحفی اِس کے سوا کچھ ہو تو میں کافر ہوں
ہے مرے دل میں یہی آرزوے یار اور بس

180

ٹک آکے بیٹھے جو وہ مہ جبیں ہمارے پاس تو ہم یہ جانیں، ہیں دنیا و دیں ہمارے پاس

چلے گا قافلہ یاروں کا صبح، کیا کیجیے کہ زادِ راحلہ مطلق نہیں ہمارے پاس

ہم آرزو میں تمھاری ہلاک ہوتے ہیں خدا کرے کہ تم آؤ کہیں ہمارے پاس

پڑھیں ہیں چیں جبیں ہی سے شعر ہم اُس وقت جب آکے بیٹھے کوئی نکتہ چیں ہمارے پاس

ہمارے حال کو سُن کر بہت ہوا حیراں گیا جو بیٹھ کوئی خوش نشیں ہمارے پاس

خدا ہی جانے کہ اس دل کو کیا ہوا یارو جو چین ہی نہیں اس کے تئیں ہمارے پاس
کبھی نہ ہم نے میاں مصحفی کو خوش پایا
جب آ کے بیٹھے تو بیٹھے حزیں ہمارے پاس

181

اس دلِ ویران کا عالم نظر آیا کہ بس رات اس سنسان کا عالم نظر آیا کہ بس
یوں ہے سب خلقت خدا کی، جس کا عالم دیکھیے لیکن اُس انسان کا عالم نظر آیا کہ بس
شب جو کھل کھل کر وہ باتیں پیار کی کرنے لگا اُس بُتِ نادان کا عالم نظر آیا کہ بس
شورِ طوفاں، جوشِ عماں کب ہے اس انداز پر دیدۂ گریان کا عالم نظر آیا کہ بس
مجلس خنیاگری[1] میں شب گذر اپنا بھی تھا واں مسی و پان کا عالم نظر آیا کہ بس
چاندنی شب میں جو کی میں اُس کے ماتھے پر نگاہ ہائے وہ افشان کا عالم نظر آیا کہ بس
لکھنؤ میں مصحفی آیا جو میں دِلّی کو چھوڑ
یاں بھی اِس اِس آن کا عالم نظر آیا کہ بس

182

کر دیا ہے مجھ کو دو باتوں نے اس کی بے حواس حدرقیق القلب ہوں میں، کر اِسی سے تو قیاس
عیسیٰ مریم بھی اپنی سی بہت کچھ کر گیا پر دلِ بیمار کو کوئی دوا آئی نہ راس
حسن سے رکھتی ہے یہ انداز، جنگِ عشقِ شوخ دست بُرد اوّل تو پھر بعد اُس کے بوسہ، پھر مساس
قطرہ ہائے خوں ہیں گرد لختِ دل یوں چشم میں چُنّیاں[2] جیسے جڑی ہوویں نگیں کے آس پاس
کھل کھلا کر گل نہ ہنستا منھ پہ شبنم کے کبھو اے صبا ہوتا گر اس کو خاطرِ بلبل کا پاس
ایک شب سونگھی تھی میں نے اس کے سوندھے کی مہک خوش نہیں آتی مجھے اس دن سے ہرگز گل کی باس
جی میں آتا ہے کہ اُٹھ جاویں کسی صحرا کو ہم
ان دنوں اے مصحفی ہے شہر سے خاطر اُداس

1۔ خنیاگری = طوائف، گانے والی 2۔ چنّی = ہیرے کے چھوٹے ٹکڑے

ش

183

کس منہ سے ہم جہاں میں کریں آرزوے عیش
ایک غنچہ ہم کو یاں نہیں دیتا ہے بوے عیش

جیدھر نظر گئی رخِ غم ہی نظر پڑا
دیکھا نہ آنکھ کھول کے ہم نے تو روے عیش

سنتے نہیں کِسی کی حریفانِ بزمِ یار
واں بانگ ناؤنوش ہے یا ہائے وہوے عیش

رستے میں غم کے ہاتھ لگا دل، ہزار حیف
یہ جنس قیمتی نہ گئی چار سوے عیش

پھینکا ہے آسماں نے زبس سنگِ تفرقہ
ق
اِس مے کدے میں برسرِ جام و سبوے عیش

دستِ سُبو شکستہ ہے، اور جام اب تلک
لایا نہیں زباں پہ کبھی گفتگوے عیش

بزمِ جہاں سے اُٹھ گئے عیاش مصحفی
ہم ایک رہ گئے ہیں سو افسانہ گوے عیش

184

جس آنکھ کو ہو رخنۂ دیوار کی تلاش
پھر کیوں کرے وہ شاہدِ بازار کی تلاش

بلبل کی لاگ کا میں دوانہ ہوا، اُسے
کنجِ قفس میں ہے گل و گلزار کی تلاش

کیا ہوگا آفتاب قیامت میں، خلق کو
ہووے گی جب کہ سایۂ دیوار کی تلاش

اِس دستِ روسیاہ کا ہووے کہیں بُرا
رہتی ہے اس کو سادہ ہی رخسار کی تلاش

اے ابرِ نوبہار تو اب اس کے منہ نہ چڑھ
رنگیں ہے اپنے دیدۂ خوں بار کی تلاش

دل یک نگاہِ لطف کا رہتا ہے منتظر
بائع کو جس طرح ہو خریدار کی تلاش

اِتنا میں گُم ہوا ہوں سُخن میں کہ مصحفی
کرتا ہے ہر کوئی مرے اشعار کی تلاش

185

یا عہدِ وفا ہوا فراموش — یا بوجھ سمجھ کیا فراموش

آجائے ہے جب وہ سامنے سے — ہوجائے ہے سب گلہ فراموش

جب یاد ہے، اُس کے منھ سے نکلا — میں نے بھی وو ہیں کہا: فراموش[1]

دیکھا نہ سنا میں اب تلک تو — بندے کو کرے خدا فراموش

کیا ہووے کبھی گر اُس طرف بھی — ہوجائے رہِ صبا فراموش

اس کُو میں اگر ترا گذر ہو — کیجو نہ ہمیں صبا فراموش

جس خط میں لکھا تھا میں کچھ احوال — قاصد نے وہ خط کیا فراموش

نسیان ہے یاں تلک کہ خط میں — میں یاد کی جا لکھا فراموش

دل میں گذرا جو کوئی مضمون — لب تک آتے ہوا فراموش

جب لکھنے لگوں ہوں خط میں اُس کو — ہوجائے ہے مدّعا فراموش

کیا کیا نہ فراق ہم نے دیکھے ق — کیا کیا ہوئے آشنا فراموش

پر حیف ہے مصحفی کے دل سے
ہوتا نہیں غم ترا فراموش

ص

186

ہے دام میں زلفوں کے گرفتار کوئی شخص — اس کوچے میں آتا ہے شبِ تار کوئی شخص

لے جاؤں ہوں گذری[2] میں دل اپنا میں ہمیشہ — شاید کہ ہو اِس کا بھی خریدار کوئی شخص

1۔ فراموشی = قدیم زمانے میں بچوں کا ایک کھیل 2۔ گذری (اِسے سکون دوم سے باندھا ہے) = بازار میر نے بہ فتحِ اول بھی لکھا ہے: ہوتا ہے سرِ شام تماشا گذری کا

جب آپ نے غرفے سے نکالا تھا سر اپنا — کہتے ہیں کھڑا تھا پسِ دیوار کوئی شخص
ہر اک کو نہ تم نرگسِ بیمار دکھاؤ — کیا فائدہ ہو جائے جو بیمار کوئی شخص
ابرو کی یہ جنبش ہے تو کوچے میں تمھارے — تم دیکھو گے کھا جائے گا تلوار کوئی شخص
صنعاں[1] سے میں واقف نہیں، ترسا کی گلی میں — پھرتا تو ہے پہنے ہوئے زُنّار کوئی شخص
مت نام لو میرا، یہ کہو اُس سے عزیزو — کھینچے ہے ترے عشق میں آزار کوئی شخص
آؤں میں شبِ تیرہ ترے گھر میں، تو میرا — جی دھڑکے ہے، ہو جائے نہ بیدار کوئی شخص
ساقی کی نگہ نے یہ چھکایا[2] ہے کہ اب تک — اُس بزم میں ہرگز نہیں ہشیار کوئی شخص
اے مصحفی دردِ دلِ غم ناک کو میرے — اُس شوخ سے کرتا نہیں اظہار کوئی شخص

آتا ہے یہ اب جی میں کہ خط دے کے، بہ اجرت
ہشیار سا بھیجوں میں ہی ناچار کوئی شخص

187

دل فرش ہوا جائے ہے آغازِ شبِ رقص — یاں آگو ہی معلوم ہیں اندازِ شبِ رقص
کیا زیر و بم اُن کے کی ہے آواز برابر — یہ سازِ طلسمات ہیں، یا سازِ شبِ رقص
مانی، تو مرقّع تو ہمیں اپنا دکھا دے — ہم تجھ کو دکھا دیویں گے پردازِ شبِ رقص
ہم ماہ کا دیدہ ہے لگا اُس کی طرف کو — ہم چشمِ کواکب ہیں نظر بازِ شبِ رقص
دامن کو جھٹک کر جو وہ بیدرد گئی ہے — جاتا نہیں آنکھوں سے مری نازِ شبِ رقص
گانے سے حیا کیوں اُسے پھر بزم میں آوے — ہو نالہ مرا جس کا ہم آوازِ شبِ رقص

یہ جلوہ گری ہوتی ہے کیا پردۂ شب میں
اے مصحفی ہم پر نہ کھلا رازِ شبِ رقص

1۔ صنعاں = ایک روایتی کردار جو اپنے دین سے ہٹ گیا تھا

2۔ چھکانا = خوب سیراب کر دینا

ض

188

ہوتا ہے حسنِ رُو سے ترے آرسی کو فیض　بہتر تو ہے کسی سے جو پہنچے کسی کو فیض
تربت پہ میری رکھ کے قدم اُس نے یوں کہا:　نقشِ قدم سے اپنے ہوا ہے اسی کو فیض
ہے گو کہ آفتابِ حقیقت نقاب میں　نزدیک و دور پہنچے ہے اس سے سبھی کو فیض
بوسہ لیا جو میں ترے لب کا، تو کیا ہوا　ہوتا ہے آدمی سے میاں آدمی کو فیض
اک عمر لکھنؤ میں رہا یہ، ولے تباہ
اِن منعموں سے کچھ نہ ہوا مصحفی کو فیض

189

نہ مسیحا کو دکھایا جگرِ ریش غرض　ہم کو آئی نہ کسی سے کبھی درپیش غرض
در پہ اپنے مجھے دیکھا جو کئی بار، کہا　سخت مُبرم[1] نظر آتا ہے یہ درویش غرض
کیا کریں شکوۂ روزی کہ فلک کے ہاتھوں　رزق ہم کو بھی پہنچتا ہے کم و بیش غرض
کیوں ترے سامنے ہم اپنا بھرم بھی کھودیں　تجھ سے نکلے ہے کسی کی بتِ بدکیش غرض
رنج و راحت سے ہیں اے مصحفی جو مستغنی
نوش سے کام ہے کچھ اُن کو نہ بانیش غرض

190

کیوں نہ اب مژگاں سے دیکھے تیغ اور خنجر کی عرض　دیکھنے بیٹھی ہے وہ چشمِ سیہ لشکر کی عرض[2]
طبلقیں[3] کھولے ہوئے مستوفیِ[4] بادِ بہار　دیکھتا ہے لالۂ صد برگ کے، دفتر کی عرض

1۔ مُبرم = پیچھا کرنے والا 2۔ لشکر کی عرض = فوج میں ہر ایک کا چہرہ لکھا جاتا تھا اور اُس کی چیکنگ ہوتی تھی 3۔ طبلق = دیوان کا بستہ، رجسٹر 4۔ مُستوفی = نگراں کا عہدہ

پر نہیں میرے، نہیں تو اُڑ کے آتا باغ تک — اے صبا کیجو یہ گُل سے بلبل بے پر کی عرض
دوشِ ہستی پر گراں ہوں، مجھ کو اب آزاد کر — خدمتِ شمشیر میں یہ ہے ہمارے سر کی عرض
اے فلک چاہیں ہیں سر پوشی کو اک دستار وار — تجھ سے ہم رکھتے نہیں کچھ تاج اور افسر کی عرض
مرغ بے پرواطبیعت نے نہ بات اُس کی سنی — شاہدِ گُل دے رہا کتنے زر و زیور کی عرض

ہستیِ اعراض کا، ہے ذاتِ جوہر سے قیام
مصحفی پروانہ رکھے کس طرح جوہر کی عرض[1]

191

گنتا تھا بس کہ اپنے تئیں خاکسارِ محض — آخر ہوا میں راہ میں اُس کی غبارِ محض
دعویٰ برابری کا نہیں تم سے کچھ مجھے — بندے کو اپنے جانیے خدمت گذارِ محض
مدّت کے بعد ہم کو غمِ دل کا آشنا — اک تُو ملا ہے، سو بھی تغافل شعارِ محض
کیا تجھ سے اختلاط کا دعویٰ کریں کہ یاں — پہلو میں ایک دل ہے، سو ہے بے قرارِ محض
اک دن دکھا گیا تھا جھلک اپنی، اب تلک — دریا برنگِ آئینہ ہے انتظارِ محض
عاشق کا اعتبار ہی کیا اُس کے روبرو — عاشق کو جانتا ہے وہ بے اعتبارِ محض

تم ہی کرو اعانتِ اوقاتِ مصحفی
اس روزگار میں ہے وہ بے روزگارِ محض

ط

192

عیش کہاں کدھر نشاط، کہتے ہیں کس کو انبساط — خواب و خیال ہوگیا ہم کو تو عیش اور نشاط
آنکھیں سلا کے آؤں گا، اب تری بزم میں کہ ہائے — دیکھوں میں تجھ کو کس طرح غیر سے گرم اختلاط

1۔ جوہر کے مقابلے میں عرض بہ فتح دوم آتا ہے، مصحفی نے ضرورتِ شعری میں سکون سے باندھا ہے

جان و دل اُس کو ہم نے تو پہلے ہی چاہ میں دیا　آگوہی نذر کر چکے اپنی جو کچھ کہ تھی بساط
جوشِ جنوں کے ہیں یہ دن، جاویں نہ سوے کوہ و دشت　چاہیے اپنی ہم کریں موسمِ گل میں احتیاط
عرصہ میں شاہ سیکڑوں آئے ہیں اِس زمین پر　رزم رہی ہے درمیاں، جب سے بچھی ہے یہ بساط
داغ کہن کو تازہ پھر کرتے ہیں ہائے ہم نشیں　یاد جب آئے ہیں ہمیں اُس کے قدیم ارتباط

شب سے زیادہ مصحفی رہنے کا اس میں کیا ہے لطف
دہر ہے اک کہن سرا، چرخ ہے اک کہن رباط

193

حسن نے بھیجا ہے لکھ، لعلِ شکر خا کو خط　لکھیں گے اِس درد کا ہم بھی مسیحا کو خط
روزِ جدائی کیے اس نے تو دفتر سیاہ　تم نے بھی لکھا کبھی عاشقِ رسوا کو خط
مزرعِ دل، سوختہ گو کہ تو ہے، غم نہ کھا،　دیدۂ تر نے مرے لکھا ہے دریا کو خط
طوقِ گلو ہوگئی میرا، وہ زنارِ زلف　جوں مئے کم دے گئی گردنِ مینا کو خط
اُس کی کجی اب تلک ہم سے نہ یک مو گئی　ہم نے مکرّر لکھا زلفِ چلیپا کو خط
آج دیا چاہے ہے دستِ جنوں تیرے ہاتھ　چاک گریباں مرا، دامنِ صحرا کو خط

کام کسو سے ہے کیا، وہ جو ہیں اہلِ کمال
لکھتے ہیں کب مصحفی مردمِ دنیا کو خط

194

کیا لکھے اُس کے تئیں اب کوئی ہم سار[1] کا خط　ہائے پڑھتا ہے وہ کب اپنے گنہ گار کا خط
ہم نے یک بار ترے زخمِ ستم جھیلے ہیں　کون سا عضو ہے جس پر نہیں تلوار کا خط
یوں ہے یک دَورِ فلک مرکزِ عالم کا محیط　گرد نقطے کے ہو جس طرح کہ پرکار کا خط
بس کہ خطرے سے تری خو کے نہ بھیجا اُس نے　زیرِ بالیں ہی رہا نت ترے بیمار کا خط

1۔ ہم سار کا = ہمارے جیسا

اے نسیمِ سحر، یک لختِ جگر لیتی جا سوے گلشن، کہ یہ ہے مرغ گرفتار کا خط

شکوہ کیوں کر میں تمھارا نہ کروں اے مشفق ق آ گیا ہاتھ جو اک دن مرے اغیار کا خط

لے کے قاصد سے، بہت شاد ہوا میں جی میں یہ سمجھ کر، مجھے آیا ہے مرے یار کا خط

کھول کر اُس کو جو دیکھا تو ہر اک سطر میں واں تھا مرے قتل کا مضمون، کہ تلوار کا خط

آپ کو اس کا جو باور نہ ہو تو دکھلا دوں اب تلک کیسے[1] میں موجود ہے سرکار کا خط

خطِ اغیار سے، مکتوب بنایا اُس نے

طاق نسیاں پہ رہا مصحفیِ زار کا خط

ظ

195

گل پھول کی خوشی رہی سرو و سمن کا حظ اب کی صبا نے خوب اُڑایا چمن کا حظ

پروانہ پائے شمع کہے تھا یہ بزم میں تھا پائے بوسِ شمع تلک بس لگن کا حظ

آپس میں ساری رات رہیں بوسہ بازیاں لُوٹا ہے میں نے خوب تمھارے دہن کا حظ

دلّی کی قدر، دِلّی سے نکلے پہ ہوئی ہمیں غربت میں یاد آئے ہے، سچ ہے، وطن کا حظ

کیوں کر ملوں نہ ہاتھ، کہ شانے نے ساری رات لوٹا ہے اُس کی زلف کی ہر اک شکن کا حظ

پہنچے تھا ہاتھ تا بہ گریبانِ گل مرا تھا موسمِ بہار میں دیوان[2] پن کا حظ

بخت ان کے ہیں جو سوکے ترے ساتھ لے گئے گہہ پیرہن کا لطف تو گاہے بدن کا حظ

محظوظ کیا ہو سن کے کوئی اب کسی کے شعر تھا ہم تلک ہی بزمِ جہاں میں سخن کا حظ

تنہا چمن میں جا کے، میں غم دیدہ کیا کروں

بن یار، مصحفی نہیں سیرِ چمن کا حظ

1۔ کیسے میں (کیسہ بمعنی جیب) بروزن جی سے 2۔ دیوان پن، بجائے دیوانہ پن یہ بھی روزمرہ ہے

196

نکل گیا مرے منھ سے کہیں خدا حافظ
تو بولا ہو کے وہ چیں بر جبیں، ''خدا حافظ!''

چراغِ صبح ہوں، اب تجھ سے میری رخصت ہے
چلا میں بزم سے بے آستیں[1] خدا حافظ

تو ہے وہ فتنۂ روے زمیں کہ دیکھ تجھے
ہمیشہ کہتے ہیں اہلِ زمیں: خدا حافظ

چلا ہے آج تو سیرِ چمن کو گرما میں
ترے بدن کا ہے اے نازنیں خدا حافظ

یہ جتنے بندے ہیں سب کا کوئی ہے پشت و پناہ
جو غور کیجیے تو کس کا نہیں خدا حافظ

صنم وہ کافرِ خوں خوار مصحفی کا ہے
کہ جس کو دیکھ کہیں اہلِ دیں خدا حافظ

197

یوں وہ بتِ کافر ہے دلِ زار سے محظوظ
صیّاد ہو جوں مرغِ گرفتار سے محظوظ

ہم اک نگہِ دور کو رہتے ہیں ترستے
آئینہ ہے خال و خط و رخسار سے محظوظ

شمشیرِ اجل کو بھی سراہا نہیں اُس نے
جو کشتہ ہوا ہے تری تلوار سے محظوظ

اے گل[2] ابھی جانے کا نہ کر قصد چمن سے
نرگس ہے تری نرگسِ بیمار سے محظوظ

اس شوخ کی یارو یہ طبیعت ہے کہ دو دن
دو چار سے ناخوش ہے تو دو چار سے محظوظ

ہم موے کمر کو ترے زنّار کریں گے
کافر ہے اگر رشتۂ زنّار سے محظوظ

اے مصحفی جیتا رکھے حق تجھ کو بہت سا
کیا رات ہوئے ہیں ترے اشعار سے محظوظ

1۔ آستیں سے ہوا دے کر چراغ بجھاتے ہیں، چراغ صبح خود ہی بجھ جائے گا!

2۔ یہاں گل محبوب ہے اور نرگس بیمار اُس کی آنکھ ہے

ع

198

پردۂ فانوس میں یوں تو نہاں جلتی ہے شمع
دل جلے ہے جس طرح میرا، کہاں جلتی ہے شمع

چشمِ تر سے یوں نمایاں ہے فروغِ داغِ دل
جیسے پانی میں کبھو اے مہرباں جلتی ہے شمع

تو جو مجلس میں نہیں ہوتا تو پیارے تجھ بغیر
بوے بد دیتی ہے، اور جوں استخواں جلتی ہے شمع

ضبطِ سوزِ عشق کوئی اُس سے آ کر سیکھ لے
اِس زباں پر دیکھیو کیا بے زباں جلتی ہے شمع

لائے ہے جلنے کو پروانے کے واں خاطر میں کون
آگ کا شعلہ لیے سر پر جہاں جلتی ہے شمع

اُس کے جلنے میں عجب آہستگی ہے دیکھیو
آفریں اُس کو، بطورِ عاشقاں جلتی ہے شمع

کس کی طاقت ہے کہ لاوے لب تلک یاں آہِ گرم
یہ وہ مجلس ہے کہ جس میں بے دُخاں جلتی شمع

سبزۂ خط ہو سکے ہے حسن کا روپوش کب
پردۂ فانوسِ مینا میں عیاں جلتی ہے شمع

گریہ سوزِ دل پہ عاشق کو روا ہے مصحفی
دیکھ دیوانے، بچشمِ خوں فشاں جلتی ہے شمع

199

ساتھ پروانے کے راتوں کو جلا کرتی ہے شمع
بے وفا کیوں کر کہوں، اس سے وفا کرتی ہے شمع

کِس کا غم اُس کو لگا ہے نہیں معلوم مجھے
اشک ریزاں ہی سحر تک جو رہا کرتی ہے شمع

مر رہے ہے جو لگن بیچ کوئی پروانہ
دیکھ اُس کو کفِ افسوس ملا کرتی ہے شمع

میں وہ اندوہ بھرا ہوں کہ مری مجلس میں
بیٹھتی ہے جو کبھو رو کے اُٹھا کرتی ہے شمع

کون اس بزم میں آیا ہے یہ معلوم نہیں
کس سے فانوس کے پردے میں چھپا کرتی ہے شمع

طرفہ صحبت ہے کہ پروانے جو کرتے ہیں ہجوم
اُن کی بے تابی کے عالم پہ ہنسا کرتی ہے شمع

یاد میں ساعدِ سیمیں کی ترے شب تا صبح گرمیِ شوق سے پانی ہو بہا کرتی ہے شمع
حسن چھپتا نہیں اس پر بھی تو اس کافر کا گرچہ فانوسِ بلوریں میں رہا کرتی ہے شمع

مصحفی میں تو وہ پروانۂ دل سوختہ ہوں
جس کے جلنے سے پگھل کر کے بنا کرتی ہے شمع

200

لے گیا پروانہ دل میں حسرتِ دیدارِ شمع سرد ہو جاوے الٰہی گرمیِ بازارِ شمع
دیکھیو کیا صبح کا نزدیک پہنچا ہے طلوع دم بدم ہوتی ہے افزوں زردیِ رخسارِ شمع
کیوں نہ وہ مجلس میں آوے باشکوہِ سروری شعلہ طرّہ ہے تو داغِ شعلہ ہے دستارِ شمع
دیدۂ بیدار میرا شب خیالِ یار میں اشک ریزاں ہی رہا جوں دیدۂ بیدارِ شمع
جلتے جلتے آپ کو یک بار کر دینا تمام کیا پسند آئے ہے یہ میرے تئیں رفتارِ شمع
تار ہیں میرے گلے میں کچھ گریباں کے، سو وہ سب کہیں ہیں قابلِ آتش ہیں جوں زنّارِ شمع

ہر کوئی ہوتا ہے واقف کب زبانِ حال سے
کون جز پروانہ سمجھے مصحفی گفتارِ شمع

201

اک آن میں حقِ[1] خدمت ہوا مرا ضائع کرے کسو کی نہ محنت کے تئیں خدا ضائع
کسو کو دے کوئی پتّا تو کام بھی آوے کرے ہے باغ میں پھولوں کو کیوں صبا ضائع
دلِ شکستہ مرا یار تک نہ پہنچا ہائے ہوئی اس آئینے کی مفت میں صفا ضائع
طبیب لکھ تو نہ اس کے مریض کو مطبوخ[2] وہ پینے کا نہیں، ہو جائے گی دوا ضائع

خبر ہے تجھ کو بھی کچھ مصحفی کی یا کہ نہیں
کہیں ہیں اس نے شب اپنے تئیں کیا ضائع

1۔ حق بدونِ تشدید 2۔ مطبوخ = وہ دوا جو پکا کر تیار کی جائے

202

ہے تو تو وہ نقشِ قلم قدرتِ صانع جس نقش میں جھمکے ہے پڑی قدرتِ صانع
گر دیکھے تو سیرِ چمن ندرتِ صانع سو رنگ ہیں نقشِ قلم قدرتِ صانع
ہے تو تو رعونت شکنِ مانی و بہزاد نقشے میں ترے نکلے ہے اک قوتِ صانع
جس نے کہ مرے چہرے کو دیکھا، یہی بولا اس صنع کے اوپر ہے بجا حسرتِ صانع
صانع کی ترے حسن سے ہرگز نہ چھکے آنکھ[1] گر حائلِ نظارہ نہ ہو حیرتِ صانع
ہیں مائلِ نظّارہ ترے گبر و مسلماں کیا جانیے کیا ہوگئی ہے غیرتِ صانع
کس عضو کی تعریف کروں کون سی جا گہ ق مصروفِ غوامض[2] نہ ہوئی ہمّتِ صانع
بازو ہی ترے گول بنائے نہیں اُس نے نکلے ہے سراپا سے ترے قوت صانع
اے مصحفی گر دیکھے کوئی اُس کا سراپا
ہر عضو سے ٹپکے ہے پڑی فطرتِ صانع

غ

203

ہے مرے سینے میں روشن داغِ فرقت کا چراغ گُل نہ ہو ہرگز الٰہی یہ محبت کا چراغ
بے نشاں اب ہوگیا ہوں میں، وگرنہ پیش ازیں تھا ترا نقشِ قدم ہی میری تربت کا چراغ
داغ دے دل کو، لیے پھرتا ہوں سب کے سامنے میں نے اب اِس کو بنایا ہے زیارت کا چراغ
ہوتی ہے مشکوے[3] شاہاں میں سخا سے روشنی روسیہ اُس گھر کا جس میں ہو نہ ہمّت کا چراغ
دل ہے یا بیت الحزن[4] ہے جس میں اے گُل تجھ بغیر شام سے لے صبح تک روشن ہے حسرت کا چراغ

1۔ آنکھ چھکنا= سیر چشم ہونا، بھرپور نظارہ 2۔ غوامض =باریکیاں، جزئیات

3۔ مشکوے شاہاں= شاہوں کا دربار 4۔ بیت الحزن = ماتم کدہ

دیدۂ گریاں نے روغن اشک کا ڈالا وو ہیں | داغ ہو کر جب جلایا دل نے الفت کا چراغ
احتیاجِ شمع کیا ہے مصحفی اپنے تئیں
ہے دلِ پُرسوز اپنا کنجِ خلوت کا چراغ

204

کون کرے سیرِ باغ، کس کو ہے اتنا دماغ | چاہیے دل کو فراغ، تب ہو کہیں سیرِ باغ
ہاتھ پہ ساقی کے ہوں، کیوں نہ نظر دوختہ | دل کو مرے لے گئی گردشِ چشمِ ایاغ
داغِ محبت جسے کہتے ہیں سب اہلِ درد | دھوئے سے جاتا ہے کب، ہے یہ بھلا دیں کا داغ
دیکھ کے تیری کمر، کھوئے گئے ہیں زبس | منزلِ عنقا سے ہم کرتے ہیں اپنا سراغ
وقت خوش اُن کا جو لوگ، چھوڑ کے یہ خاکداں | کنجِ لحد کے تئیں سمجھے ہیں کنجِ فراغ
حال یہ سرکاروں کا اب کے امیروں کی ہے | دیگچے بیکار ہیں، سرد پڑے ہیں اُجاغ
سیرِ چمن سے مجھے کام ہے کیا مصحفی
ہے دلِ پُر داغ ہی حق میں مرے خانہ باغ

ف

205

ابر کیوں کر ہو سکے اس چشمِ گریاں کا حریف | جس کا ہر اک قطرہ ہے آشوبِ طوفاں کا حریف
فصلِ گل آنے سے کیسا یہ ستم مجھ پر ہوا | ہاتھ میرا ہو گیا میرے گریباں کا حریف
کارخانے میں خدائی کے نہیں انساں کو دخل | مورچہ ہو جاوے ہے، دم میں سلیماں کا حریف
ہاتھ میرا ہی رہے تھا شانہ کش دن رات ہائے | شانہ تھا کس روز اُس زلفِ پریشاں کا حریف
یہ ستم آنکھوں سے اپنی ہائے کیوں کر دیکھیے | غنچہ اس منہ پر ہو اُن لب ہائے خنداں کا حریف
آشنائی کا کسی سے کیجیے کیا اعتبار | دم میں ہو جاتا ہے یاں انساں ہی انساں کا حریف

کیوں عبث کھیلا ہے اپنی جاں پر تو اے تدرو[1]		ہو نہیں سکنے کا اُس سروِ خراماں کا حریف
رخ سے تیرے حسنِ یوسف ہے مقامِ عجز میں		ذرّہ کیوں کر ہو سکے خورشیدِ تاباں کا حریف
روشنی کچھ اور ہے اور خوبروئی اور ہے		ہو سکا ماہِ فلک کب ماہِ کنعاں کا حریف
رات دن گردش میں ہے، پر ہو نہیں سکتا ہنوز		دَور دامانِ فلک اس دَورِ داماں کا حریف

مصحفی کچھ تشنۂ خوں اُس کا پیکاں ہی نہیں
دل بھی ہے پہلو میں میرے اُس کے پیکاں کا حریف

206

اُس نے جس دن سے کیا آنکھ لڑانا موقوف		ہو گیا ہم سے بھی اُس کوچے کا جانا موقوف
کششِ عشق نہ ہو کیوں کے زیادہ، کہ کیا		اُس نے جالی سے بھی دیدار دکھانا موقوف
پردۂ شرم و حیا جب کہ دیا ہم نے اُٹھا		آخر اُس نے بھی کیا منھ کا چھپانا موقوف
دیکھ لے گا جو کوئی تم کو تو پھر مشکل ہے		کیجیے ازبہرِ خدا بام پر آنا موقوف
میری تربت کا نشاں جب سے ملا، ظالم نے		خاکِ تودہ[2] پہ کیا تیر لگانا موقوف
چال اُٹھکیلی کی تم سے نہ گئی، کیا کہیے،		نہ ہوا ہم سے غریبوں کا ستانا موقوف

مصحفی موسمِ گل دن ہیں جنوں کے ناداں
ان دنوں کیجیے گریباں سلانا موقوف

ق

207

عشق کیا ہے، تباہیِ عاشق		شرح اوقات واہیِ عاشق
کتنا تاثیر سے پڑا ہے دور		نالۂ صبح گاہیِ عاشق

1۔ تدرو = چکور 2۔ تودہ = ریت کا ڈھیر جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی تھی

غازۂ روے خوبرویاں ہے عشق، اے روسیاہیِ عاشق
تیری آنکھیں ہوئی ہیں کیا ہی خجل دیکھ کر کم نگاہیِ عاشق
کوئی آیا نہ محکمے کے بیچ ہائے بہرِ گواہیِ عاشق
روزِ محشر پر اب رہی موقوف
مصحفی دادخواہیِ عاشق

ک

208

نادار ہوئے ہیں ہم یہاں تک مقدور نہیں ہمیں فغاں تک
کوئی ضبطِ نفس کرے کہاں تک آتش ہے جگر سے اک زباں تک
اے آہِ سحر میں تجھ کو دیکھا اک دن نہ گئی تو آسماں تک
اب ہم سے ضعیف و ناتواں کو پہنچاوے ہے کون کارواں تک
اب وہ جو گئے تو رہ گئے ہم طاقت تھی بدن میں ہمرہاں تک
صیاد، تو چھوڑ تو، چمن میں جاویں گے نہ اُڑ کے آشیاں تک
بلبل کی دعا ہے یہ کہ یا رب ق مجھ کو نہ جلائیو، خزاں تک
کھانے کو مرے، فلک کے ہاتھوں اک خونِ جگر ہے، سو کہاں تک
اس رُت میں جو چھوٹ کر نہ پہنچوں جیتے جی اپنے آشیاں تک
پھونچائیو مشتِ پر کو میرے اے بادِ صبا تو گلستاں تک
اے آتشِ عشق، شمع آسا ق حاضر ہوں میں تجھ سے جسم و جاں تک
پر کام نہ مصحفی کا پہنچے
اس بزم میں داغِ امتحاں تک

209

یہ زلف سیہ روکشِ زنجیر ہے اب تک — آنکھوں پہ مری عالمِ تصویر ہے اب تک
یاں حسرتِ دل خوں میں ہوئی خاک بسر ہے — واں یار و مرے قتل کی تدبیر ہے اب تک
عالم میں نہیں ایک کہ سر جس کا رہا ہو — وہ تُرکِ نگہ دست بہ شمشیر ہے اب تک
ہر چند کہ ملتا تو نہیں اُس سے میں برسوں ق — پر دل میں مرے دہشتِ میرؔ ہے اب تک

کس واسطے اے مصحفیؔ وہ خسروِ معنی
با لُطفِ زباں برسرِ تقریر ہے اب تک

210

چہرے پہ نازکی سے ہے جوشِ شکست رنگ — یہ تازہ گل ہے لالہ فروشِ شکستِ رنگ
کہتی ہے خلق رخ پہ ہے جوشِ شکست رنگ — حاشا، کہ مجھ کو کچھ بھی ہو ہوشِ شکستِ رنگ
فندق[1] اگر یہی ہے تو جاوے گا تا فلک — ہر برگِ گل سے آج خروشِ شکستِ رنگ
دیکھا ہے گرم کس نے، جو رخسار پر ترے — جوشِ عرق کے ساتھ ہے جوشِ شکستِ رنگ
بے جنبشِ زباں ہی ترانے کو درد کے — پہچانتے ہیں نغمہ نیوشِ شکستِ رنگ
رکھتا ہے عضو عضو مرا دردِ یار سے — برگِ خزاں کی طرح خروشِ شکستِ رنگ
کل روپ اُن کا دیکھیو، چہرے جو آج ہیں — کاہش سے غم کی، جلوہ فروشِ شکستِ رنگ
گذرے گا بزمِ غیر میں جو تم پہ شب، سحر — آ کر ہمیں کہے گا سروشِ شکستِ رنگ
ٹوٹا ہے دل کسی کا اس آہستگی کے ساتھ — پہنچی صدا نہ جس کی بہ گوشِ شکستِ رنگ

1۔ فِندق = اُنگلی کے پورے، مجازاً

اتنا میں تنگِ ضعف ہوا ہوں کہ مصحفی
ہستی مری گراں ہے بدوشِ شکستِ رنگ

ل

211

آئینہ ہو کیا اُس رخِ زیبا کے مقابل　　مہ ہو نہ سکے جس کے کفِ پا کے مقابل
ہر چند کہ نظروں سے تو غائب ہے ہمیشہ　　نقشہ ہے مرے دیدۂ بینا کے مقابل
افسوس کہ یارو مجھے اِس دل نے کیا ہے　　اک ظالم خوں خوار کے لے جا کے مقابل
دل نام جو یک قطرۂ خوں، بر میں ہے میرے　　دن رات رہے ہے صفِ اعدا[1] کے مقابل
آ جایئے رونے پہ تو ہر ایک مژہ سے　　دریا ہی رواں کیجیے دریا کے مقابل
دنیا طلب اس بات سے غافل ہیں صد افسوس　　اور پرورشِ دین ہے دُنیا کے مقابل
ہر چند کہ دل غنچۂ تصویر ہے میرا　　پر وسعتِ دل اپنی ہے صحرا کے مقابل
ہے عید کا دن، آج تو لگ جاؤ گلے سے　　جاتے ہو کہاں جان مری آ کے مقابل
ہر چند زلیخا کی وہ آنکھیں نہیں، تو بھی　　تصویر ہے یوسف کی زلیخا کے مقابل
ہوتے ہیں دلِ مردہ مرے شعر سے زندہ　　یہ سحر ہے اعجازِ مسیحا کے مقابل

کیا تاب ہے جو سنبلِ گلزارِ ارم ہو
اے مصحفی اُس زلفِ چلیپا کے مقابل

212

ہے گرفتاریِ دل باعث بیماریِ دل　　ہوں نہ بیمار میں، گر ہو نہ گرفتاریِ دل
مثلِ زنجیر گرہ اُس میں پڑی ہیں لاکھوں　　بسکہ وہ زلف ہے زحمت کش بسیاریِ[2] دل

1۔ مژگانِ یار کو صفِ اعداء سے تشبیہ دی ہے　2۔ یعنی بہت سے دل اُس میں اٹکے ہوئے ہیں

زخمِ دل روبہ شفا ہے، کہ ہوا ہے آکر — زنگ پیکاں کا ترے، مرہم زنگاریِ دل
اس کے کوچے میں دل اپنے کو میں شب کھو آیا — کیا کہوں ہو نہ سکی مجھ سے خبرداریِ دل
کیا بیاں اُس کا کروں میں، مجھے شرم آتی ہے — عشق میں تیرے ہوئی جان جو کچھ خواریِ دل
فائدہ کچھ نہیں، بس دل میں سمجھ لے اپنے — پوچھ مت مجھ سے میاں، موجب بیزاریِ دل
میں تو جاتا ہوں چلا، نالہ یہ کہہ کر کیجو — تجھ سے اے آہ اگر ہووے ہواداریِ دل

مصحفی اُس کو میں سرگرمِ وفا پاتا ہوں
ان دنوں کچھ تو ہوا ہے اثرِ زاریِ دل

213

کیا شوق میں ہیں نعرہ زناں قمری و بلبل — اے کاش سنیں میری فغاں قمری و بلبل
بہتر ہے تمھارا ابھی جو آنا ہو، کہ شب یاں — ہے مجمع آتش نفساں قمری و بلبل
کیا کرتی ہو، آتا ہے وہ گل سیرِ چمن کو — ٹک بند کرو اپنی زباں قمری و بلبل
آنے سے خزاں کے نہ رہا باغ میں کوئی — کیدھر ہے گل و سرو، کہاں قمری و بلبل
اے سروِ رواں، غنچہ دہاں، یاد میں تیری — رہتی ہیں ہمیشہ نگراں قمری و بلبل
صیّاد ذرا دیکھیو اِس باغ میں ہر سو — کیا پھرتے ہیں پرواز کناں قمری و بلبل
جو کچھ کہ صنوبر نے کیا گل سے، وہ قصہ — کرتی ہیں بہت خوب بیاں قمری و بلبل

اے مصحفی لے جا کے مرے شعر تو پڑھیو
ہوں زمزمہ پرداز جہاں قمری و بلبل

214

دن رات ہیں میرے دل کے دُنبال[1] — صدقے مَیں، ترے گھنے گھنے بال
پھر زلف کے پیچ میں پھنسا ہوں — پھر عشق ہوا ہے جی کا جنجال

1۔ دُنبال = پیچھے

کرتے ہی نہیں وفا جو خوباں شہر اُن کے میں کیا وفا کا ہے کال
صدقے میں ترے، نہ مَہ نے پایا یہ حسن، یہ چہرہ، یہ خط و خال
جی جاؤں میں اے مسیحِ دلہا ق گر رحم ہو تجھ میں نیم[1] مثقال
غافل نہ مری طرف سے رہنا بیمار ہوں تیرا، خستہ احوال
اے مصحفی ہے زمیں یہ آسان
تو ایک غزل تو اور لکھ ڈال

215

عالم کو کیا ہے تو نے پامال عالم سے جُدی[2] ہے کچھ تری چال
آزاد کیا قفس سے مجھ کو ق صیاد نے کرکے بے پر و بال
انصاف کرو، کوئی تو یارو کس طرح اُڑوں میں خستہ احوال
تعویذ بنا رکھوں میں لے کر ہاتھ آوے گر اُس کی زلف کا بال
سب یار چلے گئے، میں تنہا سر ماروں ہوں، کارواں کے دنبال
کب لب سے ترے ملے مرے لب ق مجھ کو تو یہ آرزو ہے اشکال[3]
یہ بس ہے کہ منھ سے منھ ملا دے حقّے کی ترے صنم یہ منہنال[4]
ہے ایک تو قہر چمپئی رنگ تس پر یہ غضب ہے کیسری شال
پونچھا ہے جو میں نے اشکِ خوں کو ہوگئی ہیں مری ہتھیلیاں لال
فرقت میں تری گذرتی ہے یاں ایک ایک ساعت برابرِ سال
بالوں نے تیرے سر پہ میرے ق مارا ہے عجب طرح کا اک جال
جس سے نہ تجھے ہی ہے رہائی نے میرے ہی جی کا جائے جنجال

1۔ نیم مثقال = آدھا مثقال، (ایک چھوٹا سا وزن، جیسے رتّی بھر) 2۔ جُدی = جُدا، (عوامی بولی)
3۔ اِشکال (بکسر اول) بجائے مشکل (عوامی بولی) 4۔ مُنہنال (منھ + نال) حقہ کا وہ حصہ جسے منھ میں لے کر کش لگاتے ہیں

کیوں کر نہ میں ماہِ نو کو دیکھوں دیتا ہے کسی کے یاد خلخال[1]
خوں اس کا ہدر[2] کیا میں تجھ کو ق یہ بات نہیں ہے اتنی اشکال
گر قتل ہے مصحفی کا منظور
کیا دیر ہے اس میں اُٹھیے، فی الحال

216

دل میں جب عشق کی اُٹھی ہے سول[3] ق شعر کہنا بھی میں گیا ہوں بھول
منھ سے نکلے ہے گر کوئی مصرع شعر بھی کیا ہوئے ہے اول جلول
بے حواسی میں سب فرامُش ہیں یاد تھے جتنے شاعری کے اصول
مجھ کو شاعر نہ اب کہو، مجھ میں عشق کے دیونے کیا ہے حلول
تب تو دیوانہ دار بکتا ہوں تب تو کہتے ہیں لوگ مجھ کو فضول
گرچہ میں جانتا ہوں یہ کہ نہیں رشک و حسرت سوا کچھ اس میں حصول
لیک میں کیا کروں جو خسروِ عشق خود کرے آ کے مُلکِ دل میں نزول
دیکھ کر وصل و ہجر کا عالم کبھی خوش ہوں تو پھر کبھی ہوں ملول
آہ کے بال و پر جلیں ہیں وہاں دل کی خواہش ہے درمیاں میں رسول
یوں تو ہیں گلستانِ گیتی میں ق اور بھی رنگ رنگ کے گُل پھول[4]
پر میں کیا جانوں کیا ادا ہے کہ وہ مجھ سے کرتی ہے اشکِ خوں کو وصول
مصحفی دیکھوں ہووے کیا انجام
اب تو ذلت کو میں کیا ہی قبول

217

تھا آپ ہی دیوان مرا نامۂ اعمال کاہے کو فرشتوں نے لکھا نامۂ اعمال

1۔ خلخال = گھونگھرو، پازیب 2۔ ہدر = معاف کرنا، قصاص کا دعویٰ چھوڑنا
3۔ سول = کسک، ٹیس 4۔ گُل پھول = یہ روز مرہ ہے

اے آہ اثر دیکھ لیا بس میں ترا بھی | یک روز نہ آتش میں جلا نامۂ اعمال
نامے کو ہوا دے کے مرے، یوں وہ کہے ہے | جاتا ہے کسی کا یہ اُڑا نامۂ اعمال
آنکھوں سے مری شب جو گرے اشکِ ندامت | پانی میں طرح کف کی، بہا نامۂ اعمال
کیا دے ہے فرشتوں کے تئیں خفیہ نویسی | جو خفیہ وہ لکھتے ہیں مرا نامۂ اعمال
ہے شورِ جنوں موجبِ آمرزشِ مجنوں | یاں ساتھ گریباں کے پھٹا نامۂ اعمال
کیا روزِ قیامت ہے جو کوچے میں بُتاں کے | اُڑتا ہوا پھرتا ہے مرا نامۂ اعمال
پڑھتا نہیں یوں خط کو مرے وہ بُت کافر | جوں عاصی سے جاوے نہ پڑھا، نامۂ اعمال
جب روزِ قیامت مجھے اُس رُخ نے دکھایا | لا ہاتھ میں زلفوں نے دیا نامۂ اعمال
کیا فائدہ رکھتا ہے گنہ گار کا جینا | جوں جوں کہ بڑھی عمر، بڑھا نامۂ اعمال

اے مصحفی اس اشکِ پشیمانی سے اپنے
افسوس کہ دھویا نہ گیا نامۂ اعمال

218

چمنِ دہر میں غم ناک ہیں ہم اور بلبل | مثلِ گل بادلِ صد چاک ہیں ہم اور بلبل
آتشِ گل کا بھڑکنا جو یہی ہے تو نسیم | ایک دن دیکھیو تو خاک ہیں ہم اور بلبل
بوسۂ عارضِ گل کیونکے دلیرانہ نہ لیں | شیوۂ عشق میں چالاک ہیں ہم اور بلبل
نسبتِ عشق ہے آپس میں ہماری بھی درست | آشنائے نظرِ پاک ہیں ہم اور بلبل

اپنے معشوقوں کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں
مصحفی عاشقِ بے باک ہیں ہم اور بلبل

219

مزا ہے ہووے گر چپکے ہی چپکے مدّعا حاصل | کسی نے کر لیا معلوم رازِ دل تو کیا حاصل
مری نظارہ[1] گہ میں آ کے گر دشمن مرا بیٹھا | کیا نظارہ میرا، اس میں اس کو کیا ہوا حاصل

1۔ نظارہ گہ = دیکھنے کی جگہ

رکھا سر کاٹ کر قاتل نے میرا نوکِ نیزہ پر | ہوا بعد از شہادت کے مجھے یہ مرتبہ حاصل
اجل بھی سامنے آتے ہوئے اُس کے تو ڈرتی ہے | کرے کیوں کر کوئی قاتل سے ایسے، خوں بہا حاصل
یہی ہوتی ہے شاید راہ و رسم دوستی، ہے ہے | ستانے سے ہمارے تو ہی کہہ، کیا ہے وفا حاصل
ہمیں دنیا میں جیتے جی تو کچھ حاصل نہیں ہوتا | مگر[1] ہووے ہمارا مُدّعا بعد از فنا حاصل

عبث میاں مصحفی ہر لحظہ تم اُس کُو میں جاتے ہو
اُسے پروا تمھاری کب ہے، یہ باتیں ہیں لا حاصل

م

220

دیکھ آئینے میں زلف کو جھپکا[2] نہ کرو تم | لڑکے ہو، مگر آپ کو رُسوا نہ کرو تم
ایسا ہی اگر زلف سے ڈر لگتا ہے تم کو | تو جان مری آئینہ دیکھا نہ کرو تم
بات اُس کی میں[3] بولوں ہوں، تو جھنجھلا کے وہ کافر | کہتا ہے: ''مری بات میں بولا نہ کرو تم''!
پچھتاؤ گے، آواز تو پہچانو کسی کی | دروازہ رخِ غیر پہ کھولا نہ کرو تم
کیوں دیتے ہو ایذا مجھے، کیا خو ہے تمھاری | پہلو میں مرے آن کے بیٹھا نہ کرو تم
کیا جانیے آجاوے وو ہیں کیا مرے جی میں | بن ٹھن کے مرے سامنے آیا نہ کرو تم
یارو جو میں دل اپنا گنوایا تو تمھیں کیا؟ | جانے بھی دو، اس بات کا چرچا نہ کرو تم
آنکھوں کا خمار اور بھی ہوتا ہے زیادہ | اے پی کے میاں اتنا بھی سویا نہ کرو تم

سنتے ہو میاں مصحفی، اس رونے سے حاصل
رو رو کے عبث آنکھوں کا دریا نہ کرو تم

1۔ مگر بہ معنی شاید 2۔ جھپکانا = لہرانا، جھٹکنا (روزمرہ)

3۔ بات اُس کی میں = اُس کے بات کرتے ہیں، (قطع کلام)

221

صرف مشتاق ہیں اک تیری ملاقات کے ہم
آرزومند نہیں اور کسی بات کے ہم

موردِ شانِ تغافل جو ہوئے خوباں کے
کیا سزاوار نہ تھے لطف و عنایات کے ہم

آفتیں اور زمانے میں مگر تھوڑی تھیں
متحمل جو ہوئے عشق کی آفات کے ہم

کوند بجلی کی کلیجے سے نکل جاتی ہے
تجھ بن ان صدموں سے دن کاٹیں ہیں برسات کے ہم

کون سی چھیڑ، کہ ہم ساتھ نہیں ہوتی ہائے
بزمِ خوباں میں نشانے ہیں اشارات کے ہم

دمِ شمشیر پہ کٹتی ہے ہماری شب و روز
بندے ہیں اپنی بھی باریکیِ اوقات کے ہم

مصحفی جاتے ہیں اب گھر کو، ذرا سوویں گے
ہے خمار آنکھوں میں، جاگے ہوئے ہیں رات کے ہم

222

کیوں تیوری چڑھی رہتی ہے اب، کچھ نہیں معلوم
اس رنجشِ بے جا کا سبب کچھ نہیں معلوم

اک سرخی سی چہرے پہ ہے اُس شوخ کے لیکن
اب تک تو ہمیں وجہِ غضب کچھ نہیں معلوم

دروازے شبِ وصل پہ ہیں بند، کٹی شب
کیوں کر کٹی، کیا جانے، یہ شب کچھ نہیں معلوم

بجلی سی گئی کوند جو شب بزمِ بُتاں میں
کیدھر سے ہوئی جنبشِ لب کچھ نہیں معلوم

باریک خیالاں، ترے اوصافِ کمر میں
حیران تبھی تو ہیں کہ جب کچھ نہیں معلوم

اس مرتبہ[1] بگڑا تو نہ تھا ذائقہ میرا
کیوں تلخ لگی آبِ عنب[2]، کچھ نہیں معلوم

حیراں ہوں میں، کس بات سے ہو جاتی ہے یارب
بن بن کے مری بات کڈھب کچھ نہیں معلوم

ہم روزِ ازل سے ہیں بنے عشق کے پُتلے
دُنیا کا ہمیں تاب[3] و تعب کچھ نہیں معلوم

تقطیع نے سینے کی، گریباں تو اُڑائے
اب لاوے ستم کیا تری چھب کچھ نہیں معلوم

1۔ اس مرتبہ = اس درجہ، اس حد تک 2۔ عنب = انگور، اور آب کو مونث باندھا ہے
3۔ تاب و تعب (روزمرّہ) تاب = طاقت، تعب = تھکن

الماس کے آویزے ہیں جن کے، اُنھیں ہے ہے درد دلِ الماس[1] طلب کچھ نہیں معلوم
بانام ونشاں تھے وے، یہ ہیں جن کی مزاریں ہر چند کہ اَب اُن کا نسب کچھ نہیں معلوم
دیوانہ سا جاتا ہے چلا مصحفی اُس پاس
ناداں کو رہ و رسمِ ادب کچھ نہیں معلوم

223

خط پہ ہے سبزہ زار کا عالم رخ پہ ہے نو بہار کا عالم
کس کی نرگس ہے آنکھ، جو اس میں نکلے ہے انتظار کا عالم
برق و سیماب نے کہاں پایا اِس دلِ بے قرار کا عالم
جل گئی شمع دیکھ عاشق کے دیدۂ اشک بار کا عالم
خاکسارانِ دہر سے ہے جدا اِس ترے خاکسار کا عالم
نکلے ہے اُس کی زلفِ پُرخم سے سنبلِ تابدار کا عالم
گرچہ ہیں قہر سادی آنکھیں بھی پر جُدا ہے خمار کا عالم
آگے آنکھوں کے میری، پھرتا ہے وہی رفتارِ یار کا عالم
مصحفی روزگار کیا کیجے
کہ نہیں روزگار کا عالم

224

شمع رو ایسے کے پروانے ہیں ہم اِس فراست کے بھی دیوانے ہیں ہم
الغرض جو کچھ ہیں تیرے ہیں میاں آشنا ہیں یا کہ بیگانے ہیں ہم
کیا کریں اتنی سی ہستی کا گھمنڈ اِس چمن میں اوس کے دانے ہیں ہم
عاشقی کا نشہ ہے ہم میں بھرا بادۂ الفت کے پیمانے ہیں ہم

1۔ الماس طلب = زہر کی طلب کرنے والا

اس عمارت پر نہ کر منعم غرور   ہم سے عبرت لے کہ ویرانے ہیں ہم

اِن پری رُویوں سے ہوویں گے خفا؟
مصحفی کیا ایسے دیوانے ہیں ہم

225

نظروں میں تیری پیارے گو بے وقار تھے ہم   اس پر بھی جان و دل سے خدمت گزار تھے ہم

سودا کیا نہ تونے ہم ساتھ دوستی کا   واللہ تو ہی چوکا، حد مایہ دار تھے ہم

دامان و جیب اپنا، گریہ سے جب چمن تھا   تو سیر کو نہ آیا، ابرِ بہار تھے ہم

آتے تھے پاس تیرے جو دوڑ دوڑ ہر دم   کم بخت دل کے ہاتھوں بے اختیار تھے ہم

گالی بھی اُن لبوں کی، قسمت ہے اور کی ہائے   بوسے کے جن لبوں سے امیدوار تھے ہم

تھا اعتبار اپنا تیری ہی ہمدمی سے   بس تونے منہ جو موڑا، بے اعتبار تھے ہم

قدر اِس کو تونے ناداں افسوس کچھ نہ جانی   ہر چند جان و دل سے تجھ پر نثار تھے ہم

تو ملنے سے ہمارے ناگہ جو رُک گیا یُوں   خاطر پہ تیری شاید ان روزوں بار تھے ہم

پیکانِ غمزہ تیرا دل میں لیے پھریں تھے   جاتے تھے جس طرف کو، تیرے شکار تھے ہم

صیدِ زبوں سے اپنے کیوں تونے منہ کو موڑا   اس پر بھی کام کے تھے، لاغر ہزار تھے ہم

اے مصحفی تصوّر اُس کا جو بندھ گیا تھا
با صد ہزار حسرت شب ہم کنار تھے ہم

226

کب لگ سکے جفا کو اُس کی وفاے عالم   ہے جس کا ہر کرشمہ صبر آزماے عالم

محتاج پھر جہاں میں کوئی نظر نہ آتا   کرتا خدا جو مجھ کو حاجت رواے عالم

ہم کو تو کچھ نہ سوجھا، آوے وہی دکھا دے   ق   دیکھا ہو گر کسی نے کچھ یاں وراے عالم

عالم اگر ہے حادث، تو مجھ کو تو بتا دے   کیوں اب تلک ہے وہ ہی نشو و نماے عالم

کوئی کچھ ہی سمجھے اس کو، پر اپنی آنکھ میں تو
ساتھ اِس حدوث کے ہے ثابت بقاے عالم

وہ بھی نظر میں اپنی، اس وقت جلوہ گر ہے
عالم جو کچھ کہ ہوگا بعد از فناے عالم

آنکھیں تو تجھ کو دی ہیں، ٹک دیکھ تو سہی تو
ہے راست کس کے قد پر چسپاں قباے عالم

عالم میں اور ہم میں، اک طرفہ رنگی ہے
عالم فدا ہے ہم پر، ہم ہیں فداے عالم

ہم ابتدا کی پوچھیں، پھر بیٹھ کر حقیقت
ہم کو کوئی بتادے، گر انتہاے عالم

کیا لطف عاشقی کا اب رہ گیا ہماری
یاں آخرِ جوانی، واں ابتداے عالم

کس غنچہ لب کی مجھ کو یاد آگئی ہے اِس دم
جو تنگ ہوگیا ہے مجھ پر فضاے[1] عالم

ایسے سے دادخواہی، محشر میں بھی، ستم ہے
ہر ایک غمزہ جس کا ہو خوں بہاے عالم

کب داد کو کسی کی، پہنچا وہ روے دلکش
ہم نے تو اُس کو پایا حسرت فزاے عالم

جب عالمِ حیا سے بیگانہ وہ نگہ تھی
پاتے تھے تب بھی اُس کو ہم آشناے عالم

ہیں مصحفی ہم اب تو مانند حادثے کے
دیکھیں ٹلے ہے کس دن سر سے بلاے عالم

227

صَرف گریہ کا ہوا ہے اثرِ نالہ تمام
ہے جگہ اشک کی اب چشم میں تَب[2] خالہ تمام

کھُل گئے گرتے ہی ہم چشم فلک سے اس طرح
بات کہتے ہی میں ہوجائے ہے جوں ژالہ تمام

گل کو تشبیہ ہے کیا لختِ جگر سے میرے
چشم بد دُور، یہ آتش کے ہیں پرکالہ تمام

تیری مہندی کے شہیدوں کا جہاں مدفن ہے
جس طرف دیکھیے پھولے ہیں گل لالہ تمام

جب سے لگوائی ہے تونے یہ تمامی[3] کی سنجاف[4]
دَورِ دامن ہے ترا شعلۂ جوّالہ تمام

شوق رکھتا ہے یہ کس مَہ کی ہم آغوشی کا
شکلِ آغوش، فلک پر ہے جواب ہالہ تمام

1۔ فضا مذکر باندھا ہے 2۔ تب خالہ = آبلہ، پھپھولا 3۔ تمامی = چمک دار کپڑے کی قسم
4۔ سنجاف = گوٹ

مصحفی جب سے مرا شہرہ گیا مشرق کو
میرے اشعار کا مشتاق ہے بنگالہ تمام

228

کس راہ گیا لیلیٰ کا محمل نہیں معلوم ہے بادیہ ریگ[1] اور ہمیں منزل نہیں معلوم
میں حشر کے دن دعویِ خوں کس سے کروں گا وہ کشتہ ہوں جس کشتہ کا قاتل نہیں معلوم
نکلیں ہیں مرے دل کے تڑپنے میں ادائیں ہے کس کی نگاہوں کا یہ بسمل نہیں معلوم
تھا روے دلِ خستہ تو شب میری طرف کو کب ہو گیا مژگاں کے مقابل نہیں معلوم
وہ بحر ہے دریاے سرِ شک اپنا کہ جس کا پہنا[2] ہی نظر آوے ہے ساحل نہیں معلوم
مر جاؤں کہ جیتا رہوں میں ہجر میں تیرے کس چیز کا خواہاں ہے مرا دل نہیں معلوم
آنکھوں سے گذارا ہے جو یوں لختِ جگر کا آتے ہیں چلے کس کے یہ گھائل نہیں معلوم
کیا جانیے کیا اُس میں تری آنکھوں نے دیکھا کیوں ہو گئیں آئینے کی مائل نہیں معلوم

اے مصحفی افسوس کہ اس ہستی پہ ہم کو
تحصیلِ وفاداری کا حاصل نہیں معلوم

229

کب خوں میں بھرا دامنِ قاتل نہیں معلوم کس وقت یہ دل ہو گیا بسمل نہیں معلوم
اِس قافلے میں جاتے ہیں محمل تو ہزاروں پر جس میں کہ لیلیٰ ہے وہ محمل نہیں معلوم
درپیش ہے جوں اشک سفر ہم کو تری کا دن رات چلے جاتے ہیں، منزل نہیں معلوم
حیران ہیں ہم اُس کے معماے دہن میں کیوں کر کھلے یہ عقدۂ مشکل نہیں معلوم

اے مصحفی جل بھن کے ہوا خاک میں سارا
دکھلاوے گی اب کیا تپشِ دل نہیں معلوم

1۔ بادیہ ریگ = ریگستان 2۔ پہنا = دریا کا پاٹ

230

کیادل میں ترے، کس گل کی خوبی نے اثر شبنم — جو تو رہنے لگی شام و سحر باچشمِ تر شبنم
لڑی موتی کی یُوں اُس کان میں ہے ساتھ نیلم کے — رہے سوسن کی پتّی پر کبھی جوں جھول کر شبنم
کیا ہے کون سے گل نے تجھے کم بخت رنجیدہ — پڑی روتی ہے کیوں آٹھ آٹھ آنسو خاک پر شبنم
وداعِ گل کا عالم ہم نے کل گلشن میں دیکھا تھا — کھڑی روتی تھی منہ پھیرے اِدھر بلبل اُدھر شبنم
غنیمت جان لے یہ صحبتِ شب، صبح کے ہوتے — نہ پاوے گی تو ہرگز اپنی ہستی کا اثر شبنم
سنا اُس نے جو دردآلود نالہ مرغِ خوش خواں کا — ہوا سارا چمن سیراب، روئی اس قدر شبنم
نہیں اے مصحفی وہ آب ورنگ اِس سال گلشن میں
خزاں آئی گئے پودے، کہاں گل اور کدھر شبنم

231

سیراب آب جو سے قدح اور قدح سے ہم — سرخوش گلوں کی بُو سے قدح اور قدح سے ہم
مکھڑے پہ ہے گُلال جو اُس مستِ ناز کے — رنگیں ہے عکسِ رُو سے قدح اور قدح سے ہم
پیرِ مغاں کرم ہے جو سیراب ہو سکے — تیرے نمِ وضو سے قدح اور قدح سے ہم
بزمِ شراب رقص کی مجلس سے کم نہیں — ناچے ہے پُر ملو سے قدح اور قدح سے ہم
حلقے نہیں یہ زلف میں ساقی کی، بلکہ ہے — وابستہ مو بمو سے قدح اور قدح سے ہم
حرمت لکھی شراب کی یاں تک کہ کھنچ رہا — زاہد کی گفتگو سے قدح اور قدح سے ہم
شیشہ جو پھوٹ جائے تو پھوٹے ولے نہ ہو — یارب جدا سبو سے قدح اور قدح سے ہم
وہ تفرقہ پڑا کہ بہت دور رہ گیا — دست پیالہ جُو سے قدح اور قدح سے ہم
اے مصحفی ہمیں تو گوارا نہیں یہ نیش
نوش اُس کے لب سے چُو سے قدح اور قدح سے ہم

232

میری آنکھوں میں تو ہو رشکِ گلِ خنداں تم　　خوبرو چشمِ خلائق میں نہیں چنداں تم
مارے خجلت کے چھپا لے گُہرِ انجم کو　　شب کو دکھلاؤ اگر اپنے دُرِ دنداں تم
سیکڑوں کھینچتے ہو رنگ حنا کی تحریر　　طرزِ خوبی میں ہو استادِ حنا بنداں تم

حق میاں مصحفی جیتا رکھے تم کو تا دیر
کیوں کہ ہو روشنیِ بزم خردمنداں تم

233

ہردم کو سمجھتے ہیں دمِ باز پسیں ہم　　غافل تو ہوا ہم سے ذرا بھی، تو نہیں ہم
گر شوخیِ رفتارِ بُتاں یہ ہے تو ہرگز　　آرام سے سوویں گے نہیں زیرِ زمیں ہم
پہلا سا مزا اب نہ رہا عشقِ کہن میں　　پھر دل کو نئے سر سے لگا دیں گے کہیں ہم
مرجاویں گے تو ہم سے کہیں منہ نہ چھپانا　　جیتے ہیں تجھے دیکھ کے اے زُہرہ جبیں ہم
ان روزوں تو پاتے ہیں دماغ عرش پر اپنا　　ملتے ہی ترے بھول گئے اپنے تئیں ہم
مانندِ صبا پھرتے ہیں نت کوچہ بکوچہ　　رکھتے ہی نہیں خانہ کہ ہوں خانہ نشیں ہم
زلفیں تری کہتی ہیں کہ ہم دل کو اُڑا لائیں　　آنکھیں تری کہتی ہیں کریں غارتِ دیں ہم
کاجل کا تل[1] اُس چشم کے گوشے میں کہے ہے　　کیا خوب زمانے سے ہوئے گوشہ گزیں ہم

میاں مصحفی گر دیدۂ تحقیق سے دیکھیں
ہیں ہر طرف اس آئینہ خانہ میں ہمیں ہم

ن

234

وابستۂ بہارِ طرب غم بہت ہے یاں　　ہنسنے کو گُل، تو رونے کو شبنم بہت ہے یاں

1۔ کاجل کا تل = نشان، بندی

چھیڑا میں کس بہانے سے رات اُس کی زلف کو ہے راست اس جگہ پہ میاں، خم بہت ہے یاں

جوں خط سیاہ پوش ہوں کیوں کے نہ عاشقاں جانے کا تیرے حسن کے ماتم بہت ہے یاں

ہے مجھ کو کج کلاہوں سے ربطِ حباب و موج صحبت رہے گر اِن سے کوئی دم، بہت ہے یاں

کوے بُتاں کی پوچھے کوئی مصحفی سے راہ

کس واسطے کہ سب سے وہ محرم بہت ہے یاں

235

دُنیا ہے جاے رنج و محن، غم بہت ہے یاں مرتا نہیں ہے ایک یہ ماتم بہت ہے یاں

نازک نہال جتنے ہیں دلی کے، قہر ہیں، یعنی قدم قدم پہ خم و چم[1] بہت ہے یاں

اے دل تمام عمر تو یاں کون خوش رہا گذرے خوشی کے ساتھ جو یکدم بہت ہے یاں

زلفوں کے پیچ سے ہے نکلنا ہی اب بھلا یعنی کہ حال اپنا تو درہم بہت ہے یاں

آتی ہے مجھ کو خاک سے مُردوں کی یہ صدا

آ مصحفی، کہ اور بھی عالم بہت ہے یاں

236

مرتے ہیں ہم تو جان ترے اشتیاق میں رکھیو خبر، گذر ہی نہ جاویں فراق میں

راتوں کو آنکھ اُٹھا کے ذرا دیکھ تو سہی کیا شکلیں جلوہ گر ہیں فلک کے رِواق[2] میں

اتنا نہ دشمنی پہ کمر باندھ، آ سمجھ اس طرح جانیں جاتی یہاں ہیں نفاق میں

حلقے میں کان کے نہیں جا پائی اب تلک لٹکا رکھا ہے اُس نے گہر کو بلاق[3] میں

قاصد نے خط دیا جو مرا اُس کو مصحفی

پڑھ کر، لفافہ پھینک دیا اُس نے طاق میں

1۔ خم و چم = طمطراق 2۔ رِواق = برآمدہ، مکان

3۔ بُلاق = ناک میں پہننے کا زیور

237

جی چاہتا ہے وعدۂ دیدار ہو کہیں — گو اس میں میں کہیں ہوں، وہ دلدار ہو کہیں
گرما زدہ ہم آتے ہیں صحرائے عشق سے — ٹک بیٹھیے جو سایۂ دیوار ہو کہیں
اب تو یہی دعا ہے مری، دامِ عشق میں — میری طرح سے تو بھی گرفتار ہو کہیں
رکھا ہے پھر زمیں پہ قدم تو نے، ان دنوں — ڈرتا ہوں مَیں کہ فتنہ نہ بیدار ہو کہیں
آیا ہے پشتِ بام پہ پھر ماہ چار دَہ — غُرفے سے ٹک تو تو بھی نمودار ہو کہیں
جی چاہتا ہے اپنا بھی ٹک دیکھیے اگر — آبِ روان و سبزہ و گلزار ہو کہیں

دل ہے مری بغل میں وہ جنس، آہ مصحفی
جس جنس کا نہ کوئی خریدار ہو کہیں

238

دروازہ نہ تھا اُس کا تو جائے سگ و درباں — عاشق کے لیے ہے یہ بلائے سگ و درباں
ازبس میں اُنھیں دی ہے اذیّت، مرے حق میں — مرجائے کہیں، ہے یہ دعائے سگ و درباں
کوچے میں ترے کی ہے بسر عمر جو ہم نے — اک عمر اُٹھائی ہے جفائے سگ و درباں
پھر آویں ہوں کوچے کی طرف اُس کے میں جاکر — راتوں کو جو آتی ہے صدائے سگ و درباں
اے شوخ وفاداریِ عاشق پہ نظر کر — کچھ اتنی نہیں ہے یہ وفائے سگ و درباں
اُس کوچے میں کیا تاب، کہ پَر مارے فرشتہ — رہتی ہے بندھی واں تو ہوائے سگ و درباں
جاتا ہوں جو اُس کو میں، تو میں حسن ادب سے — سر اپنے کو رکھتا ہوں بہ پائے سگ و درباں

موجد نہیں میں مصحفی اس طُرفہ زمیں کا
ہے حکمِ قتیلا[1] سے بنائے سگ و درباں

1۔ قتیلا = محمد حسن قتیل کی طرف اشارہ ہے

239

نے زخمِ خوں چکاں ہوں، نہ حلقِ بُریدہ ہوں　عاشق ہوں میں کسی کا، اور آفت رسیدہ ہوں
ہستی سے اپنی مجھ کو نہیں مُطلق آگہی　عمرِ گذشتہ، یا کہ غزالِ رمیدہ ہوں
نکلے ہے میری وضع سے اک شورشِ جنوں　دریا نہیں، میں سیلِ گریباں دریدہ ہوں
مرغانِ باغ میں مرے نالے کا شور ہے　ہرچند میں ابھی نفس ناکشیدہ ہوں
پہنچے سزا کو اپنی جو منہ پر مرے چڑھے　میں دستِ روزگار میں تیغِ کشیدہ ہوں
جاتا ہے جلد قافلۂ عمر کس قدر　مہلت نہیں ہے اتنی کہ ٹک آرمیدہ ہوں
کون اُٹھ گیا ہے پاس سے میرے جو مصحفی
روتا ہوں زار زار پڑا، آب دیدہ ہوں

240

دکھلاؤں اگر اس بُتِ خود کام کی آنکھیں　کھُل جائیں ابھی غنچۂ بادام کی آنکھیں
یہ بادیہ وہ ہے کہ جہاں صید کی خاطر　نت دیدۂ حیراں ہی رہیں دام کی آنکھیں
مقصود ہے آنکھوں سے ترا دیکھنا پیارے　جب تو ہی نہ ہو پاس، تو کس کام کی آنکھیں
کیا دُور ہے اُس شوخ سے، آتے ہی چمن میں　مل ڈالے جو تلووں تلے بادام کی آنکھیں
دیکھا نہیں دو دن سے جمال اُس کا میں شاید　آئی ہیں کہیں اس بُتِ خود کام کی آنکھیں[1]
ٹک تو بھی تو روزن سے ذرا جھانک کہ کیوں کر　نکلیں ہیں ترے عاشقِ بدنام کی آنکھیں
سرخی تری آنکھوں کی کہاں پاویں وہ ساقی　گو لعل و کمیدک[2] سی ہوں اصنام کی آنکھیں
اے مصحفی نظارے سے اُس رنگِ کفک کے
ڈوبی ہیں لہو میں کسی ناکام کی آنکھیں

241

اے شبِ ہجر کہیں تیری سحر ہے کہ نہیں　نالۂ نیم شبی تجھ میں اثر ہے کہ نہیں

1۔ آنکھیں آنا = آشوبِ چشم　2۔ کمیدک = چمکیلا پتھر

جان پر اپنی میں کھیلا ہوں، جدائی میں تری بے خبر تجھ کو بھی کچھ اس کی خبر ہے کہ نہیں
ایک مدّت ہوئی ہم وصفِ کمر کرتے ہیں پر یہ معلوم نہیں اُس کے کمر ہے کہ نہیں
رکھ نہ سوزن کو، ذرا دیکھ تو لے اے جرّاح قابلِ بخیہ مرا زخمِ جگر ہے کہ نہیں
کیا خوش آئی ہے دلا منزلِ ہستی تجھ کو سچ بتا، یاں سے ترا عزمِ سفر ہے کہ نہیں
تو جو بے پردہ ہو، منھ غیر کو دکھلاتا ہے پاس میرا بھی کچھ اے رشکِ قمر ہے کہ نہیں
دیکھ تو اے بُتِ بے مہر، تری فرقت میں ہر بُنِ موے مرا، دیدۂ تر ہے کہ نہیں
اُس کے در پر ہی جو رہتا ہوں میں دن رات پڑا مجھ سے جھنجھلا کے کہے ہے: ترے گھر ہے کہ نہیں

مصحفی اُس کی گلی میں جو تو جاتا ہے سدا
اپنی بدنامی کا کچھ تجھ کو بھی ڈر ہے کہ نہیں

242

لیتا ہوں میں جب اُس کی بلائیں وہ نازنیں جھنجھلا کے یوں کہے ہے، کہ "چل دور ہو کہیں"
صورت کو تیری دیکھ کے اے قبلۂ چمن ہر شاخِ گُل نے جھک کے کیا سجدہ بر زمیں
بجلی سی کوندتی ہے پڑی، سیر دیکھیو نہ خرمنِ فلک میں مری آہِ آتشیں
پیدا ہوئے ہیں مادرِ گیتی سے تو اَماں تیرا جمال، اور مری آہِ آتشیں

اُس کو بھی اب خیال ترا کم رہا ہے جان
جانے دے مصحفی کی جو خواہش تجھے نہیں

243

تمھاری اور مری کج ادائیاں ہی رہیں رہے جو پاس تو باہم لڑائیاں ہی رہیں
زبسکہ کرتے رہے بے کسوں پہ تم بیداد سدا گلی میں تمھاری دوہائیاں ہی رہیں
ہوئی نہ سازمری اُس کی صحبت اک شب ہائے اِدھر سے عجز اُدھر سے رکھائیاں[1] ہی رہیں

1۔ رُکھائیاں = بے رُخی (روزمرّہ)

دریغ، یار سے بچھڑے تو ایسے ہم بچھڑے　　کہ تا بہ روزِ قیامت جدائیاں ہی رہیں

اب اُس کے ملنے کا کیا لطف مصحفی باہم
نہ وہ سلوک نہ وہ آشنائیاں ہی رہیں

244

ادھر سے جھانکتے ہیں گہ اُدھر سے دیکھ لیتے ہیں　　غرض ہم اُس کی صورت سو ہنر سے دیکھ لیتے ہیں
کیا ہے بخت نے جس دن سے ہم کو اُس کا ہم سایہ　　ہم اُس رشکِ پری کو اپنے گھر سے دیکھ لیتے ہیں
جو ہو جاتے ہیں دیوانے ترے، اتنے نقابوں پر　　خدا جانے کہ وہ تجھ کو کدھر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمیں گریہ سے وہ فرصت کہاں جو خال و خط دیکھیں　　مگر نقشہ ترا اِس چشمِ تر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمارے دیکھنے سے کیوں خفا ہوتا ہے اے ظالم　　ترا لیتے ہیں کیا، ٹک اک نظر سے دیکھ لیتے ہیں
ہمیں اُس کو میں رہنے کا نہیں کچھ اور تو حاصل　　پر اتنا ہے کہ گاہے چاکِ دَر سے دیکھ لیتے ہیں

لگیں ہیں دیکھنے جب مصحفی ہم اس کے کوچے میں
ٹک اک پھر کر بھی رُسوائی کے ڈر سے دیکھ لیتے ہیں

245

یا تو آوے وہ رشکِ ماہ کہیں　　یا ہو اِس شب کا روسیاہ کہیں
اب ملاقات کی وہ شکل نہیں　　دیکھ لیتے ہیں گاہ گاہ کہیں
ہیں جو مردود سارے عالم کے　　کچھ تو ہم سے ہوا گناہ کہیں
خانۂ آسماں جو ہے پُر دود　　کی نہ ہووے کسی نے آہ کہیں
مہِ نو سر جھکائے جاتا ہے　　آج دیکھا وہ کج کلاہ کہیں
مرغِ دل کاش سرد ہو جاوے　　کھا کے اِک ناوکِ نگاہ کہیں

مصحفی چاہے ہے تو اس کو بہت
لاوے آفت نہ تیری چاہ کہیں

246

کبھی وفائیں، کبھی بے وفائیاں دیکھیں
میں اِن بتوں کی غرض آشنائیاں دیکھیں

ہم اُٹھ چلے جو کبھی اُس گلی کو وحشت میں
تو اس گھڑی نہ کنوئیں اور نہ کھائیاں[1] دیکھیں

زہے نصیب ہیں اس کے کہ جس نے وصل کی شب
گلے میں اپنے وہ نازک کلائیاں دیکھیں

یہ سطحِ خاک ہے کیا رزم گاہ کا میدان
کہ جس پہ ہوتی ہوئی نت لڑائیاں دیکھیں

گلی میں اُس کی یہ بازارِ مرگ گرم ہوا
کہ دادخواہوں کی واں چارپائیاں[2] دیکھیں

رکھا نہ خط کبھی عارض پہ اُس پری رُو نے
برنگِ آئینہ نت واں صفائیاں دیکھیں

ہنوز جیتے رہے ہیں تو سخت جانی سے
وگرنہ ہم نے بھی کیا کیا جُدائیاں دیکھیں

نہ ہاتھ آئی مرے مصحفی وہ زلفِ رسا
میں طالعوں کی بھی اپنے رسائیاں دیکھیں

247

جوں اشک راہِ خشک سے کم ہے خبر ہمیں
آیا ہے جب سے پیش، تری کا سفر ہمیں

اب اُس کے انتظار میں مرنا پڑا دریغ
آنے کی اپنے کہہ نہ گیا نامہ بر ہمیں

جس رہ گذر میں اس کا گذر تھا سو اب تلک
نبوائے ہے زمین وہی رہ گذر ہمیں

گہہ دستِ شانہ ہیں تو گہے دستِ بہلہ[3] ہیں
کرنی ہے تیری خدمتِ زلف و کمر ہمیں

کیا جانتے ہیں ہم، کہ وہاں تو بھی ہووے گا
گلشن میں لے گئی تھی نسیمِ سحر ہمیں

ہر چند برگِ لالہ بہت چہچہے[4] ہیں لیک
کچھ خوش لگیں ہیں اپنے ہی لختِ جگر ہمیں

نازک دماغ اتنے ہوئے ہیں کہ ان دنوں
دینے لگی ہے نکہتِ گل بھی ضرر ہمیں

یک پیچ سج کے تو کہیں نکلا تھا ایک دن
آتا ہے اب تلک تری خو سے حذر ہمیں

1۔ کھائیاں = گہرے گڑھے 2۔ چارپائیاں = جنازے (مجازاً)
3۔ بہلہ = مساج کرنے والا 4۔ چہچہے = تابندہ

اے مصحفی زمیں یہ شگفتہ ہے، اس کے بیچ
کہہ کر سنا اک اور غزل خوب تر ہمیں

248

راہِ عدم دکھائے ہے اُس کی کمر ہمیں
اب اپنی زندگی نہیں آتی نظر ہمیں

اے مرگ جلد آ کہ ترے انتظار میں
اِس زندگی نے سخت دیا دردِ سر ہمیں

ہیں کاروانِ عمر سے واماندہ ہم غریب
ساتھی چلے گئے ہیں سبھی چھوڑ کر ہمیں

کیا گرمِ اختلاطِ خس و خار ہوں کہ یاں
فرصت ہے زندگی کی بقدرِ شرر ہمیں

رکھتے نہ پانو ہم تنِ تنہا براہِ مرگ
ملتا گر اس سفر میں کوئی ہم سفر ہمیں

موج نسیم تو نہ ہلا اپنی آستیں
وقفہ کہاں ہے مثلِ چراغِ سحر ہمیں

یہ تیغ یہ کمر ہے، تو اِک دن تو دیکھیو
دیکھے گی خلق کشتہ تری راہ پر ہمیں

دیکھیں ہیں ہم اس آئینہ خانے میں جس طرف
جز روے دوست کچھ نہیں آتا نظر ہمیں

پورب میں آئے چھوڑ کے دلّی سے شہر کو
اے مصحفی لے آئی ہے قِسمت کدھر ہمیں

249

جاں باز سپاہی یہیں بے جان ہوئے ہیں
کہتے ہیں اِسی کوچے میں گھمسان ہوئے ہیں

ہے اور ہی، صورت کی پریشانی ہماری
ہم دیکھ کے زلفوں کو پریشان ہوئے ہیں

کیوں رووے ہے شبنم کھڑی، ماتم ہے یہ کس کا
گل باغ میں کیوں چاک گریبان ہوئے ہیں

تسبیح لیے میں جو گیا، ہنس کے وہ بولا
اب آپ بھی کیا مردِ مسلمان ہوئے ہیں

اب تو مہ و خورشید کو منھ اپنا دکھا دے
پھرتے ہیں بہت دیر سے، حیران ہوئے ہیں

افلاک سے کچھ کم نہ سمجھ خاک کا رتبہ
مخلوق اِسی خاک سے انسان ہوئے ہیں

دیکھا ہے تجھے جب مہ و خورشید نے پھرتے
لے لے کے بلائیں تری، قربان ہوئے ہیں

کرنے جو لگا ذبح مجھے، غیر یہ بولا کیا کرتے ہیں یہ،آپ بھی نادان ہوئے ہیں
کداُس کی طبیعت میں بھی اب وہ نہیں شاید دن مجھ کو جدائی کے جو آسان ہوئے ہیں
کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خونِ جگر بھی نالے تو مرے حلق کے دربان ہوئے ہیں
اے مصحفی مت پوچھ کہ دلّی سے نکل کر
کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

250

سر کیوں کے نہ ہم باغ کی دیوار سے ماریں کیا کیا گئیں اِن آنکھوں کے آگے سے بہاریں
ہر چند کہ گم گشتۂ صحراے جنوں ہیں خضر آئے نظر ہم کو تو اُس کو نہ پکاریں
کچھ ڈر نہیں، منزل کو پہنچ جائیں گے ہم بھی گو راہ ابھی دور ہے، جی کا ہے کو ہاریں
جن محلوں میں خُوبانِ جہاں صدر نشیں تھے اب اُن کی جگہ واں نظر آتی ہیں مزاریں
ہم رونے لگے دیکھتے ہی دور سے اُن کو جب تیرے شہیدوں کی نظر آئیں مزاریں
کچھ کام نہیں ہم کو تو خُوبانِ جہاں سے مُکھڑے کو ملیں غازہ کہ زلفوں کو سنواریں
ہر چند کہ سائل ہیں ترے در کے، پہ ہم تو حاتم کے بھی آگے نہ کبھی ہاتھ پساریں
لَدتا ہے ابھی قافلہ، ہاں ہم بھی چلیں گے یارانِ سُبک سار جو ہیں وہ تو سدھاریں
گلدستہ تو کیا چیز ہے، گر ہووے رسائی ہم مُکھڑے پہ تیرے مہ و خورشید کو واریں
گلزار ہے داغوں سے زبس اپنا سراپا طاؤس خجل ہووے جو جامے کو اُتاریں
اے مصحفی شکوہ نہ کریں روزیِ کم کا
یوں چاہیے اب ہم کو کہ اوقات گذاریں

251

کم خواب کی یہ جو نظر آتی ہیں ازاریں بخت اُن کے ہیں جو لُوٹتے ہیں اِن کی بہاریں
یارانِ عدم سنتے نہیں بات کسی کی کس طرح ہم اِن قافلے والوں کو پکاریں

باشندے جو اُس کوچے کے ہیں، یاس کے مارے جیتے ہی بنا رکھتے ہیں واں اپنی مزاریں
ہم وہ ہیں کہ ہرگز نہ کہیں بات کسی سے گر جی میں اُٹھے جوش، تو پھر جی ہی میں ماریں
اے تیغِ اجل جلد خبر لے تو ہماری ہم سر سے کسو طرح تو یہ بوجھ اتاریں
ہم وہ ہیں کہ وامانده پسِ قافلہ گر ہو ہر گام پہ ٹھہریں، اُسے پھر پھر کے پکاریں
ہے عرصۂ شطرنج فلک، مُہرے کواکب ہم ایسے کہاں کے ہیں جو بازی کو نہ ہاریں
کچھ شغل نہیں ہم کو تو بیداریِ شب کا کس طرح پھر اوقات بہ غفلت نہ گذاریں

قصد اپنا تو ہے مصحفی مے خانے کی جانب
جو کعبہ رواں ہوویں، وہ کعبے کو سدھاریں

252

رکھتا ہے جو تُو زبان شیریں میرا بھی تو ہے بیان شیریں
خسرو سے نہ روٹھ، ہے وہ عاشق عاشق کو ستا نہ، مان شیریں
لاکھوں ہی کے دم میں خون کرتی کھاتی جو یہ تیرے پان شیریں
کہتے ہیں کہ تیرے عشق میں دی فرہاد نے اپنی جان شیریں
کرتے نہیں اس طرح معشوق عاشق کا امتحان شیریں
حلقے میں یہ زلف کے نہیں رُخ لیلیٰ کی ہے مہمان شیریں
کہتے ہیں کہ مر گیا جو خسرو کھا زہر موئی اُس آن شیریں
شیرویہ مرا بہ تلخ کامی دُنیا سے گئی جوان شیریں

اے مصحفی عشق وہ بلا ہے
جس سے نہ بچی ندان شیریں

253

دیکھ آیا ہے یہ کس جامۂ چسپاں کے تئیں چاک کرتا ہے جو گل اپنے گریباں کے تئیں

ایک عالم نہ کہیں زیر و زبر ہو جاوے منع کر منع، ذرا جنبشِ مژگاں کے تئیں
مے کشو، شیخ کی تقصیر بھی کچھ ثابت ہے کیوں عبث کھینچتے ہو مردِ مسلماں کے تئیں
آپ یہ دل ہے مرا اپنے کیے پر نادم تم پشیماں نہ کرو اور پشیماں کے تئیں
گر خدائی میں تصرّف مجھے ہوتا، تو میں کوتہی عمر کی دیتا شبِ ہجراں کے تئیں
اے صبا یار سے کہیو، کہ یہ کہتے ہیں اسیر کبھی آباد کروگے درِ زنداں کے تئیں
یار نے دی ہمیں لب اپنے سے گراک دشنام یہ سمجھ، بخش دیا ملکِ سلیماں کے تئیں
بحر و کاں میں گہر و لعل کی ہے اب یہ دعا نہ لگے چشمِ بد اُن کے لب و دنداں کے تئیں
یاد کر قیس کو، اے مصحفی رویا میں بہت
دشت میں دیکھ کے آوارہ غزالاں کے تئیں

254

دلّی ہوئی ہے ویراں، سُونے کھنڈر پڑے ہیں ویران ہیں محلّے، سنسان گھر پڑے ہیں
جب دیکھتا ہوں اُن کو، تب تا کمر پڑے ہیں یہ بال میرے جی کے پیچھے مگر پڑے ہیں
عزّت یہ پیادگی کی، کم ہے، کہ گھوڑے والے گھوڑے سے دیکھتے ہی مجھ کو اُتر پڑے ہیں
دیکھا تو اِس چمن میں، بادِ خزاں کے ہاتھوں اُکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
قریاتِ[1] ہند کا اب یہ رنگ ہے کہ کوسوں جاوے کوئی جدھر کو اُجڑے نگر پڑے ہیں
رویا ہے اِس چمن میں کون آکے اے صبا جو ہر نخلِ گُل کے نیچے لختِ جگر پڑے ہیں
بگڑا کیے ہیں ہم بھی اُس نازنیں سے ہر دم کام اپنے رفتہ رفتہ یوہیں سنور پڑے ہیں
ہیں جان و دل کے خواہاں، کیا سر کے بال اُس کے جو کچھ اِدھر پڑے ہیں اور کچھ اُدھر پڑے ہیں
مقتل میں یہ تماشا اُس کے نیا میں دیکھا ایدھر کو دھڑ پڑے ہیں، اودھر کو سر پڑے ہیں
بُلبل کا باغباں سے، کیا اب نشان پوچھوں بیروں درِ چمن کے، یک مشت پَر پڑے ہیں
شبنم گلاب[2] پاشی غنچے کی جلد اُٹھا لا گُل بسترِ غشی پر سب بے خبر پڑے ہیں

1۔ قریات = قریہ کی جمع، دیہات 2۔ گلاب پاشی = گلاب چھڑکنے کا آلہ

اے مصحفی میں ان کو اب چھوڑتا ہوں کوئی
وہ بعد مدّتوں کے میری نظر پڑے ہیں

255

کبھی تو بیٹھوں ہوں جا، اور کبھی اُٹھ آتا ہوں منوں ہوں آپ ہی، پھر آپھی رُوٹھ جاتا ہوں
معاملہ تو ذرا دیکھیو تو چاہت کا مجھے ستاوے ہے وہ، اُس کو میں ستاتا ہوں
رُکا ہوا[1] وہ مجھے دیکھ کر، جو بولے ہے ق تو بولتا نہیں میں اُس سے، سر ہلاتا ہوں
پر اتنے میں جو میں سوچوں ہوں، یہ نہ رُک جاوے زباں پہ اپنی بھی اک آدھ حرف لاتا ہوں
کہے ہے دل یہ، کہ ایسے سے دوستی ہے عبث بُرائیوں کا جو اُس کی خیال لاتا ہوں
یہ کہہ کے بیٹھ رہوں ہوں جو اپنے گھر میں ذرا تو دل کہے ہے یہ گھبرا کے: "میں تو جاتا ہوں"
جب اپنا حال یہ دیکھوں ہوں میں، تو ہو ناچار جھپٹ کے پیچھے سے دل کے قدم اُٹھاتا ہوں

بتا تو مصحفی کیا تجھ کو ہوگیا کم بخت
کچھ ان دنوں ترا چہرہ تغیر[2] پاتا ہوں

256

یہ جو اپنے ہاتھ میں دامن سنبھالے جاتے ہیں
پیچھے پیچھے اِن کے، اِن پر مرنے والے جاتے ہیں

لطف و رنجش کا تماشا ہے، کہ دن میں لاکھ بار
گہہ بلائے جاتے ہیں ہم، گہہ نکالے جاتے ہیں

جان سے جاتے رہے ہیں بسکہ لاکھوں بے گناہ
ہر طرف کوچے میں اُس کے خوں کے نالے جاتے ہیں

1۔ رکا ہوا = خفا 2۔ تغیر (بروزنِ سفیر) تغییر کی عوامی صورت (روزمرہ)= بدلا ہوا

سعی تو اپنی نہ کر اے گریہ، صرفِ شست و شو
دل کے، دھونے سے کوئی یہ داغ کالے جاتے ہیں

گر نہیں ہے وعدہ گہ وہ کو، تو کیوں راتوں کو لوگ
اس کے کوچے میں اندھیرے اور اُجالے جاتے ہیں

اُس کے کانوں تک رسائی کیوں نہیں، حیران ہوں
عرشِ اعظم تک تو میرے شب کے نالے جاتے ہیں

ہوگیا ہوں میں تو اُن کا مصحفی حلقہ بگوش
یاد سے میری کب اُن کانوں کے بالے جاتے ہیں

257

پھول لالے کے ہیں جتنے، چشمِ خوں آلودہ ہیں — اس چمن کے بیچ کیا کیا گلبدن آسودہ ہیں
جا پڑی ہے کیا کسی کی تیرہ بختی پر نظر — جو کئی دن سے میاں، آنکھیں تری بے دودہ[1] ہیں
یہ چمن افسوس کی جا گر نہیں تو کس لیے — برگِ ہائے لالہ وگل دست باہم سودہ ہیں
نہی کا اندیشہ دل میں اک ذرا لاتے نہیں — ہم بھی کتنے مرتکب ہے ہے، بہ نافرمودہ ہیں

غنچے اِس گلزار میں لاکھوں ہیں، لیکن مصحفی
جب تلک تو آئے سب بندِ قبا نکشودہ ہیں

258

کس کے مقتل سے ہوا آج گذارِ دامن — یک وَجب[2] خون میں تر ہے جو کنارِ دامن
پاسِ خاطر ہے ضرور اس کی بھی، اے دستِ جنوں — رشتہ رکھتا ہے گریبان سے تارِ دامن
در بہ در خاک مری پھرتی ہے ہمراہِ صبا — کاش ہوجائے کسی کی یہ غبارِ دامن
خون عاشق کی نہ بے صِرفہ بہا رنگینی — غیر کے ہاتھ سے دلوا نہ فشارِ دامن[3]

1۔ بے دودہ = سیاہی کے بغیر 2۔ وَجَب = بالشت 3۔ فشارِ دامن = دامن نچوڑنا

جامہ چیں[1] نے تو چمن تجھ کو بنایا ہے تمام　　دیکھوں چولی کی چُنت[2]، یا کہ بہارِ دامن
فی المثل جامۂ شبنم[3] ہو گر اُس کے بر میں　　اُٹھ سکے تو بھی تو اُس گل سے نہ بارِ دامن
دامن اُس گل کا ہے پانو کے تصدق دمِ رقص　　اور ہم ہوتے ہیں جی ہی میں نثارِ دامن
فائدہ کچھ نہیں، رہنے کا چمن میں ایسے　　ایک کانٹا بھی جہاں ہووے نہ خارِ دامن

مصحفی آوے ہے تو کیا کسی خارستاں سے
ریشہ ریشہ ہیں جو یکسر ترے تارِ دامن

259

خونِ ناحق ہے مرا، نقش و نگارِ دامن　　کہیں کچھ گل نہ کھِلاوے یہ بہارِ دامن
ہاتھ نکلا نہ کوئی گورِ غریباں سے کبھو　　گرچہ سو بار ہوا واں سے گذارِ دامن
بر میں جب پہنے ہے تو جامۂ زرکش، عشاق　　حرزِ جاں کرتے ہیں لے کر ترے تارِ دامن
نہ گئی گریۂ خونیں کی اُدھر رنگینی　　اب گریبان ہو کس منہ سے دوچارِ دامن
جفتِ[4] شمع اُس کی دو ساقیں[5] ہیں کہ جن کے اوپر　　نہیں فانوس سے کچھ کم وہ حصارِ دامن
سرمۂ چشم اگر ہو نہ سکی میری خاک　　یہ بھی بس ہے کہ ہوئی اُس کی غبارِ دامن

مصحفی کیوں کے نہ بھڑکوں میں کہ تحریکِ نسیم
آتشِ دل پہ مری کرتی ہے کارِ دامن

260

اشکِ خونیں ہیں مرے نقش و نگارِ دامن　　کِس کو دکھلاؤں میں اے گل یہ بہارِ دامن
شکر صد شکر، نہیں میں کسی خاطر کا غبار　　خاکسارانہ جو ہوں بھی تو غبارِ دامن
نازکی دیکھ تو اُس کی، کہ بہ ہنگامِ خرام　　رگِ گل کو بھی سمجھتا ہے وہ خارِ دامن

1۔ جامہ چیں = کپڑے میں چُنت ڈالنے والا　2۔ چُنت = عوامی بولی میں چُنٹ
3۔ شبنم۔ ایک طرح کے باریک کپڑے کا نام بھی ہے　4۔ جفت شمع = شمع جیسی
5۔ دو ساقیں = پنڈلیاں

کیا سمجھ دشتِ تجرد میں قدم ہم نے رکھا　　ایک کانٹا بھی ہوا واں نہ دوچار دامن
دامن اک خوشۂ پرویں نظر آتا ہے ترا　　موتی گوٹے[1] کے ٹکے ہیں جو کنارِ دامن
نذر کانٹوں کی کیے، دشتِ جنوں میں جاکر　　رہ گئے تھے جو کہیں یک دو سہ تارِ دامن
مصحفی چلتے تھے ہم اس کی جلو میں اس وقت
جب کہ طفلی میں وہ ہوتا تھا سوارِ دامن

261

عشق میں امتحاں ہزاروں ہیں　　خستہ و نیم جاں ہزاروں ہیں
بات آہستہ کہہ، کہ مجلس میں　　دوست دشمن میاں ہزاروں ہیں
تو تو ٹک صاف رہ کہ تیرے لیے　　مجھ سے یاں بدگماں ہزاروں ہیں
آتشِ گل بھڑکیو بچ کے ذرا　　باغ میں آشیاں ہزاروں ہیں
باغباں گر نہیں تو کیا غم ہے　　گل کے یاں پاسباں ہزاروں ہیں
تجھ سے دل لگ گیا ہے، یوں تو مرے　　مشفق و مہرباں ہزاروں ہیں
سیر کی جا ہے آج مژگاں پر　　اشکِ خونیں رواں ہزاروں ہیں
عشق کا قصہ، ایک جلد نہیں　　اس کی تو داستاں ہزاروں ہیں
مصحفی مجھ سا کم ہے دِلّی میں
یوں تو جادُو بیاں ہزاروں ہیں

262

میں کیا کہوں کہ راتیں کیا سخت کٹتیاں ہیں　　اپنی تو چھاتیاں اِن راتوں سے پھٹتیاں ہیں
جاؤں کِدھر کہ یارو، وہ ناگنیں سی زلفیں　　آ آ کے خواب میں بھی مجھ کو لپٹتیاں ہیں
گلشن میں بُلبلوں نے جو شور کر رکھا ہے　　شاید گلوں کی شاخیں پھراب کی چھٹتیاں ہیں

1۔ گوٹا = دامن کی آرائش کے لیے بیل

پیغامِ وصل مجھ کو دیتی ہے کم نصیبی　جب دن لگیں ہیں بڑھنے اور راتیں گھٹتیاں ہیں
میں سامنے سے ناگہ آجاؤں ہوں، تو وہیں　ہوتے ہی اُس کی سیدھی نظریں پلٹتیاں ہیں
خورشید جھانکتا ہے، دلّی کی مہ جبیناں　جس دم نقابیں اپنے رخ سے اُلٹتیاں ہیں
اے مصحفی تو اتنا رویا نہ کر کہ ظالم
رونے سے تیرے سب کی نیندیں اُوچٹتیاں ہیں

263

یا تو کٹتی تھی بہم عالمِ یک جائی میں　جاگنا مجھ کو پڑا یا شبِ تنہائی میں
کس طرح چین سے گذرے کہ بچھڑتے ہی ترے　آگیا فرق مرے تاب و توانائی میں
قلقِ خستہ درونانِ الم کیا جانے　جس کی بھر عمر کٹی صبر و شکیبائی میں
کیوں نہ خوش ہو تو صنم، صرف کیا صانع نے　لطفِ رعنائیِ گُل بھی تری رعنائی میں
خالی از لطف نہیں چاک گریباں پھرنا　ہم نے دیکھے ہیں مزے عالمِ رسوائی میں
شب کو مکھڑے سے اُٹھایا تھا میاں تو نے نقاب　تو ہی کہہ، کچھ بھی رہا تھا مری رسوائی میں!
مصحفی قیس کے ملنے کا نہ کر قصد میاں
انس دیکھا ہے کہیں مردمِ صحرائی میں

264

تبِ غم سے جو چھاتیاں جلیاں　حسرتیں آب ہو کے بہہ چلیاں
نازک و نرم انگلیاں اُس کی　ایسی ہیں جیسے مونگ کی پھلیاں
کیا کہوں فندقوں کا اُس کی رنگ　دسوں جیسے گلاب کی کلیاں
کیوں کے دلّی سے لکھنؤ ہے خوب　نہ وہ کوچے یہاں نہ وہ گلیاں
لے گیا دل کو مصحفی کے وہ شوخ
باتوں باتوں میں کر کے چھل بلّیاں[1]

1۔ چھل بلیاں = شوخی، اچپلاپن

265

جس گھڑی قاتل کے تھا حلقومِ بسمل ہاتھ میں
رہ گیا تھا وہ بھی لے دامانِ قاتل ہاتھ میں

جن دنوں تھی میری اور اُس کی ذرا صحبت برآر
وہ بھی جوں آئینہ رکھتا تھا مرا دل ہاتھ میں

اب یہ کیا فتنہ اُٹھا جو چاکِ در کرنے کو بند
اس کے گھر والے لیے پھرتے ہیں، کہہ گِل[1] ہاتھ میں

جس نے گستاخانہ اُس کی زلفِ مشکیں کو چھوا
ہم نے اُس ناداں کے پھر دیکھے سلاسل ہاتھ میں

لطف تو تب ہے کہ مجنونِ بیاباں گرد کے
ہو گریباں کے عوض دامانِ محمل ہاتھ میں

اس تمنا میں کہ تیغ اُس کی کہیں ہووے علم
سر لیے بیٹھے ہیں اپنا اہلِ محفل ہاتھ میں

بھیک لی میں ہاتھ میں اُس کی، تو یوں بولا وہ شوخ
چاہیے پیالہ رکھے درویشِ سائل ہاتھ میں

ہاتھ تو مارے بہت میں بحرِ غم میں مصحفی
پر نہ آیا گوشۂ دامانِ ساحل ہاتھ میں

266

کبھی اس تازہ گُل بن ہم جو رخت اپنا بدلتے ہیں
مَلیں ہیں عطر تو، لیکن کفِ افسوس ملتے ہیں

نزاکت اور صفا ایسی بہم پہنچائی ہے اُس نے
کہ سبزے پر چمن کے، پانْو شیشے کے پھسلتے ہیں

خدا جانے میں دیکھ آیا ہوں کس موتی کے دانے کو
جو اشک آنکھوں سے میری رات دن موتی سے ڈھلتے ہیں

دلا تنہا نہ رکھیو پانْو صحرائے محبت میں
یہ وہ صحرا ہے جس میں قافلے مِل مِل کے چلتے ہیں

وہ واں تعویذِ بازو ہو رہے ہیں دوست دشمن کے
جنھوں کے واسطے راتوں کو یاں تعویذ جلتے ہیں

1۔ کہہ گِل = مٹی میں بھوسا سان کر لیپ کیا جاتا ہے اُسے کہہ گِل کہتے ہیں

جب اُس مجلس میں جاتے ہیں تو ہو جاتی ہے یہ حالت
کہ ہم گھبرا کے آپ ہی گرتے ہیں آپ ہی سنبھلتے ہیں

کوئی اِن کافروں کے ہاتھ سے کیدھر نکل جاوے
نئی ترکیب ہے روز، اور نئے نقشے نکلتے ہیں

شہیدِ ناز کو تیرے جہاں لے جاکے گاڑا تھا
یہ حالت ہے کہ واں سے خون کے نالے اُچھلتے ہیں

ٹلیں گے لے کے ہی، دل کے عوض اُس شوخ کا بوسہ
جو وہ دل لینے پر مچلا، تو اب ہم بھی مچلتے ہیں

جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھ دے ہے وہ ظالم
جو قاصد جائے، تو قاصد کے واں نلّے نکلتے[1] ہیں

کچھ ان روزوں تو میں یہ رنگ دیکھا اُس کی مجلس کا
کبوتر تِکّے[2] ہو جاتے ہیں اور مکتوب جلتے ہیں

عبث تو کوہِ غم سے کر رہا ہے رات دن کُشتی
کوئی اے مصحفی ایسے پہاڑ آگے سے ٹلتے ہیں

267

جن روزوں کہ تھا اپنا گذر اُس کی گلی میں — مارے تھا فرشتہ بھی نہ پر اُس کی گلی میں
تلوار سے مارے گئے ہیں بسکہ ہزاروں — بہتا ہے لہو تا بہ کمر اُس کی گلی میں
آئے تو، دلے آتے ہوئے تیغ کو لے کر — ہم کاٹ کر رکھ آئے جگر اُس کی گلی میں
آنے سے مرے پیشتر، اے وائے یہ کس نے — کہہ دی مرے آنے کی خبر اُس کی گلی میں

1۔ ایک نسخہ میں ''پتے نکلنا'' بھی ہے نلّے نکلنے سے مراد کونچیں کاٹنا ہو سکتا ہے۔ پتے نکلتے نہیں چھنٹتے ہیں اور قاصد کے بھی ایک ہی پتا ہو گا پتے نہیں۔ 2۔ کبوتر تکّے ہو جاتے ہیں یعنی بھون کر کھا لیے جاتے ہیں۔

یاں تک ہوئے پامال کہ پایا نہ صبا نے — کچھ خاک ہماری کا اثر اُس کی گلی میں
دو چار قدم جا کے پھر آتے ہیں ہمیشہ — رہتا ہے ہمیں روز سفر اس کی گلی میں
جی جانے کا اِس جا، کبھی مرجانے کا یعنی — ہرگام پہ ہے لاکھ خطر اس کی گلی میں
پھر گور[1] وگڑھا اُس کو وہاں کچھ نہیں ملتا — جاتا ہے کوئی خستہ جو مَر اس کی گلی میں
بیمِ سگ و دربان تو ہرگز نہیں ہم کو — ہے اپنے نصیبوں کا ہی ڈر اُس کی گلی میں
وہ گھورنے لگتا ہے ہمیں دیکھ کے کیسا — کرتے ہیں کسو پر جو نظر اُس کی گلی میں
اپنے تو شب و روز کٹے عشق میں یوہیں — کی شام گھر اپنے، تو سحر اُس کی گلی میں
یارو وہ کسی کو بھی دکھاتا ہے مُنھ اپنا — پھرتے ہیں عبث شمس وقمر اُس کی گلی میں
ہر بام سے جب آنے لگیں سیکڑوں پتھرے[2] — حیراں ہوں کوئی جائے کدھر اُس کی گلی میں
گہ باغِ ارم ہے تو کبھی گلشنِ جنّت — ہر وقت ہے اک لطفِ دگر اُس کی گلی میں
غافل نہ قدم رکھ تو، کہ رکھتے ہی قدم کے — گردن سے اُتر جائے ہے سر اُس کی گلی میں

میاں مصحفی ڈرتا ہوں کہ ہو جاؤ نہ رسوا
تم جاتے ہو بادیدۂ تر اُس کی گلی میں

268

کشتوں کی اُس کے لاشیں جواب تک گڑیں نہیں — شاید کہ جاے دفن انھیں زیرِ زمیں نہیں
کیوں اُس گلی میں آنے سے کرتے ہو ہم کو منع — اپنی تو واں کسی سے نگاہیں لڑیں نہیں
ساغرکشی کریں ہیں تری انکھڑیاں مدام — ان کافروں کو ہائے ذرا پاسِ دیں نہیں
لینا بہ زور بوسہ مرا، دیدنی تھا کل — اور اس کا مُنھ پھرا کے[3] وہ کہنا: نہیں نہیں
تیوری چڑھی ہی رہتی ہے اُس پُرغرور کی — وہ کون سی گھڑی ہے کہ چیں برجبیں نہیں
کہتا ہے مجھ سے، راہ میں خط اُس کا گم ہوا — قاصد کی بات کا مجھے اب تک یقین نہیں

1۔ گور وگڑھا = قبر (روزمرّہ) 2۔ پتھرے = پتھر (روزمرّہ)

3۔ منھ پھرا کے۔ بجائے پھیر کے (عوامی)

کوئی کہیں رہے ہے پڑا، اور کوئی کہیں ۔۔۔ اُس کی گلی میں اپنا ٹھکانا کہیں نہیں
نالے کا اُس کے ہائے اثر کون لے گیا ۔۔۔ کیا ہوگیا جو نالۂ بُلبل حزیں نہیں
چُبھتا ہے کس لیے وہ مرے دل میں مصحفی
اُس کا خدنگِ غمزہ اگر دل نشیں نہیں

269

امیدِ وفا پر میں جفائیں بھی اُٹھائیں ۔۔۔ پر تو بھی تو، آنکھیں نہ تری راہ پر آئیں
سُنبل کو پریشان کیا بادِ صبا نے ۔۔۔ جب باغ میں باتیں تری زلفوں کی چلائیں[1]
آنکھیں جو اُٹھائیں تو کیا قتلِ دو عالم ۔۔۔ پلکیں جو جھکائیں تو مرے خوں میں ڈُبائیں[2]
کچھ بات بن آئی نہ ترے سامنے مجھ کو ۔۔۔ ہر چند کہ یوں جی میں بہت باتیں بنائیں
جب پلکوں سے اک اشک کا قطرہ نہ گرے تھا ۔۔۔ رورو کے میں ندیاں اِنہیں پلکوں سے بہائیں
تھا بسکہ خجل اپنی وہ پیماں شکنی سے ۔۔۔ شب مل جو گیا مجھ سے تو آنکھیں نہ ملائیں
جب میں نے کہا: "آنکھیں چھپا" کھول دیا منھ ۔۔۔ جب میں نے کہا: "مُنھ کو دکھا"، آنکھیں دکھائیں
شب در تلک اُس کے جو گیا میں، تو کھڑے ہو ۔۔۔ پردے میں، کئی باتیں مجھے اُس نے سنائیں
ہم عہدہ برآ ہو نہ سکے طوقِ جنوں سے ۔۔۔ دیوانوں کی اس فصل میں زنجیریں بڑھائیں
مجروح ہوا میں، کہ تری پلکوں نے مجھ پر ۔۔۔ نیزے کبھی پھینکے، کبھی تلواریں چلائیں
اے مصحفی یک شب نہ کبھی چین سے سویا
کس کافرِ بے رحم سے میں آنکھیں لڑائیں

270

ہے غلط تجھ سے جو اُمید بھی رکھتے ہیں ۔۔۔ ہم تو دستِ تہی اے سروِ سہی رکھتے ہیں
قتل کا کس کے ارادہ ہے، جو اس سج دھج سے ۔۔۔ آپ نت ہاتھ میں تلوار بھی رکھتے ہیں

1۔ بات چلانا = تذکرہ کرنا (روزمرّہ) 2۔ ڈبائیں بجائے ڈبوئیں (روزمرّہ)

دل تمھیں دیں ہیں، فقیروں کی بھی ہو نذر قبول — ہم بساط اپنی میں اے دوست یہی رکھتے ہیں
کرتے ہوویں گے کسی ساتھ مروّت خوباں — ساتھ میرے تو وہی کم نگہی رکھتے ہیں
لذّتِ درد نہ تا اُس سے نکلنے پاوے — بھر کے زخموں میں نمک ہم اُنھیں سی رکھتے ہیں
کیا کریں نذر تری، تو ہی کہہ اے زلف سیاہ — ہم تو جوں شانہ فقط دستِ تہی رکھتے ہیں
جی میں آتا ہے کروں اُن کو میں اک دن سیدھا — بال زلفوں کے تری مجھ سے کجی رکھتے ہیں
یہ جو چاہیں کہ ہو، تیرا سا نمک[1]، سو معلوم — عشوہ و ناز و ادا یوں تو سبھی رکھتے ہیں

مصحفی کا نہیں تو سوز کا کہنا مانو
ٹک ادھر دیکھو میاں، ہم بھی تو جی رکھتے ہیں

271

مژگاں تری جب تک کہ صف آرا نہ ہوئیں تھیں — آہوں کی مری چھڑیاں[2] بھی برپا نہ ہوئیں تھیں
یوں مل گئے خوبانِ جہاں خاک میں سارے — وہ صورتیں گویا کبھی پیدا نہ ہوئیں تھیں
شوخی نے ترے حُسن کی اُن کو بھی لُبھایا — جو آنکھیں کبھی محوِ تماشا نہ ہوئیں تھیں
مجھ کو ہی نہ کچھ یاد رہیں، ورنہ شب وصل، — باتیں مری اور یار کی کیا کیا نہ ہوئیں تھیں
ندیاں مری پلکوں سے پڑی بہتی تھیں، لیکن — آنکھیں کبھی اِس طرح سے دریا نہ ہوئی تھیں
اُن کو بھی ترے عشق نے بے پردہ پھرایا — جو پردہ نشیں عورتیں رُسوا نہ ہوئیں تھیں
دیکھے تھا میں وزدیدہ کبھی اُس کی طرف کو — کم بخت نگاہیں مری رسوا نہ ہوئیں تھیں

اے مصحفی اس جنبشِ داماں نے کھلا دیں
جو مُنھ مُندی[3] کلیاں کہ کبھی وا نہ ہوئیں تھیں

272

پہلو میں کہاں تک دلِ بے تاب کو دابیں — یارب یہ زمیں کی کہیں کھنچ جائیں طنابیں

1۔ نمک = ملاحت 2۔ چھڑیاں۔ شاہ مدار کے میلے میں جانے والے چھڑیاں لے کر چلتے تھے

3۔ منھ مُندی = منھ بند

قوّت سے ترے پاے نگاریں کی کریں ہیں — خورشید سے پنجہ ترے گھوڑے کی رکابیں
جب دل کا جہاز اپنا تباہی میں پڑے ہے — لے دوڑیں ہیں آنسو وو ہیں آنکھوں کی غرابیں[1]
اس بات کا کھینچے گا تو خمیازہ کسی روز — پیتا تو ہے جاجا کے لَونڈوں[2] میں شرابیں
ہو جائے جو بے پردہ تو جل جائے دو عالم — اُس حسنِ جہاں سوز کے حائل ہیں نقابیں
اس سختی سے، کہہ کس کے تئیں ذبح کیا ہے — جو خوں میں بھری ہیں تری تلوار کی نابیں[3]
خوباں کا چلن جو ہے، نہیں لطف سے خالی — اک طرفہ ادا رکھتی ہیں کافر کی جرابیں
بادامِ کواکب سے ہوا مجھ پہ یہ روشن — نعمت سے بھریں ہیں یہ سب افلاک کی قابیں

ہرگز ورقِ دل کے نہ مضمون کو پہنچا
اے مصحفی کیں جمع عبث تو نے کتابیں

273

خنجر کی میاں پونچھ تو لوہو بھری نابیں — ہم جب تئیں کشتے کو ترے خاک میں دابیں
کچھ تجھ کو خبر ہے کہ نہیں، ہو کے دو ٹکڑے — مہ آپ بنا ہے ترے توسن کی رکابیں
دیواں کو مرے دیکھ کے یوں کہنے لگا وہ: — ''بکتی ہوئی پھرتی ہیں بہت ایسی کتابیں''
آگاہ ہوں میں خوب لغت ہائے فلک سے — دیکھی ہوئی ہیں میری تو یہ ساتوں نصابیں
افراد ہیں یہ جتنے کہ ارضی و سماوی — سچ پوچھو تو ہیں چہرہ بازی[4] کی نقابیں
رنگینی سے خالی نہیں از بسکہ وہ، کافر — دل خون کریں ہیں ترے پانو کی جرابیں

اے مصحفی اب چکھیو مزا زُہد کا، تم نے
مے خانے میں جاجا کے بہت پی ہیں شرابیں

274

کر دل کی ذرا سیر، کہ ہے سیر اِسی میں — عاشق کا بنا ہے حرم و دیر اِسی میں

1۔ غرابیں = چھوٹی کشتیاں 2۔ لَونڈوں = حسینوں، طرحداروں میں
3۔ ناب۔ تلوار میں گہری لکیریں 4۔ چہرہ بازی = بہروپ، بکھوٹا

دریاے محبت سے نہ باہر نکل اے دل — ہے شوقِ شنا تجھ کو تو تُو پَیر اِسی میں
مذکور جو کرتا ہوں میں اُس شوخ کا ہر جا — سُن سُن کے موئے جاتے ہیں بس غیر اِسی میں
بیٹھوں ہوں جو اُس کو میں، تو کہتا ہے وہ ظالم — اُٹھ جا ابھی یاں سے، ہے تری خیر اِسی میں
اے مصحفی ہر دم نہ کر اس شوخ کا شکوہ
جانے بھی دے بڑھتا ہے میاں بَیر اِسی میں

275

جی تلک داوٗ محبت میں لگا بیٹھا ہوں — ننگ و ناموس سے میں ہاتھ اُٹھا بیٹھا ہوں
ڈھونڈتا ہے مجھے وہ تیغ لیے، اور میں وہیں — ڈر کے مارے پسِ دیوار چھپا بیٹھا ہوں
جب ذرا آئی ہے طاقت، تو نکل کر گھر سے — شوق کے مارے تری راہ میں آ بیٹھا ہوں
ہاتھ اب طرّۂ سنبل کو لگانے کو نہیں — قسم اُس شوخ کی زلفوں کی میں کھا بیٹھا ہوں
جب کبھی تیغ نکالی ہے مرے قاتل نے — سب سے پہلے میں ہی میدان میں جا بیٹھا ہوں
اُس نے غصّے سے اگر مجھ کو پکارا ہے کہیں — میں بھی جھنجھلا کے اُسے گالی سنا بیٹھا ہوں
طرفہ صحبت ہے کہ خلوت میں شبِ وصل کے بیچ — وہ کھنچا مجھ سے تو میں اُس سے کھنچا بیٹھا ہوں
غیر مجلس سے جو میں اُس کو اُٹھاتا ہوں تو وہ — یہی کہتا ہے کہ چل بھی، تجھے کیا، بیٹھا ہوں
کیا بُری خو ہے تری، تجھ کو کہا اے ہم دم — چھیڑ مت مجھ کو میں اس وقت رُکا بیٹھا ہوں
مصحفی مجھ کو نہ کر شعر و سخن کی تکلیف
اِس گھڑی جان سے میں اپنی خفا بیٹھا ہوں

276

مجھ کو اُس بت سے ملا دے تو سرِ راہ کہیں — سن لے میری بھی شتاب اے مرے اللہ کہیں
کوچۂ زلف میں پھرتا ہوں بھٹکتا کب کا — شبِ تاریک ہے، اور ملتی نہیں راہ کہیں
آہ کرنے سے دلا تیرے مجھے یہ ڈر ہے — ہو کے بجلی نہ پڑے تجھ پہ تری آہ کہیں

جی درازی سے تو اب اس کی بتنگ آیا ہے یا الٰہی یہ شبِ ہجر ہو کوتاہ کہیں

دوستی کا جو مرے ساتھ تو دم بھرتا ہے دشمن اس بات سے ہو جائے نہ آگاہ کہیں

مجھ کو اب تابِ غمِ عشق نہیں ہے، اے کاش جان ہی لے کے ٹلے یہ غمِ جاں کاہ کہیں

جب مرے پاس سے یار اُٹھ ہی گیا، مجھ کو کیا خواہ وہ غیر کے گھر جا کے رہے، خواہ کہیں

چاہ کا اُس کی ہی تو ذکر کیا کرتا ہے
تجھ کو رسوا نہ کرے مصحفی یہ چاہ کہیں

277

یارو ہماری گر اُسے چاہ اِس قدر نہیں ہم کو بھی دوستی کا نباہ اِس قدر نہیں

بوسہ لیا ہے میں نے کفِ پا کا آپ کے گر بخش دیجیے تو گناہ اس قدر نہیں

کس طرح اُس کی تیغ سے عاشق کا سر بچے ہاتھوں کی کچھ پناہ، پناہ اس قدر نہیں

منھ پھیر لے ہے دیکھ کے ہم کو وہ طفل شوخ ہر چند اپنا حال تباہ اس قدر نہیں

چاہیں کہ اس کے ہجر میں ہم آہ کر سکیں طاقت ہمارے جسم میں آہ اس قدر نہیں

نزدیک اپنے، عشق کی منزل ہے دو قدم گر پانو اُٹھایئے تو یہ راہ اس قدر نہیں

کرتے ہیں جس قدر کہ فقیروں سے یہ غرور ان منعموں کی حشمت و جاہ اس قدر نہیں

چھاتی سراہیے اُنھیں لوگوں کی، جو دلا کہتے ہیں زخمِ تیغ نگاہ اِس قدر نہیں

اس کی ادائیں مصحفی کرتی ہیں مجھ کو ذبح
صورت میں تو وہ غیرتِ ماہ اس قدر نہیں

278

یار بن زیست کا کچھ لطف جوانی میں نہیں زندگانی کا مزا عالمِ فانی میں نہیں

قاصد آ کے کبھی دل اپنے کو خوش کرتا تھا اب اثر اُس کی بھی تقریر زبانی میں نہیں

غیر اِس کے کہ نکلتا ہے ذرا دل کا بخار فائدہ اور تو کچھ اشک فشانی میں نہیں

تیری تصویر رگِ گل سے مگر کھینچی تھی　　یہ نزاکت قلمِ صنعتِ مانی میں نہیں
اور ہی بات ہے ہم جس کو مُتھا کرتے ہیں　　بحث اپنی کبھی الفاظ و معانی میں نہیں
مصحفی درد ٹپکتا ہے سخن سے تیرے
غزل اس لطف کی دیوانِ فغانی میں نہیں

279

سِرّ جہاں سے ہم کو خبر ہے بھی اور نہیں　　ایک واہمہ سا پیشِ نظر ہے بھی اور نہیں
دیکھے ٹک آنکھ کھول کے غافل جو تو، تو پھر　　ہستی تری برنگِ شرر، ہے بھی اور نہیں
کیا امتحاں کرو ہو ہمارا بہ تیغ و تیر　　ہم لوگ وے ہیں جن کے جگر ہے بھی اور نہیں
انجام کیا ہو اِس شبِ ہجراں کا دیکھیے　　طالعؑ سے تو امیدِ سحر ہے بھی اور نہیں
خوباں کے کیا دہان و کمر کا کروں میں ذکر　　ان لوگوں کے دہان و کمر ہے بھی اور نہیں
لیتا ہے جب وہ ہاتھ میں آئینہ اُس گھڑی　　باہم قرانِ شمس و قمر ہے بھی اور نہیں
دیکھی ہے جب سے ہم نے وہ شمشیرِ آب دار　　جوں شمع اپنے دوش پہ سر ہے بھی اور نہیں
ازبسکہ دردو داغ سے پایا ہے اُس نے رنگ　　نالے میں عاشقوں کے اثر ہے بھی اور نہیں
گم گشتگانِ بادیۂ عشق کے تئیں　　ریگِ رواں کی طرح سفر ہے بھی اور نہیں
بیم و امید ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر　　کشتی نشیں کو جیسے خطر ہے بھی اور نہیں
وے شورشیں رہیں نہیں ہجراں کی مصحفی
اب اُس گلی میں اپنا گذر ہے بھی اور نہیں

280

ساقی تو مے پلا مجھے بھر بھر گلابیاں　　پھر اک گھڑی کو دیکھ مری بد شرابیاں
اک عمر تک تو دست و گریباں رہیں مدام　　بجلی کی کوندیں، دل کی مرے اضطرابیاں
ہے تر بتر لہو میں جو دامان و آستیں　　یہ چشمِ خوں فشاں کی ہیں ساری خرابیاں

کیا کیا نہ جی میں گذرے ہے آتی ہیں جب کہ یاد　　عالم میں وہ نشے کے تری بے حجابیاں
مشکل کہ دے کسی کو سواری یہ مصحفی
ہیں توسنِ فلک میں جو یہ بدرکابیاں

281

چلتے چلتے جو تری راہ میں آجاتے ہیں　　مہ و خورشید منہ اپنے کو چھپا جاتے ہیں
تو جو ہوتا ہے کبھی گھر میں، تو شوخی کر کے　　تیرے درباں ہی کی ہم گالیاں کھا جاتے ہیں
یاں تک آنکھوں میں کھٹکتا ہوں میں ان کی کہ بتاں　　دیکھتے ہیں جو، نظر مجھ سے چُرا جاتے ہیں
میں تو جاتا نہیں، پر سیرِ چمن کرنے کبھو　　دل کے پُرزے مرے، ہمراہِ صبا جاتے ہیں
راہ رَو، وے ہیں کہ جاتے ہوئے دل سے اپنے　　اُلفتِ کعبہ و بت خانہ گرا جاتے ہیں
آ کے کوچے میں ترے، دل کی تسلّی کے لیے　　روزنِ در ہی سے ہم آنکھ ملا جاتے ہیں
کیا عجب اس کا اگر صبح کے ہوتے، نالے　ق　خس و خارِ غم و اندوہ جلا جاتے ہیں
رسم ہے قافلے والوں کی، کہ جنگل کے تئیں　　یک بیک چلتے ہوئے آگ لگا جاتے ہیں
مصحفی طول کھنچی صحبتِ اشعار اب، تو
اک غزل اور بھی یاروں کو سنا جاتے ہیں

282

جب بتاں زلف کی زنجیر دکھا جاتے ہیں　　خون سودائیوں کے جوش پر آجاتے ہیں
دیکھیے کیوں کے طرف اُس کے کہ نظّارہ پرست　　طرزِ نظّارہ کو آنکھوں میں اُڑا جاتے ہیں
ہم کو جس دل نے پھنسایا ہے ترے دام کے بیچ　　ہم وہی دل تری زلفوں میں پھنسا جاتے ہیں
شوخ چشموں کے جو ہوتا ہے مقابل کوئی شخص　　گھور گھور اُس کو یہ نظروں میں ہی کھا جاتے ہیں
برگِ گُل اُڑتے ہیں، یا میرے جگر کے ٹکڑے　　ہر طرف دست و گریبانِ ہوا جاتے ہیں
عجب عالم ہے تری زلف کے دیوانوں کا　　جب بہار آئے ہے زنجیر تڑا جاتے ہیں

وہ سُنے یا نہ سُنے، اُس کو ہم اپنا احوال　　پسِ دیوار کھڑے ہو کے سنا جاتے ہیں
عشق ہے اُن کو، جو جاتے ہوئے کوچے میں ترے　　اپنے پانو کے نشاں آپ ہی مٹا جاتے ہیں

مصحفی جوش پہ ہے بحرِ معانی، ہم تو
اب کی پھر زورِ طبیعت کو دکھا جاتے ہیں

283

بیٹھے بیٹھے جو کبھی رونے پہ آ جاتے ہیں　　خوں کے نالے ترے کوچے میں بہا جاتے ہیں
یہ وہ کوچہ ہے جہاں گالیاں کھانے والے　　سیکڑوں سنتے ہیں اور لاکھوں سنا جاتے ہیں
ناصحوں کی میں نصیحت سے بجاں آیا ہوں　　یہ تو بک بک کے مری جان بھی کھا جاتے ہیں
مشتِ پر لاتے ہیں اُس بزم میں گر پروانے　　شعلۂ شمع پہ یک مُشت جلا جاتے ہیں
وہ بڑے مرد ہیں جو سامنے تیرے آ کر　　تیغِ ابرو کا تری وار بچا جاتے ہیں
ساغرِ زہر بھی دیتا ہے فلک گر ہم کو　　ہاتھ سے لیتے ہی، ہم اُس کو چڑھا جاتے ہیں
ملکِ ہستی سے جو جاتے ہیں جریدہ[1] ہو کر　　راہ میں اپنا سب اسباب لُٹا جاتے ہیں
ہاتھ مہندی رچے دکھلا کے ہمیں محبوباں　　اور بھی دل میں محبت کو رچا جاتے ہیں

اس زمیں میں غزل اک اور بھی رنگیں کہہ کر
مصحفی چار چمن اس کو بنا جاتے ہیں

284

کبھی پردے سے جو وے آنکھ لڑا جاتے ہیں　　جو کہ دیکھا نہیں ہم نے، وہ دکھا جاتے ہیں
اُس کے کوچے کی طرف جب میں لگوں ہوں جانے　　دل میں اندیشے کئی اس گھڑی آ جاتے ہیں
یہ وہ صحرا ہے، جہاں راہوں کے چلنے والے　　چلتے چلتے ہی زمیں بیچ سما جاتے ہیں
قصہ خواں گرچہ نہیں ہم، پہ خوشامد کے لیے　　داستاں روز نئی کہہ کے سنا جاتے ہیں

1۔ جریدہ = تنہا، بے تعلق

یہ بگولے جو یہاں اُٹھیں ہیں، صحرا سے کبھو
آ کے تُربت پہ مری خاک اُڑا جاتے ہیں

مل گیا خاک میں جب اشک، تو آئی یہ صدا
یعنی جاتے ہیں تو یوں اہلِ صفا جاتے ہیں

اتنے مشتاقِ تماشا ہیں کہ کوچے سے ترے
ماہ و خورشید بھی نت رُو بقفا[1] جاتے ہیں

تو وہ استادِ مسلّم ہے کہ خوبانِ جہاں
تجھ کو آ کر سبقِ ناز سنا جاتے ہیں

مصحفی کیوں کے چھپے اُن سے مرا دردِ نہاں
یار تو بات کے انداز سے پا جاتے ہیں

285

سرزنش یاں خاکِ کوے یار کو ہے اور نہیں
پایمالی سایۂ دیوار کو ہے اور نہیں

بس کہ ہے نرمی مرے معشوق کی رفتار میں
اُس سے نسبت کبک کی رفتار کو ہے اور نہیں

ذبح کرتا ہے وہ مجھ کو، ہاتھ اپنا تھام تھام
خاطرِ رحم اس بتِ خوں خوار کو ہے اور نہیں

بسکہ وہ ہردم شرابِ ناز کا مخمور ہے
حال سے میرے خبر اُس یار کو ہے اور نہیں

دیکھ دیکھ آئینہ، ہنس پڑتا ہے، اپنے حسن سے
آگہی اُس طفلِ گل رخسار کو ہے اور نہیں

پرتوِ رُخ سے ترے اے آفتابِ دل فروز
چہرہ افروزی گل و گلزار کو ہے اور نہیں

مجھ کو آئینے سے یہ روشن ہوا اُس کے حضور
بے قراری طالبِ دیدار کو ہے اور نہیں

مصحفی مرتا ہے تجھ سے خوبرو پر اس لیے
آرزوے مرگ اِس بیمار کو ہے اور نہیں

286

نقشِ شیریں میں تری حسن کا پرداز کہاں
یہ نزاکت یہ ادا اور یہ انداز کہاں

طائرِ سدرہ سے میں تیز پَری کرتا ہوں
دیکھیو پہنچی ہے یارو مری پرواز کہاں

عرشیوں کو مرے نالوں نے خبر عشق کی دی
بات لے پہنچے ہیں دیکھو تو یہ غمّاز کہاں

1۔ رو بہ قفا= پشت کی طرف منھ کر کے

یادِ دہلی سے تو جی اپنا بھرا آتا ہے ہائے وے سیریں، وہ طفلانِ خوش آواز کہاں
عاشقِ عالمِ خط قدر تری کیا جانے اس نے دیکھا ہے ترے حسن کا آغاز کہاں
آیا مشرق کو تو مغرب سے، اب آگے آگے دیکھوں لے جاوے مجھے طالعِ ناساز کہاں
دم رُکا آئے ہے تنہائی سے یارب میرا اُٹھ گئے چھوڑ کے مجھ کو مرے دم ساز کہاں
ہاتھ میں شیشۂ مے، ناز سے ہلتا جُلتا آج جاتا ہے تو اے سروِ سرافراز کہاں
بالِ طاؤس کو چھب اُس کی دکھا دیتا میں یارب اِس وقت گیا وہ بتِ طنّاز کہاں
کیوں کے نسبت دوں رگِ گل کو کمر سے تیری نازکی اُس کی مسلّم ہے، پہ یہ ناز کہاں
مصحفی یار تو سب دشمنِ جاں ہیں واللہ
راز دل کس سے کہوں اپنا میں، ہمراز کہاں

287

اوّل تو تھوڑی چاہت تھی درمیاں میں پھر بات کہتے لُکنت آنے لگی زباں میں
کیا جانیے چمن میں کیا تازہ گل کھلا ہو آئے ہیں آگ رکھ کر ہم اپنے آشیاں میں
ابرو کا اُس کی یارو، کیا ہم سے ہو سکے وصف سورج کو جس نے کھینچا اک گوشۂ کماں میں
وہم اور گمان اپنا کیا کام کر سکے واں نے وہم میں سماوے آوے نہ جو گماں میں
صورت پہ اُس کی یارو جاتی ہے جان اپنی ہر چند خوبصورت ہیں اور بھی جہاں میں
آ جائے غش تجھے بھی، اے ماہ گر تو دیکھے اُس کے بدن کا جلوہ، پیراہنِ کتاں[1] میں
مبدا سے کوئی اب تک، واقف نہیں ہے، ہے ہے یوسف کو گم کیا ہے اندھوں کے کارواں میں
دامن ہو میرا خالی لختِ جگر سے کیوں شب یہ تازہ گل میں دیکھوں دامانِ آسماں میں
اے مصحفی وہاں سے، ہم خوب رو کر آئے
سوے چمن گئے تھے کیوں موسمِ خزاں میں

1۔ کتاں ۔ ایک کپڑا جس کے بارے میں یہ شہرت تھی کہ چاندنی کی تاب نہ لا کر پھٹ جاتا ہے

288

عشق بازی ہے کچھ یہ کھیل نہیں — اس میں ہر بوالہوس کا میل نہیں
مجھ سے خال اُس کے ایسے رُو کھے ہیں — تو کہے ان تلوں میں تیل نہیں
سُرمہ، دنبالہ دار آنکھوں میں — سچ جو پوچھو پٹا ہے سیل نہیں
کون سی جاگہ، لکھنؤ کے بیچ، — خوبرویوں کی ریل پیل نہیں
کیوں کے سنبل کی بُو مجھے خوش آئے — اُس کے بالوں میں تو پھُلیل نہیں
کون سا وقت ہے کہ آنکھوں سے — سیلِ خونِ جگر کی ریل نہیں

مصحفی دل چمن میں کیوں کے لگے
وہ چنبیلی وہ رائے بیل[1] نہیں

289

اقطاعِ زمیں سارے، گر دیکھیے موزوں ہیں — کیا کیا نہ سہی قامت[2] اِس خاک میں مدفوں ہیں
شاعر کو خبر کب ہے، جوان کے تئیں باندھے — یک جنبشِ لب ہی میں یاں سیکڑوں مضموں ہیں
لیلائے عرب ہے تو، آشوبِ ملاحت ہے — دلّی کے پری پیکر سارے ترے مجنوں ہیں
یہ رنگِ حنا تو نے اے شوخ نکالا ہے — یا خون سے عاشق کے پنجے ترے گلگوں ہیں
بے پردگی اب تیری پہنچی ہے میاں یاں تک — جو ہم سے بھی بازاری، رُخ کے ترے مفتوں ہیں
جس دن سے ترا چہرہ اُن کو نظر آیا ہے — اُس دن سے میاں میرے سب یار دگرگوں ہیں
افسونِ محبت کو اک ہم تو سمجھتے ہیں — نے سحر کے بندے ہیں نے قائلِ افسوں ہیں
جس دن سے میں دیکھا ہے رنگِ کفِ ساقی — پلکیں مری رنگیں ہیں آنکھیں مری پُر خوں ہیں

اے مصحفی اور ہی ہے، اندازِ غزل گوئی
کہنے کے تئیں یوں تو شاعر سبھی موزوں ہیں

1۔ پھولوں کا نام 2۔ سہی قامت = سروقامت

290

چوسَر میں ہم اُس شوخ سے جی ہار گئے ہیں دین و دل و ایمان سبھی ہار گئے ہیں
نے نے یہ غلط، جی تو ہمیں پاس ہے لیکن دوچار سپاری کی ڈلی ہار گئے ہیں
جیتا ہے جو یک شیشہ تو پھر مارے خوشی کے دو شیشہ شرابِ عنبی ہار گئے ہیں
بازی رہی ہے یو ہیں سدا اس کی ہماری جیتے ہیں کبھی کچھ، تو کبھی ہار گئے ہیں
پوچھا جو میں کیا جیتے میاں مصحفی تم سے
یوں ہنس کے کہا: وہ تو ابھی ہار گئے ہیں

291

جن ہاتھوں سے لیتا تھا کسو کی میں بلائیں اُن ہاتھوں سے اب مانگوں ہوں دن رات دعائیں
جس وقت کہ دیکھوں ہوں میں کافر کی ادائیں مژگاں سے نگاہیں مری لیتی ہیں بلائیں
تو دوٗر از انصاف اگر ہے، تو ہوا کر احسنت کہیں ہیں مجھے میری ہی وفائیں
یہ بھی مری قسمت میں لکھا تھا کہ شب وصل یوں طالعِ دُوں تجھ سے مجھے دُور سلائیں
جی میں کبھی انصاف تو تو اپنے کیا کر کیا کیا سہیں ہیں دیکھ تو میں تیری جفائیں
گلشن میں بہار آئی، گئے پھول، جھڑے نخل افسوس جو ہم اب بھی گریباں نہ سِلائیں
بیدار ہیں طالع اُنھیں لوگوں کے جو ہرگز پانْو پہ ترے رکھ کے سر اپنا نہ اُٹھائیں
اے مصحفی وہ مجھ کو بچھڑتے ہی گیا بھول
یہ جی میں نہ آیا کہ کبھی خط تو بجائیں[1]

292

ہمارے داغِ جگر جب نمود کرتے ہیں تو اُن کو دیکھ کواکب سجود کرتے ہیں
جہاں میں ہم سا بھی کم ہوگا کوئی دیوانہ زیانِ جاں میں ہیں، اور فکر سود کرتے ہیں

1۔ بجائیں = بھیجیں (عوامی)

ہے بوے عشق بھری میرے استخوانوں میں تب ہی تو آگ پہ یہ کارِ عود کرتے ہیں
موے ہیں حسرتِ دیدار میں تری جو غریب ہم اُن کے واسطے ختم دَرود کرتے ہیں
ہمیں سلام نہیں، اور غیر کے گھر میں ہمیشہ نامہ و قاصد دُرود کرتے ہیں
جو رکھیے آگ پہ تو اب بھی استخواں میرے طرح فتیلۂ عنبر کی دوُد کرتے ہیں
سیاہ بختی کا کِس کی اثر ہے جو خوباں لبوں کو اپنے مسی سے کبود[1] کرتے ہیں
جو مصحفی نے کیا اپنے ساتھ اے ظالم
کوئی یہ کام نصاریٰ جَہود کرتے[2] ہیں

293

باتوں میں آپ ہنس ہنس نت زہر گھولتے ہیں ہم سے بھی بے حیا ہیں جو تم سے بولتے ہیں
تیرِ نگہ ہوا ہے دل میں مرے ترازو تس پر بھی آپ ہر دم تیغے کو تولتے ہیں
تیری بھی فتنہ سازی لیویں گے دیکھ اے حشر خوابِ عدم سے اب کی جو آنکھ کھولتے ہیں
سینے پہ میرے ہر دم رکھتے ہیں ہاتھ خوباں دل لے چکے، پھر اس میں یہ کیا ٹٹولتے ہیں
جس رہ کہ مصحفی میں روتا ہوا گیا تھا
اُس رہ کے جانے والے موتی ہی رولتے ہیں[3]

294

جیتا رہوں کہ ہجر میں مر جاؤں، کیا کروں تو ہی بتا مجھے میں کِدھر جاؤں کیا کروں
ہے اضطرابِ دل سے نپٹ عرصہ مجھ پہ تنگ آج اُس تلک بہ دیدۂ تر جاؤں کیا کروں
حیران ہوں کہ کیوں کے یہ قصہ چکے مرا سر رکھ کے تیغ ہی پہ گذر جاؤں کیا کروں
بتلا دے تو ہی واشدِ دل کا مجھے علاج گلشن میں اے نسیم سحر جاؤں کیا کروں

1۔ کبود = نیلا رنگ ہلکی سیاہی کے ساتھ 2۔ نصاریٰ جہود = عیسائی اور یہودی
3۔ موتی ہی رولتے ہیں، یعنی روتے ہیں (کنایہ)

بیٹھا رہوں کہاں تلک اُس در پہ مصحفی
اب آئی شام ہونے کو، گھر جاؤں کیا کروں

و

295

جفا شعار جو ہو سو وفا شعار نہ ہو — کوئی امیدِ وفا پر کسی کا یار نہ ہو
یہ آرزو ہے کہ جو اُس گلی میں مرجاوے — وہ خاک ہو، پہ تری راہ کا غبار نہ ہو
ذرا تو رہ دلِ بے صبر، کیا ہے بے صبری — ملے گا یار بھی، اتنا تو بے قرار نہ ہو
گلی میں اُس کی میں جاتا ہوں، راہ میں مجھ سے — خدا کرے کہ کوئی آشنا دوچار نہ ہو
بھلا وہ غم زدہ سیرِ چمن کو کیا جاوے — ہوائے خندۂ گل جس کو سازگار نہ ہو
وہ اُنگلیوں کو کرے جب کہ اپنی فندق بند — حواسِ خمسہ میں، ممکن ہے انتشار نہ ہو
زمینِ باغ سے اُگتے ہیں لالہ خوں آلود — کسو شہید کی تازہ کوئی مزار نہ ہو
نہ جاوے لگ کے گر اس گل بدن سے موجِ نسیم — چمن کے بیچ کبھی موسمِ بہار نہ ہو
کیے ہیں فرش، میں اُس کی گلی میں خارِ مژہ — کہ تا یہاں قدمِ غیر کا گذار نہ ہو
علاج دل کا مرے ہے اگر چہ صبر و شکیب — میں کیا کروں جو مرا دل پہ اختیار نہ ہو
خبر شتاب لے اِس مرغِ دل کی اے صیاد — کہیں تلف ترے ہاتھوں سے یہ شکار نہ ہو
ذرا سمجھ کے قدم شب کو گھر سے باہر رکھ — برونِ در کوئی تازہ امیدوار نہ ہو
بڑا ستم ہے جو اِس فصلِ گل میں ناصح سے — رفو مرا یہ گریبانِ تار تار نہ ہو
کبھی ستارہ نہ چمکے زمین کا ہرگز — جو کفش پانو میں اُس کے ستارہ دار نہ ہو
میں بے دماغ ہوں صحبت سے اپنی، کیا ہے عجب — کسی کے ساتھ جو صحبت مری برآر نہ ہو
تمام دیدۂ حیراں کی شکل ہے نرگس — کہیں اسے بھی مرے گل کا انتظار نہ ہو

چلا ہے شوق مجھے لے کے آج اُس کی طرف مزہ تو ہے جو کوئی در پہ پردہ دار نہ ہو
الٹ دے جب کہ تو مکھڑے سے اپنے طرف نقاب کسی کا رازِ نہاں کیوں کے آشکار نہ ہو
ہزار بار تجھے آگے ہم نے سمجھایا نہ ملیے اُس سے کبھی آپ سے جو یار نہ ہو
خدا کے واسطے اے مصحفی کہا بھی مان
تو اُس کے پیچھے میاں اِس قدر تو خوار نہ ہو

296

کیا کم ہوا ہے زخموں سے میرا بدن اُتو اب تیغ سے کرو ہو جو چادر کفن اُتو[1]
تو ناز کی تو دیکھ، کہ موجِ نسیم سے ہو جاتے ہیں یہ برگِ گل و یاسمن اُتو
زینت سے کام کیا اُنھیں جو ہیں پلاس پوش[2] ہوتا کہیں سُنا ہے لباسِ خشن اُتو
مجرم کو گرم لوہے سے دیتے ہیں کیوں کے داغ یہ بات اُن سے پوچھیے ہو جن کا فن اُتو
آئے ہے آج گرم ہوا صحنِ باغ میں کرنے کو بوٹہ دار قبائے چمن اُتو
ایمن ہیں تیغِ کاریِ گردوں سے اہلِ فقر ہرگز نہ میں سنا کہ کریں پیرہن اُتو
زیبندگی سے کام ہے کیا ہم کو مصحفی
اپنے لباس کی ہے یہاں ہر شکن اُتو

297

یا الٰہی مرے نالے کا اثر پیدا ہو شبِ ہجراں کی سیاہی سے سحر پیدا ہو
ہم سے پائی نہیں جاتی کمر اُس کی اے زلف تو ہی کچھ راہ بتا دے تو کمر پیدا ہو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم خاکِ کفِ پا کو تری طرفہ اکسیر ہے، یہ خاک اگر پیدا ہو
کھینچ کر تیغ کو آپہنچے جو قاتل سر پر سینہ کر دیجے سپر گر نہ سپر پیدا ہو
مائلِ گریہ میں یاں تک ہوں کہ اعضا پہ مرے جس جگہ داغ دیں، واں دیدۂ تر پیدا ہو

1۔ اُتو = لوہے کی سلاخیں گرم کر کے اُس سے کپڑے پر دھاریاں اور ڈزائن بنائے جاتے تھے اُسے اُتو کرنا کہتے ہیں۔ 2۔ پلاس پوش = موٹا کھر درا لباس پہننے والے

وضع ایسی نہ بنا اپنی کہ جس سے ظالم
دل میں لوگوں کے تری وضع سے ڈر پیدا ہو
کشتۂ رنگِ حنا ہوں میں، عجب اِس کا کیا
کہ مری خاک سے مہندی کا شجر پیدا ہو
ابر میں چاند چھپانے لگے اپنے منھ کو
ابھی پردے سے جو وہ رشکِ قمر پیدا ہو
ہو جو کشتہ تری تیغ نگہِ پنہاں کا
نہ کہیں لاش ملے اُس کی، نہ سر پیدا ہو
قدر کر قدر مرے پارۂ دل کی، اے چشم
ہے یہ وہ لعل کہ باخونِ جگر پیدا ہو
منزلِ مرگ وہ منزل ہے کہ جس منزل میں
دل میں رستم کے بھی یک بار خطر پیدا ہو
دُرِ معنی کو مرے دیکھ کے حیران رہے
گر زمانے میں کوئی اہلِ نظر پیدا ہو
مصحفی اب کی میں لکھتا ہوں غزل اک ایسی
جس کے ہر حرف سے اندازِ دگر پیدا ہو

298

وہ نہیں میں جسے مرنے کا خطر پیدا ہو
میں تو لوں مول اُسے موت اگر پیدا ہو
نخلِ ماتم ہے مری آہ، ثمر اُس کا ہے دل
نخلِ ماتم سے سنا ہے کہ ثمر پیدا ہو؟
مجھ کو پھر فکرِ دہن اُس کی کرے ہے حیراں
سو خرابی سے اگر موے کمر پیدا ہو
زندگی تیغ سے ہے شمع کے مانند مری
کاٹیں اک سر کو، تو پھر دوسرا سر پیدا ہو
سلسلہ رونے کا میرے نہیں ہوتا برہم
اشک رہ جائے تو پھر لختِ جگر پیدا ہو
یہ بھی قسمت ہے کہ لے جاویں مَلک نامۂ غیر
اپنی قسمت سے کبوتر کا نہ پَر پیدا ہو
کیا دوا ہووے یہ بیمارِ تپ ہجراں کی
گر کہیں مصرِ محبت میں شکر پیدا ہو
کس طرح سوزِ غمِ عشق چھپاوے جس کے
سانس لیتے ہوئے سینے سے شرر پیدا ہو
اُس کا کوچہ بھی عجب بھول بھلیاں ہے جہاں
نہ نکلنے کی ملے راہ، نہ در پیدا ہو
درگذر قتل سے میرے کہ پشیماں ہوگا
سخت مشکل ہے کہ پھر مجھ سا بشر پیدا ہو
قصد میں جو ترے کوچے کے گھر اپنا چھوڑے
یا الٰہی نہ اُسے زادِ سفر پیدا ہو
گاڑ دیویں مجھے جس خاک میں با چہرۂ زرد
پھر عجب کیا اگر اس خاک سے زر پیدا ہو

مصحفی کے تئیں کیا دو گے مری جان جواب
روزِ محشر جو وہ بادیدۂ تر پیدا ہو

299

تا چند رکھوں دِل میں گلستاں کی ہوس کو ہے جی میں کہ دوں آگ لگا اپنے قفس کو
کیا قافلہ جاتا ہے چلا بے خبرانہ ہرگز کوئی سنتا نہیں فریادِ جرس کو
آیا جو خیال اُس کا مرے دل میں بہ دزدی کیا خوابِ اجل لے گئی اُس رات عسس[1] کو
افسوس کہ در تک یہ فقیر آنے نہ پاوے مجلس میں تری بار ملے ناکس و کس کو
ہے جاذبِ اربابِ ہوس لذّتِ دنیا چارا نہیں زنہار مٹھائی سے مگس کو
اے شرم، تو دے اب مجھے اک آہ کی رخصت تا چند میں سینے میں کروں ضبط نفس کو
عاشق کے تئیں کھینچے ہے معشوق کی گرمی لیتا ہے اُٹھا کاہ رُبا دور سے خس کو
فتنے نے کہا دیکھ کے بوٹا سا قد اُس کا لاوے گا قیامت یہی دو چار برس کو

اے شاہِ نجف مصحفی کی ہے یہ تمنّا
ان آنکھوں سے دیکھوں ترے روضے کے کلس کو

300

مجھ سے منہ پھیر لیا غیر کے دکھلانے کو اس نے یہ چھیڑ نکالی مرے ترسانے کو
کیا جلے خاک، کہ آنے نہیں دیتا کوئی شعلۂ شمع کے نزدیک بھی پروانے کو
پھاڑ کر اپنا گریباں ابھی مجنوں کی طرح جی میں آتا ہے نکل جایئے ویرانے کو
عشقِ مجنوں سے یہ افسانہ نہیں کم لیکن کون سنتا ہے مرے درد کے افسانے کو
جو گذرتا ہے مرے دل پہ جدائی میں تری آگہی اس سے ہے اپنے کو نہ بیگانے کو
وو ہیں اُٹھ چلتے ہو، اک بات کے کہتے صاحب کتنے چالاک ہو تم غیر کے گھر جانے کو

1۔ عسس = کوتوال

مصحفی کعبے میں اب دل نہیں لگتا اپنا
ہم بھی اُٹھ جاویں گے یاں سے کسی بُت خانے کو

301

پھر عشق کا اِن روزوں آزار ہوا مجھ کو
جینا ترے ہاتھوں سے دشوار ہوا مجھ کو

پھر فصلِ بہار آئی، زنجیرِ جنوں ٹوٹی
ہے شرط خبر، سودا سرشار ہوا مجھ کو

میں خوں میں جو تڑپوں ہوں، اس کا بھی تو باعث ہے
اے ہم نفساں کچھ تو اسرار ہوا مجھ کو

پلکوں سے بلائیں لیں، میں اپنی ہی آنکھوں کی
جس وقت ترا پیارے دیدار ہوا مجھ کو

مژگاں نے تری، چھریاں اِس دل پہ چلائیں اور
سرمہ تری آنکھوں کا تلوار ہوا مجھ کو

میں اپنے تیئں درخور زنہار نہ پایا پھر
مجلس میں تری پیارے جب بار ہوا مجھ کو

اے مصحفی اک بت سے پھر آنکھ لڑی میری
ہر تار گریباں کا زنّار ہوا مجھ کو

302

بات کو میری الگ ہو کے نہ شرماؤ، سنو
کچھ کہا چاہوں ہوں میں تم سے، ادھر آؤ، سنو

میں تو جانے کا نہیں روبرو اُس کے یارو
کچھ وہ گر تم سے کہے ہے، تو تمھیں جاؤ، سنو

چھیڑنے کو مرے گر آپ کا جی چاہے ہے
بے ادب ہوں میں، مرے حق میں جو فرماؤ، سنو

بات بھی مانو کسی کی، کوئی یہ بھی ضد ہے
اپنے عاشق کے تیئں اتنا نہ ترساؤ، سنو

گل صنوبر کا اگر قصہ ہے تم پاس میاں
پڑھنے والا بھی تو موجود ہوں میں لاؤ، سنو

اے دل و دیدہ مآل اِس کا بُرا ہی سمجھو
دیکھ کر اُس کے تیئں اتنا نہ للچاؤ، سنو

مصحفی بات تو کہنے دو ذرا قاصد کو
پہلے ہی حرف میں تم اتنا نہ گھبراؤ، سنو

303

سدھاری قوتِ دل، تاب اور طاقت سے کہہ دیجو
ہوئے ہیں ناتواں ہم، بسترِ راحت سے کہہ دیجو

موا بھی میں تو اے یارو، جو یاروں سے مرے ہووے،
سلامِ شوق اُس کا تم مری تربت سے کہہ دیجو

گر اے قاصد تو اُس کے روبرو جاوے، اشارے سے
دعا میری بھی، اُس معشوقِ کم فرصت سے کہہ دیجو

سنو اے یارو، اک معشوقِ ہرجائی کے جلوے نے
پھرایا در بدر میرے تئیں، غُربت سے کہہ دیجو

بیاں جو جو کہ صورت تجھ سے کی ہے میں نے اے قاصد
تو اُس کے کان میں جھک کر اسی صورت سے کہہ دیجو

بھلا اُس کا تو دل خوش ہووے گا اس بات کو سُن کر
نہ پہنچے مدّعا کو اپنے ہم، حسرت سے کہہ دیجو

ہوا دیوانہ، تھا وہ مصحفی تیرا جو سودائی
صبا گر اُس گلی میں جائے، جمعیّت سے کہہ دیجو

304

گو کہ زنجیروں میں جکڑیں، روک اُس کی کس سے ہو — وہ وہیں جاتا ہے آخر، لاگ جس کی جس سے ہو
جی میں آتا ہے کہ گُل چھلّے[1] کے کھاؤں اس قدر — جو مرا ساعد مشابہ دستۂ نرگس سے ہو
میں تو بندہ ہوں فقط اُس کی نگاہِ لطف کا — کام کیا ہے مجھ کو، گر وہ آشنا جس تس سے ہو

1۔ گُل چھلّے کے کھانا۔ محبوب اپنی انگوٹھی گرم کر کے اُس سے کلائی داغ دیتا ہے، کہ محبت کی نشانی رہے، اسی سے اردو کا محاورہ گل چھلّے اُڑانا (عیش کرنا) بھی ہے۔

وہ نہیں ہوں میں، کروں نظارۂ خوباں کو ترک　حرکت ایسی ہاں اگر ہو، تو کسی بے حس سے ہو
دید کا ملتا جسے ہو دورگردی میں مزہ　چاہیے وہ شخص با ہر حلقۂ مجلس سے ہو
اب تو میں دل پر دیا، یارو قرارِ وصلِ یار　گو کہ دل، بے دل ہے پر یہ کام شاید اس سے ہو
میں بظاہر حد پریشاں حال پاتا ہوں تمھیں
ان دنوں میں تم تو کچھ میاں مصحفی مفلس سے ہو

305

خریدار اپنا ہم کو جانتے ہو　بھلا اتنا تو تم پہچانتے ہو
بنے گا چہرہ یہ کس کا مہ و مہر　جو تم بیٹھے صباحت[1] چھانتے ہو
اُٹھو اے زخمیانِ کوچۂ یار　عبث کیوں خوں میں ماٹی سانتے[2] ہو
وہ آنے کا نہیں اب گھر سے باہر　تم اُس قاتل کو کم پہچانتے ہو
یکا یک کر گزرتے ہو وہی جان　تم اپنے جی میں جو کچھ ٹھانتے ہو
غرض ہو آشنا اپنی ہی ضد کے　کسی کی بات کو کب مانتے ہو
گیا ہے قافلہ میاں مصحفی، اب
عبث دامن کو تم گردانتے ہو

306

گرچہ اے دل عاشقِ شیدا ہے تو　لیک اپنے کام میں یکتا ہے تو
عاشق و معشوق کرتا ہے جدا　اے فلک، یہ کام بھی کرتا ہے تو
لاکھ پردے گر ہوں تیرے حسن پر　کوئی پردوں میں چھپا رہتا ہے تو
حالِ دل کہنے لگوں ہوں میں، تو شوخ　مجھ سے یوں کہتا ہے: ''کیا بکتا ہے تو''
پاس بیٹھا اُس کے میں رویا کیا　یوں نہ پوچھا مجھ سے: ''کیوں روتا ہے تو''

1۔ صباحت = پوڈر، غازہ　2۔ سانتا (بروزن ماننا) ملانا

رات دن تو ہے مری آغوش میں میں ترا ساحل، مرا دریا ہے تو
بزم میں اُس تندخو کی دوڑ دوڑ کام کیا؟ کیوں؟ کس لیے جاتا ہے تو؟
واں نہیں مطلق ترا مذکور بھی
مصحفی کس بات پر بھولا ہے تو

307

پیکاں ترا جگر کے اگر متصل نہ ہو اغلب، کہ بعد مرگ بھی تسکینِ دل نہ ہو
دامن جھٹک کے چلتے ہو تم میری خاک سے ڈرتا ہوں اس سے شعلہ کوئی مشتعل نہ ہو
اے دل بھلا روا ہے گراں جانی اس قدر چل دور ہو کہیں، مری چھاتی کی سل[1] نہ ہو
کہتے ہیں جس کو مردمکِ چشمِ آفتاب مجھ کو گماں ہے یہ ترے عارض کا تل نہ ہو
ہے موسمِ بہار کا آغاز، قہر ہے اب بھی اگر چمن میں ہوا معتدل نہ ہو
جس کو میں ہو گذارِ پری طلعتانِ ہند وہ کوچہ کیوں کے روکشِ چین و چِگل[2] نہ ہو
تصویر تیری کہتی ہے یوں آفتاب سے کیا ڈر ہے گو میں خوب ہوں، تو منفعل نہ ہو
اے ابرِ نو بہار، برس اُس سے دور دور تربت کی میری خاک کہیں اور گِل نہ ہو
تو جانیو یہ اُس کا ہی زخمی ہے مصحفی
جس صیدِ زخم خوردہ کے پہلو میں دل نہ ہو

308

رہے مے خانے کے در پر پڑا دن رات کاہے کو بطالت[3] میں کوئی ضائع کرے اوقات کاہے کو
ہزاروں بات ہیں دنیا میں مہر و لطف کی لیکن تو ہو آزردہ جس میں کیجیے وہ بات کاہے کو
پری کا رُو و مُو تجھ میں بنایا تھا جو صانع نے بنا دی ساتھ اُس کے پھر پری کی گات کاہے کو
مرے گریہ نے کی سارے جہاں کی خانہ ویرانی ہوئی دنیا میں ایسی طرح کی برسات کاہے کو

1۔ چھاتی کی سِل = چھاتی کا پتھر 2۔ چگل = شہر کا نام 3۔ بطالت = بیکاری

اگر دیکھا تھا رخ اُس کا تو اِن آنکھوں نے دیکھا تھا
ہوا اے مصحفی دل مَورِدِ آفات کاہے کو

309

پہلو سے مرے، یار کا پیکاں نہ نکالو
میں جان بہ لب آپ ہی ہوں، مری جاں نہ نکالو

لے جا کے مجھے یار کے کوچے میں کرو دفن
تابوت مرا سوے بیاباں نہ نکالو

سج[1] روز نکالو نئی تم اپنی صد افسوس
اور دل سے مرے، وصل کا ارماں نہ نکالو

ڈرتا ہوں نہ لگ جائے نظر تم کو کسی کی
سر غُرفے سے باہر تو مری جاں نہ نکالو

یک ظلم کا ہووے گا مرا دل متحمل
تلوار نکالو تو نمک داں نہ نکالو

ملحد ہوں اگر میں، تو بھلا اس سے تمھیں کیا
منھ سے یہ سخن گبر و مسلماں نہ نکالو

قدغن ہے کہ اِس وادیِ پُر خوف و خطر میں
پانو سے کوئی خارِ مغیلاں نہ نکالو

چین اس سے ہی ہے مصحفیِ خستہ کے دل کو
رہنے دو خمِ زلفِ پریشاں نہ نکالو

310

گرچہ تم تازہ گلِ گلشنِ رعنائی ہو
پھر بھی یہ عیب ہے اِک تم میں کہ ہرجائی ہو

روٹھ کر بیٹھ رہوں میں وہ منانے آوے
کاش اتنا مجھے مقدورِ شکیبائی ہو

آمد و شد سے تو بدنام ہوں میں، اُس کو میں
مجھ کو یہ ڈر ہے کہیں اور نہ رسوائی ہو

موسمِ گل مگر آیا ہے کہ اِس رُت بَن بَن
لوگ جاتے ہیں بیاباں کو تماشائی ہو

ہم کو جو غیرِ خدا کہتے ہیں، اندھے ہیں وہ لوگ
کیا نہ سُوجھے انھیں اتنا بھی جو بینائی ہو

بے ستوں سے نہیں تیشے کی صدا آتی آج
پاس فرہاد کے شیریں نہ کہیں آئی ہو

خال و خط کا ہی تصوّر تمھیں رہتا ہے مدام
مصحفی تم بھی عجب طرح کے سودائی ہو

1۔ سج = سجاوٹ، زیبائش

311

بالوں کو سنوارو ہو، پٹّوں[1] کو بناتے ہو — ہر روز نئے نقشے تم ہم کو دکھاتے ہو
نت جاؤں ہی جاؤں تم کرتے ہو جو آتے ہو — یہ بھی کوئی آنا ہے، جاؤ بھی جو جاتے ہو
میں کشتۂ گیسو ہوں، سنبل کو یہاں بو دَو — تربت پہ مری یارو کیوں پھول چڑھاتے ہو
کیا خوں کی مرے رنگت مہندی سے میاں کم ہے — ہاتھوں کے تئیں اپنے، فندق جو لگاتے ہو
مت گرم ملو اتنا دشمن سے مرے ہر دم — کہنا بھی مرا مانو، کیوں جی کو جلاتے ہو

وہ بات تمھاری کو کوئی دھیان سے سُنتا ہے،
میاں مصحفی تم ناحق کیوں مغز پھراتے[2] ہو

312

اک بات میں کہوں، اگر آزردہ تو نہ ہو — ہر اک کے اس طرح سے میاں روبرو نہ ہو
اس نو بہار میں تو، طرح گُل کے اے نسیم — یوں چاہیے کہ زخمِ دل اپنا رفو نہ ہو
جی چاہتا ہے دل کو کروں اپنے چاک چاک — اس واسطے کہ اس میں تری آرزو نہ ہو
اُس حسنِ لایزال کا عالم ہی اور ہے — یہ حسن وہ نہیں کہ کبھو ہو کبھو نہ ہو
تیری قسم ہے، اپنا تو رُک جائے جی وُہیں — یک دم جو درمیاں میں تری گفتگو نہ ہو
عاشق کا چاک جیب رفو ہو سکے و لے — چاکِ جگر بہ سوزنِ عیسیٰ رفو نہ ہو

عالم کو اک ہلاک کیا اُس نے مصحفی
دنیا میں اس قدر بھی کوئی خوبرو نہ ہو

313

جس گُل کے بیچ مہر و محبت کی بو نہ ہو — یا رب وہ گُل شگفتہ چمن میں کبھو نہ ہو
سرگشتہ میری طرح سے پھرتا ہے آسماں — ڈرتا ہوں میں، اُسے بھی تری جستجو نہ ہو

1۔ پٹے = زلف کی لٹیں 2۔ مغز پھرانا = سر کھپانا (عوامی)

اِس ناتواں پہ حیف ہے تلوار کھینچنی
جس کے بدن میں ایک بھی قطرہ لہو نہ ہو

تیری ہی ذات سے تو ہے وابستہ یہ طلسم
ہم ہوویں پھر کہاں کے، اگر ہم میں تو نہ ہو

سونگھوں ہوں جا کے مثلِ صبا وقتِ صبح دم[1]
بستر پہ میرے یار کے پھولوں کی بو نہ ہو

حق نے دیا ہے دل کو مرے عشقِ دائمی
یہ عشق وہ نہیں کہ کبھو ہو کبھو نہ ہو

کیا دُور ہے، جو عکس ترا آئینے کے بیچ
اے شرمگیں، حیا سے ترے روبرو نہ ہو

یا رب وہ زخم دیجو مجھے اُس کی تیغ کا
جس زخم پر کہ منّتِ دستِ رفو نہ ہو

مارے غنا کے خاک ہی میں تو تو مل گیا
اتنا بھی مصحفی کوئی بے آرزو نہ ہو

314

اگر تم آؤ ہمیں سرفراز کرنے کو
تو ہم بھی رکھتے ہیں اک دل نیاز کرنے کو

حباب وار نہ بحرِ جہاں کا کچھ دیکھا
مگر ہم آئے تھے یاں چشم باز کرنے کو

جہاں میں کون سپید و سیہ کا فرق کرے
شعور چاہیے ہے امتیاز کرنے کو

دیت شہید کی میرے، یہ ہے کہ بعد از قتل
تو دھو کے ہاتھ پھر آوے نماز کرنے کو

گلی میں اُس کی، ہوئی خلق یاں تک آسودہ
کہ ہم کو جا نہ ملی پا دراز کرنے کو

سکھایا جس نے میاں تم کو مجھ سے یہ پرہیز
کہا نہ غیر سے کیوں احتراز کرنے کو

برنگِ شعلہ کہ پتّھر کو موم کر دیوے
اِک آہِ گرم ہے بس، دل گداز کرنے کو

موافقت ہو جو طالع کی اُس کی مجلس میں
تو ہم بھی قہر ہیں، جس تس سے ساز کرنے کو

سزا ہے مصحفی اپنی، جو اَب تعب کھینچیں
کہ یاں ہم آئے نہ تھے عیش و ناز کرنے کو

315

رہ گئے دیکھتے ہی ہم در کو
روٹھ کر تم بھلے گئے گھر کو

1۔ صبح دم کے ساتھ وقت کی اضافت زائد ہے

ٹھہرو، اے قاصدانِ ملکِ عدم　ہے ہمارا بھی قصد اُودھر کو
سوکھ کر رہ گیا ہے کاغذ وار　مَرضِ رشتہ[1] ہے جو مسطر کو
ہم سے وہ بے سبب الجھتی ہے　ٹک تو سمجھاؤ زلفِ ابتر کو
جب کہ سب ملک و مال چھوڑ گیا　تب فراغت ہوئی سکندر کو
دل نہیں، رکھ دیا ہے کیا جانے　میرے سینے میں کس نے اخگر کو
گر لبِ جو کا شوق ہے تو صنم　دیکھ عاشق کے دیدۂ تر کو
وہ جو عاشق ہیں اپنے ہاتھوں سے　پھینک دیتے ہیں کاٹ کر سر کو
مصحفی، قتل گاہِ عشق کے بیچ
نہیں تکلیف دست و خنجر کو

316

از بس بھلا لگے ہے تو میرے یار مجھ کو　بے اختیار تجھ پر آتا ہے پیار مجھ کو
صیاد کا بُرا ہو، جس کے تغافلوں نے　کنجِ قفس میں رکھا فصلِ بہار مجھ کو
جاؤں کدھر کو یارو، مانند صیدِ خرگہ[2]　مژگاں نے کر رکھا ہے اُس کی، شکار مجھ کو
اس رفتگی پہ مجھ سے کرتا ہے تو تغافل　ڈانٹے ہے تس پہ اُلٹا پھر بار بار مجھ کو
میرا قصور کیا ہے، صانع کو چاہیے تھا　مقدارِ حُسن دیتا، صبر و قرار مجھ کو
فتنہ ہے یا پری ہے، جادو ہے یا بلا ہے　آنکھوں سے یہ کیا ہے کس کی دوچار مجھ کو
اے مصحفی تصوّر اُس کا جو سامنے ہے
آتا نہیں شبِ غم یک دم قرار مجھ کو

317

یاد آئے جو ترے موے پریشاں مجھ کو　صبح تک نیند نہ آئی شبِ ہجراں مجھ کو

1۔ مرضِ رشتہ -ایک بیماری جس میں جسم سے ڈورا سا نکلتا ہے، اِسے نارُو بھی کہتے ہیں

2۔ خرگہ / (خرگاہ) جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے لگایا ہوا خیمہ

کچھ بھی معلوم نہیں زحمتِ زنداں مجھ کو — ہے تری یاد میں زنداں بھی گلستاں مجھ کو
اس حیا پر بھی مرے دل میں کھبی جاتی ہیں — چوری چوری سے جو دیکھیں ہیں وہ انکھیاں مجھ کو
ان دنوں شہر سے جی سخت بتنگ آیا ہے — لے چل اے جوشِ جنوں سُوے بیاباں مجھ کو
باغباں، روزنِ در سے تو ذرا جھانکنے دے — کہ نہیں رخصتِ گلگشت گلستاں مجھ کو
جرسِ ناقۂ لیلیٰ کی طرح، دشت بدشت — ساتھ پھرتا ہے لیے یہ دل نالاں مجھ کو
یاں جو یک تار بھی باقی نہ رہا دامن کا — کون دکھلا کے گیا چاک گریباں مجھ کو
کام کیا تھا مجھے جلنے سے شبِ ہجراں کے — بے کسی تو نے کیا شمعِ شبستاں مجھ کو
کس کے گیسو کا پڑا اس پہ الٰہی سایہ — سنبل آتا ہے نظر سخت پریشاں مجھ کو
میں جو کچھ ہوں سو ہوں، کیا کام ہے ان باتوں سے — کوئی کافر کہے یا کوئی مسلماں مجھ کو
جھانولے[1] جب کبھی کرتا ہے تو اے شوخ ادا — مار ڈالے ہے تری جنبشِ مژگاں مجھ کو
کس کے مجروح گلستاں میں ہیں مدفوں جو ہنوز — غنچے آتے ہیں نظر صورتِ پیکاں مجھ کو

مصحفی گلشنِ گیتی سے میں یہ پھل پایا
کہ طرح گل کی، ملے زخم نمایاں مجھ کو

318

خوار رکھتا ہے اب تلک ہم کو — دیکھ سکتا نہیں فلک ہم کو
دیکھ آنکھوں کو کہتے ہیں بادام — نہ ملیں ایسی کیوں پلک ہم کو
کوند بجلی کی تھی کہ چھپ بھی گئی — دُو ہیں دکھلا کے اک جھلک ہم کو
ہے وہی یہ فلک کہ طفلی میں — نِت دکھا بارہا فلک ہم کو

مصحفی سرفرو نہیں لائے
سجدہ کرتے ہیں یوں مَلک ہم کو

1۔ جھانولے = نظر کے اشارے

319

خاک میں مل گئے ہم، یار کا چلنا دیکھو
اُس کی ٹھوکر سے وہ دامن کا اُچھلنا دیکھو

خون سے ہاتھ وہ دھوتا ہے کسی کے گویا
مہندی کھلوائے پر، اُن ہاتھوں کا ملنا دیکھو

چاند جوں چیر کے بادل کو کرے ہے جلوہ
اس کے بالوں سے رخ اس کے کا نکلنا دیکھو

ہاتھ چھاتی پہ رکھو تم مری اے راحتِ جاں
اپنے ہاتھوں سے، مری چھاتی کا جلنا دیکھو

خاک پر چاروں طرف لوٹے ہے سیماب کی طرح
اس کے کوچے میں مرے دل کا مچلنا دیکھو

سوتے[1] کیا دیکھتے پھرتے ہو کنوئیں کے پیارے
آ کے ان چشموں[2] سے چشموں کا اُبلنا دیکھو

کون اس باغ میں آیا ہے مقیمانِ چمن
آج پھولوں کا تو ٹک رنگ بدلنا دیکھو

شمع پر جلتے ہوئے رات یہ کہتا تھا پتنگ
شمع تو جلتی ہے، پر میرا بھی جلنا دیکھو

نشۂ مے میں چھکا آئے ہے مے خانے سے
مصحفی کا کوئی اِس وقت میں چلنا دیکھو

320

گریہ، دل کو نہ سوے چشم بہاؤ
ڈوبتی ہے بھنور میں جاکر ناؤ

نہ گلی اپنی واں کبھی کھچڑی[3]
نت پکاتے رہے خیالی پلاؤ

دل ہے اے نالہ جوں کبابِ[4] ورق
آنچ کم دے، یہ کھا نہ جائے تاؤ[5]

بوسہ لیتے میں کاٹ کھاتے ہو
کیا تمھارا بُرا پڑا ہے سُبھاؤ

جی پہ یاں بن رہی ہے، یہ تو کہو
آج کیدھر چلے ہو کر کے بناؤ[6]

کیوں کے رکھوں قدم گلی میں تری
واں تو پڑتا نہیں ہے اپنا ہواؤ[7]

آتشِ معدہ کو نہیں سیری
جُوں جہنّم کرے ہے لاؤ ہی لاؤ

دِل جو مَیں گُم کیا، تو تم کو کیا
یارو اس بات کا کرو نہ چواؤ[8]

تھی شبِ وصل، پر خیال کے ساتھ
ہم نے دل سے نکالے کیا کیا چاؤ

1۔ سوتے = سوتھ (سر چشمہ) 2۔ ایک چشم بہ معنی آنکھ دوسری بہ معنی سوتھ

3۔ دال گلنا (مطلب برآری) کے لیے استعمال ہوتا ہے اس کے بدلے مصحفی نے کھچڑی گلائی ہے

4۔ کباب ورق = باریک کباب 5۔ تاؤ کھانا = جل جانا 6 بناؤ = سنگھار

7۔ ہواؤ (ہیاؤ) دل 8۔ چواؤ = بات پھیلانا (روزمرّہ)

دَہِ دل ہے تعلّقے میں ترے   خواہ اُوجڑ کر، اِس کو خواہ بساؤ
مرہمِ لطف، منھ نہ موڑیو تو   ابھی آلے[1] ہیں سب جگر کے گھاؤ

یہ زمیں بھی ہے طرفہ معنی خیز
مصحفی اک غزل تو اور سناؤ

321

آج اُس نے کیا ہے اپنا بناؤ   دیکھیں کس کس کے دل کے نکلیں چاؤ
میں تو ملتا نہیں ہوں اُس سے، ولے   نہیں جاتا ہنوز دل کا لگاؤ
وادیِ عشق میں نہ جاؤ کہ واں   ہر قدم پر ہیں سیکڑوں سُتھراؤ[2]
جگر اُس کا سراہیے جس نے   تیغ پر تیغ کھائی، گھاؤ پہ گھاؤ
میری اُس کی یوہیں رہی چوپڑ   میں نے برسر[3] کیا، کیا جو وہ داؤ
چور زخموں میں ہوں میں اے ساقی   مجھ کو اِس دم جو ہو شراب پلاؤ
اے فلک مان میرے کہنے کو   مجھ سے آزردہ دل کو تُو نہ ستاؤ
جب لکھے ہیں میں وصفِ زلفِ بتاں   ہو گئے ہیں سیاہ تاؤ کے تاؤ[4]
جی میں آتا ہے ایسے جاڑے میں   کہیں جا بیٹھیے لگا کے الاؤ
پائنتی مَیں پڑا رہا اُس کی   نہ کہا اُس نے اُٹھ کے پانو دباؤ

مصحفی تا کہ میں بایں تقریب
اپنے دل کے نکال لیتا چاؤ

322

میرے ملنے سے تمھیں حظ نہ اگر ملتا ہو   دل ملاؤ اُدھر اپنا ہی جدھر ملتا ہو
کیونکے یک بار کرے خوے جُدائی وہ غریب   تجھ سے اے جان جو ہر شام و سحر ملتا ہو

1۔ آلے = تازہ 2۔ سُتھراؤ = قتل کے لیے استعمال کیا ہے، صفایا کر دینا
3۔ برسر = چوپڑ کی اصطلاح 4۔ تاؤ = کاغذ کا بڑا پنّا

کچھ میں ناداں ہوں؟ دوں تب رگِ گُل سے نسبت	جب رگِ گل سے ترا موے کمر ملتا ہو
کیا تماشا ہو میں آجاؤں وو ہیں، غیر کے ساتھ	عید کے دن تو جب اے رشکِ قمر ملتا ہو
رسم اقلیم عدم طرفہ میں دیکھی، جز خاک	واں جو رہنے کو کسی شخص کے گھر ملتا ہو
یارو دیکھو تو جہاں سے یہ بگولا اُٹھا	خاک میں واں نہ کوئی خاک بسر ملتا ہو

مصحفی خاک کریں معنیِ رنگیں کی تلاش
جب ہمیں قُوت[1] بہ صد خونِ جگر ملتا ہو

323

نہ تنہا اضطراب دل نے شب رسوا کیا مجھ کو	بُرا ہو شوق کا جو کھینچ کر واں لے گیا مجھ کو
ستانے سے غریبوں کے، ترے کیا ہاتھ آوے گا	خدا سے ڈر، ستا مت اس قدر، اے بے وفا مجھ کو
کروں تسخیر اس رشک پری کو کس طرح یا رب	نہ افسوں یاد ہے مجھ کو نہ آتی ہے دعا مجھ کو
بہر صورت دل اپنے کو پریشاں ہی میں پاتا ہوں	خدا جانے لگی ہے کس کی زلفوں کی ہوا مجھ کو
ابھی یارو جہاں سے ہو کے میں نومید آیا تھا	تماشا دیکھیو تم، پھر وہیں دل لے چلا مجھ کو
غبارِ ناتواں ہوں، گر طرف گلشن کے تو جاوے	بُھلانا دل سے مت، اُس وقت اے بادِ صبا مجھ کو
کروں کیا لے کے اے ہمدم، میں گل کو ہاتھ میں اپنے	کہ اُس بن خوش نہیں آتا ہے گل کا سونگھنا مجھ کو
ہوس ملنے کی میں کیوں کر کروں اُس ماہ سیما[2] کی	غضب یہ ہے نہیں ہوتا میسّر دیکھنا مجھ کو
ارادہ گر کروں شب کو تو وہ ملتا نہیں مجھ سے	جو جاؤں دن کو، تو آتی ہے لوگوں سے حیا مجھ کو
نہ دن کو چین، نے راتوں کو نیند آوے، معاذ اللہ	کیا ہے اُس کی چاہت نے گرفتارِ بلا مجھ کو
عجب کیا ہے جو میرا دردِ دل تسکین پا جاوے	پلا دے گر وہ اپنے ہاتھ سے آکر دوا مجھ کو
دم اس کی آشنائی کا تو بھرتا ہوں، پہ یہ ڈر ہے	کہ سن کر اس سخن کو، کیا کہیں گے آشنا مجھ کو

کہوں کیا تجھ سے مَیں اے مصحفی احوالِ زار اپنا
غرض پھر بیٹھے بیٹھے شوق اِک بُت کا ہوا مجھ کو

1۔ قُوت (بروزن سُوت) غذا 2۔ ماہ سیما = مہ جبیں (سیما = پیشانی)

324

ساتھ وسعت کے ہے ہر چند جہاں رہنے کو　　پر ہمیں تو نہیں ملتا ہے مکاں، رہنے کو
تیرے کوچے کے سوا، اپنا ٹھکانا ہی نہیں　　جا گہ تجویز کریں اور کہاں رہنے کو
کیوں کے حیراں نہ رہیں ہم، کہ خدا نے ہم کو　　دیں ہیں جوں آئینہ آنکھیں نگراں رہنے کو
جوں مہِ عید دکھاتے ہو منھ اپنا سرِ ماہ　　تم بھی اس بت پہ قیامت ہو نہاں رہنے کو
تیرے کوچے میں رہیں کیوں کے کہ ہے جائے خطر　　جی تو چاہے ہے بہت اپنا یہاں رہنے کو

مصحفی منزلِ ہستی ہے سرائے فانی
نہیں آیا کوئی یاں پیر و جواں رہنے کو

325

کب تک مری آنکھوں سے رواں خونِ جگر ہو　　اے نالۂ جاں سوز کہیں تجھ میں اثر ہو
مانندِ صبا، خاک بھی جب ہاتھ نہ آوے　　آخر کو ہم اس کو سے گئے، خاک بسر ہو
تو ذبح تو کرتا ہے مجھے، پر یہی ڈر ہے　　یہ دستِ حنائی نہ ترا خون سے تر ہو
فریادی ہوں میں، تم بھی مری داد کو پہنچو　　اے نالہ و فریاد و فغاں آج کدھر ہو
یہ حق میں مرے کس نے دعا دی تھی الٰہی　　عاشق ہو، تو اس کی نہ شبِ ہجر سحر ہو
یاں تک ہوں ترے حسن سے محظوظ کہ مِن بعد　　دیکھوں نہ میں اس کو جو پری پیش نظر ہو
لے جائیو میت کو مری پردۂ شب میں　ق　ماتم میں مرے تا نہ کسی کی مژہ تر ہو

اے مصحفی یاروں کو یہی کیجو وصیت
جس وقت ترا عالمِ فانی سے گذر ہو

ہ

326

مقدور ہو تو لاگ نہ رکھیے کسو کے ساتھ　　جوں شمع عمر کاٹیے، پر آبرو کے ساتھ

جس جس طرف پھریں ہیں اُسے مغبچے لیے　مے خوار بھی لگے ہی پھریں ہیں سُبو کے ساتھ
تشبیہہ جس سے یار کے عارض کو دیجیے　گل کون سا ہے باغ میں اُس رنگ و بو کے ساتھ
ہرگز نہ دیکھ رشتہ و سوزن کو خوش ہوا　زخمِ جگر کو لاگ رہی نت رفو کے ساتھ
شاعر جو مو کہیں ہیں یہ اُن کا خیال ہے　نسبت تو اس کمر کو نہیں کچھ بھی مُو کے ساتھ
بوسہ دیا نہ تم نے میاں، مصحفی کو حیف
آخر وہ اس جہاں سے گیا آرزو کے ساتھ

327

روز کی خارا تراشی، سخت مجبوری ہے یہ　عاشقی کا ہے کو ہے فرہاد، مزدوری ہے یہ
بھید کیا پاوے، مریضِ عشق کا یارو طبیب　تن کی رنجوری نہیں کچھ، دل کی رنجوری ہے یہ
دے کے دل بوسہ لیا میں نے تو کیا اس کا عجب　جانتے ہو تم کہ اس سودے کی دستوری[1] ہے یہ
شمع پر جلتے ہوئے پروانہ یوں کہنے لگا　وصل کی شب ہے، کہ یارب شامِ مہجوری ہے یہ
بات کا میری نہیں یک بار بھی دیتا جواب　آج کل تو اُس بتِ کافر کی مغروری ہے یہ
شب کو جب گھر پر ہمارے ماہ کرتا ہے طلوع　ہم سمجھتے ہیں کہ گویا شمعِ کافوری ہے یہ
مصحفی کچھ ریختہ ہی میں نہیں استادِ وقت
فارسی میں بھی نظیریِ نشاپوری ہے یہ

328

اس کو پیوند ہوا ہے جگرِ چاک کے ساتھ　اپنی نبھنے کی نہیں اب دلِ غمناک کے ساتھ
جستجو میں تری پھرتا ہے جدھر، وہ دن رات　دل بھی پھرتا ہے مرا گردشِ افلاک کے ساتھ
باغباں کاٹیو مت، موسمِ گل میں اس کو　رگِ جاں کو مری، نسبت ہے رگِ تاک کے ساتھ
اے صبا، آپ زمیں پر یہ نہیں رہنے کی　تجھ کو کاوش ہے عبث میری کفِ خاک کے ساتھ

1۔ دستوری = قاعدہ

حسنِ پاکیزہ کے طالب وہ رہے جیتے جی　　جن کی بھر عمر کٹی یاں نظرِ پاک کے ساتھ
اپنی رفتار پہ نازش ہے بہت فتنے کو　　چل سکے گا وہ تری قامتِ چالاک کے ساتھ؟
مصحفی کیا کوئی محبوب نہ تھا دنیا میں
دوستی تو نے جو کی اُس بتِ سفاک کے ساتھ

329

مرغانِ باغ کی تو خوش آوازیاں تو دیکھ　　کیا گا رہے ہیں، زمزمہ پردازیاں تو دیکھ
کب سے پتنگ گرتے ہیں شعلے پہ آن آن　　اے شمع ٹک انھوں کی تو جاں بازیاں تو دیکھ
کیا کیا سخن فریب کے نکلے ہیں، ان سے جان　　تو اپنے لعلِ لب کی فسوں سازیاں تو دیکھ
فرہاد وقیس یوں گئے، میرا سو یہ ہے حال　　عشقِ بتاں کی خانہ براندازیاں تو دیکھ
چوسر ہے اک حریف سے، اُٹھ کر کہاں چلا
اے مصحفی، مری بھی تو دو بازیاں تو دیکھ

330

کچھ زلف ہی الجھتی نہیں ہے صبا کے ساتھ　　لڑتی ہیں تیری پلکیں بھی کافر، ہوا کے ساتھ
اُس آشنا کا دشمنِ جاں وو ہیں ہوگیا　　دیکھا جو میں نے اُس کو کسی آشنا کے ساتھ
پرہیز اب حنا سے بھی کرنے لگا وہ شوخ　　جانا کہ خونِ دل کو ہے نسبت حنا کے ساتھ
عالم یہ کچھ ہے اپنی دعا کا، کہ اِن دنوں　　فریاد بھی بلند ہے دستِ دعا کے ساتھ
گو میں بتوں میں عمر کو کاٹا تو کیا ہوا　　نسبت مری درست رہی ہے خدا کے ساتھ
رخسار کا تو ذکر ہی کیا، میں ہوں اک شریر　　تولوں نہ روے گل کو تری پشتِ پا کے ساتھ
اتنا جو جی ہی جی میں مگن ہے تو مصحفی
کیا پھر لڑی ہے آنکھ کسی خوش ادا کے ساتھ

331

پھبتا ہے یوں وہ تکمۂ[1] گوہر گلے کے ساتھ
گویا کیا ہے تعبیہ[2] اختر گلے کے ساتھ

نامہ تو باندھتا ہوں پہ ڈرتا ہوں تر کرے
نامے کو میرے خوں میں، کبوتر گلے کے ساتھ

جن طائروں کو ہے دمِ خنجر کی آرزو
کنجِ قفس میں ملتے ہیں شہپر گلے کے ساتھ

گردن کشی نہ کر کہ ہزاروں کو چرخ نے
ڈبوا دیا ہے باندھ کے پتھر گلے کے ساتھ

پیدا گلو بریدہ ہوئے ہم، مگر ہوئی
ماہی کی طرح خلقتِ خنجر گلے کے ساتھ

عاشق کے جب گلے کو بنا کر کیا درست
لکھی قضا نے نسبتِ خنجر گلے کے ساتھ

صندل سے جیسے سانپ لپٹتا ہے اس طرح
لپٹی ہی جا ہے زلفِ معنبر گلے کے ساتھ

میں ہوں وہ صیدِ حلق بریدہ کہ مصحفی
جس کے لگے نہ خون کا ساغر گلے کے ساتھ

332

شبنم ہوئی پانی ترے دنداں کی طرف دیکھ
گل آگ پہ لوٹا، لبِ خنداں کی طرف دیکھ

دھج سینے کی اپنے ہی تو کیا دیکھے ہے ظالم
میرے بھی ذرا چاکِ گریباں کی طرف دیکھ

کچھ دل میں اثر کر جو گئی بے کسی اُن کی
رویا میں بہت گورِ غریباں کی طرف دیکھ

ہے دل میں ہمارے جو بھری اس کی محبت
رو دیتے ہیں ہم دور سے درباں کی طرف دیکھ

عاشق کے جگر پر ترے، یوں چلتی ہیں چھریاں
تو اپنی ذرا جنبشِ مژگاں کی طرف دیکھ

دعویٰ تجھے رونے کا ہے اے ابرِ بہاری
تو آ کے مرے دیدۂ گریاں کی طرف دیکھ

جب سیرِ بیاباں کو میں جاتا ہوں تو مجھ کو
آجاتی ہے وحشت سی، بیاباں کی طرف دیکھ

کیا محو ہے رفتار کا تو آبِ رواں کی
اے مصحفی اُس سروِ خراماں کی طرف دیکھ

1۔ تکمہ گوہر = موتی کا بٹن 2۔ تعبیہ کرنا۔ آویزاں کرنا

333

کیا سبزہ ہے سیراب، بیاباں کی طرف دیکھ — سبزے کی طرف اور گل و ریحاں کی طرف دیکھ
مغرور نہ ہو چاکِ گریبان پر اپنے — اے گُل تو مرے چاکِ گریباں کی طرف دیکھ
اُس کشتے پہ ہے جائے ترحّم جو تڑپ کر — رہ جائے ترے خنجرِ بُرّاں کی طرف دیکھ
کرتا ہوا پھرتا ہے تو کیا سیرِ چراغاں — کافر مرے داغوں کے چراغاں کی طرف دیکھ
کیا میری پریشانی میں کرتا ہے تامّل — تو اپنی تو اس زلفِ پریشاں کی طرف دیکھ
اے وائے کہ رستے ہی میں حیران کھڑا ہے — کبکِ دری اُس سروِ خراماں کی طرف دیکھ

اے مصحفی کیا غم ہے کہ جو یار بھی تیرا
روتا ہے ترے دیدۂ گریاں کی طرف دیکھ

334

اِس اشک کے قطرے کی مرے جلوہ گری دیکھ — صدقے مَیں ترے، ٹک ادھر اے رشکِ پری دیکھ
لوٹے ہے سدا خوں میں پڑی، رشک کے مارے — گلشن میں رگِ گل تری نازک کمری دیکھ
لالہ کے خیاباں میں نہ یوں پانو رکھ اپنا — یہ خونِ شہیداں ہے، نسیمِ سحری دیکھ
وہ نخل ہوں میں باغِ زمانہ میں، کہ جس کے — آوے نہ کبھی پاس کوئی بے ثمری دیکھ
صیاد نہ رکھ میرے تئیں کنجِ قفس میں — میں صیدِ زبوں ہوں، مری بے بال و پری دیکھ
نالے کو مرے طعنہ نہ دے بے اثری کا — اے آہِ سحر اپنی بھی ٹک بے اثری دیکھ
جب ناز سے ہوتا ہے تو گلشن میں خراماں — گل کھائیں ہیں آنکھوں میں جسے حور و پری دیکھ

لکھتا ہے غزل اور بھی اک مصحفی اس وقت
رفتار کو خامے کی ٹک اے کبکِ دری دیکھ

335

راتوں کو ستاروں کی ذرا جلوہ گری دیکھ — کیا چمکے ہیں، غافل یہ عقیقِ جگری دیکھ

جاتا ہے لیے اشک مرا، لختِ جگر کو — اور مجھ سے یہ کہتا ہے، مری نامہ بری دیکھ
غنچے کی گلابی کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے — یوں پانو نہ رکھ اپنا، نسیمِ سحری دیکھ
نازاں ہے تو رفتار پہ کیا اپنی ہی اتنا — رفتار کو اُس کی بھی ٹک اے کبکِ دری دیکھ
آزاد کیا میرے تئیں کنجِ قفس میں — صیاد نے آخر، مری بے بال و پری دیکھ
کیا آئینہ دیکھے ہے، ذرا میری طرف دیکھ — صدقے تری آنکھوں کے میں اے رشکِ پری دیکھ
اِن بزم نشینوں کو نہیں کچھ خبر اپنی — کیا بادہ پلائے ہے ذرا بے خبری دیکھ
ہر اشک کے قطرے سے جُدی آنکھ لڑی ہے — اس دیدۂ گریاں کی پریشاں نظری دیکھ

آیا جو جنوں مجھ کو تو میں تجھ سے کہوں گا
اے مصحفی اس وقت مری جامہ دری دیکھ

336

اس نے جو جو کچھ کہا شب ہم کو، گھر میں بیٹھ بیٹھ — ہم نے وے باتیں سنیں سب پشتِ در میں بیٹھ بیٹھ
ہم وہ عاشق ہیں جنھوں نے شاہراہِ شوق پر — عمر کھودی، انتظارِ نامہ بَر میں بیٹھ بیٹھ
حی[1] سے جانا نجد تک اُس کو جو مشکل ہو گیا — ناقۂ لیلیٰ گیا اتنے سفر میں بیٹھ بیٹھ
دے بھی کیا دن تھے کہ جب جاتی تھیں وہ زلفیں اُلجھ — اُن کو سُلجھاتے تھے ہم دو دو پہر میں بیٹھ بیٹھ
شہر کے جتنے تھے کوچے رشکِ گلشن ہو گئے — بس کہ میں رویا لہو ہر رہ گذر میں بیٹھ بیٹھ
بزم سے اُٹھتا ہوں تو کہتی ہیں تاکیداً مجھے — یار کی آنکھیں، ہر انداز نظر میں، بیٹھ بیٹھ
کر کے یاد انداز اُٹھنے بیٹھنے کا یار کے — شعلہ اُٹھ اُٹھ کر، گیا میرے جگر میں بیٹھ بیٹھ
اُس نے دکھلایا ہمیں اپنے تئیں سَو سَو طرح — گاہ غُرفے میں کھڑے ہو، گاہ در میں بیٹھ بیٹھ

لطف کیا ملنے کا اب، اُس نے تو اپنی مصحفی
قدر کھودی صحبتِ ہر بے ہُنر میں بیٹھ بیٹھ

1۔ حی = محلّہ، علاقہ

337

پیچ پگڑی کا کُھل رہا ہے کچھ — اُس کی اِس دم عجب اَدا ہے کچھ

دل مرا ''زُلف زُلف'' کہتا ہے — اِس کو سودا سا ہوگیا ہے کچھ

اُن کی فہمید کا ہوں دیوانہ — یار کچھ سمجھے، ماجرا ہے، کچھ

تیر مجھ پر لگا کے یوں بولا — اپنا انداز ہی جدا ہے کچھ

سرو کب قد کو تیرے پہنچے ہے — گو کہ قد سے ترے بڑا ہے کچھ

ادھر آؤ تو مہربان، کہیں — آپ سے ہم کو بھی گلہ ہے کچھ

جب سے قاصد گیا ہے اُس کی طرف — جی اُدھر ہی کو لگ رہا ہے کچھ

مصحفی یار کچھ سمجھتے ہیں
عشق سے اپنا مدّعا ہے کچھ

338

دل ہے پہلو میں کہ اک دشمنِ جاں کاہ ہے یہ — جس طرف جاؤں میں اُٹھ کر، مرے ہمراہ ہے یہ

کھولے جا کے کوئی مجھ کو بتاں کے آگے — اس پہ تم رحم کرو، بندۂ اللہ ہے یہ

کسی حالت میں نہ ہو یادِ خدا سے غافل — اپنے نزدیک نشانِ دلِ آگاہ ہے یہ

نہ فقط دل ہی مرا آہ نے میری پھونکا — گھر کو کتنوں کے جلاوے گی اگر آہ ہے یہ

شیخ کعبے کو تو جا، جاؤں میں بت خانے کو — کہ تری راہ ہے وہ، اور مری راہ ہے یہ

خانہ جنگی کا ارادہ ہے اگر تم کو میاں — آؤ لے تیغ و سپر، بندۂ درگاہ ہے یہ

اشک اور لختِ جگر میں ہے زبس ردّ و بدل — نوکِ مژگاں پہ مری گاہ ہے وہ، گاہ ہے یہ

گھر سے آوے نکل اے ماہ جو وہ زُہرہ جبیں — تو ابھی تجھ کو دکھادوں کہ مرا ماہ ہے یہ

مصحفی دل کے کہے میں تو نہ چلنا بے ہوش
تجھ کو سو بار کہا میں، ترا بدخواہ ہے یہ

339

دل کو ہے رنگی اُس ابروے خمدار کے ساتھ
جوں سپاہی کے تئیں عشق ہو تلوار کے ساتھ

کبک نے بھی جو کیا ناز بہ رفتار تو کیا
اُس کو نسبت ہے کب اُس شوخ کی رفتار کے ساتھ

خیر خواہوں میں تم اپنے ہمیں کب گنتے ہو
گرم جوشی ہے سدا آپ کو اغیار کے ساتھ

شکوہ تیرا نہیں کرتا میں کسی کے آگے
گفتگو ہے مجھے اپنے ہی دلِ زار کے ساتھ

مر گیا آتے ہی کل صحنِ چمن میں بُلبُل
عیش کرنا نہ لکھا تھا گل و گلزار کے ساتھ

گو بہار آتی ہے گلشن میں و لے تو صیاد
گل کا مذکور نہ کر، مرغِ گرفتار کے ساتھ

آرزو میں تری، اے زہرہ جبیں تاروں کی
آنکھیں رہتی ہیں لگی رخنۂ دیوار کے ساتھ

کیا خبر ہے تجھے بے درد، کہ کیا کرتی ہے
تیرے مژگاں کی انی اس[1] دل افگار کے ساتھ

مصحفی ابر بہاری کو ہوا ہے سودا
شرط بدتا ہے مرے دیدۂ خوں بار کے ساتھ

340

ہے مزہ سیرِ چمن کا تو فقط یار کے ساتھ
پھر تو کیا لطف ہے آیا جو وہ دو چار کے ساتھ

قصۂ کوتہیِ عمر جو چھیڑا اس نے
شمع بھی روئی سحر تک ترے بیمار کے ساتھ

سانس بھی کشتہ ترا، ہائے نہ لینے پایا
ہو گئی جان ہوا، ایک ہی تلوار کے ساتھ

ہے یقیں مجھ کو کہ اے سرو خراماں میرے
جان جاوے گی کسی دن تری رفتار کے ساتھ

کوچۂ یار میں رہنے سے نہیں اور حصول
عشق ہے مجھ کو اک اُس کے در و دیوار کے ساتھ

دوستاں، بہر خدا شور پہ لاؤ نہ مجھے
گل کی باتیں نہ کرو اِس جگر افگار کے ساتھ

اس کے کوچے کی طرف دیدہ ہوئے رہبرِ دل
جیسے دلّال ہو سودے میں خریدار کے ساتھ

آئینے کا ہے یہ منہ تیرے مقابل ہووے
ہم سری کر نہ سکا مہ، ترے رخسار کے ساتھ

1۔ انی = نوک، باریک ٹکڑا

مصحفی مصرِ محبت کی کروں کیا تعریف
کون سا شہر ہے اس گرمیِ بازار کے ساتھ

341

تو مری تربت پہ آیا واہ واہ　　خاک میں مجھ کو ملایا واہ واہ
ہے گریباں چاک اور آنکھوں میں اشک　　عشق نے یہ دن دکھایا واہ واہ
ہم رہے بیرونِ در اور غیر کو　　تو نے خلوت میں بلایا واہ واہ
آخر آخر تو نے اے چرخِ کہن　　بے گنہ مجھ کو ستایا واہ واہ
مصحفی آیا تھا کل وہ میرے گھر
خوب میں نے بھی رِجھایا واہ واہ

342

صحبت ہے ترے خیال کے ساتھ　　ہے ہجر کی شب وصال کے ساتھ
اے سروِ رواں ٹک اک ادھر دیکھ　　جی جاتے ہیں تیری چال کے ساتھ
ہے تیغ و کمان کی سی نسبت　　ابرو کو ترے، ہلال کے ساتھ
مت زلف کو شانہ کر، مرا جی　　وابستہ ہے بال بال کے ساتھ
دل اپنا ہنوز سادگی سے　　پیچیدہ ہے زلف و خال کے ساتھ
مہمان تھا کس کا تو شب اے ماہ　ق　آتا ہے جو اس ملال کے ساتھ
رخساروں نے کچھ عرق کیا ہے　　کچھ چشم ہے انفعال کے ساتھ
میں شیر ہوں بیشۂ سخن کا　　صحبت ہے سگ و شغال[1] کے ساتھ
اکسیر ہے مصحفی کا ملنا
یعنی کہ وہ ہے کمال کے ساتھ

1۔ شغال = گیدڑ

343

عشق کیا، اک ذلّت و خواری ہے یہ چاہنا کیا ہے، گرفتاری ہے یہ
مجھ سے آنکھ اُس شوخ کی ملتی نہیں یا الٰہی کیسی بے زاری ہے یہ
کیا کروں اِس چشمِ گریاں کا علاج اب تو کچھ ناسور سی جاری ہے یہ
ایک تو جاتا رہا ہے دل مرا تس پہ غم خواروں کی غم خواری ہے یہ
لے گیا کاجل چُرا دزدِ حنا آپ کی آنکھوں کی بیداری ہے یہ
جان رک رک کر ہی ہوتی ہے خفا جی چکے بس ہم، جو ناداری ہے یہ
بے زری کہتے ہیں جس کو مصحفی
کوئی بیماری سی بیماری ہے یہ

344

ہرروز رہا مجھ سے شبِ تار کا وعدہ پر ایک بھی سچّا نہ ہوا یار کا وعدہ
درباں کی یہ قدغن ہے تو کس طرح نبھے گا یہ در کا اشارا، پسِ دیوار کا وعدہ
دل لے گیا، بوسے کو کہا کل تجھے دوں گا سودے میں ہو جس طرح خریدار کا وعدہ
مرجائے جو رفتار تری دیکھ کے، اُس سے پھر روزِ قیامت پہ ہے رفتار کا وعدہ
حال اُس کا زبوں دیکھ کے، اپنی یہ دعا ہے آجائے شتابی ترے بیمار کا وعدہ[1]
چلتا نہیں مجھ ساتھ وہ بازار تلک بھی ہے غیر سے سیرِ گل و گلزار کا وعدہ
پھڑکے ہے وہ بے طرح سے کچھ کنجِ قفس میں آیا ہے مگر مرغِ گرفتار کا وعدہ
میں دل زدہ مقتل کی طرف کیوں کے نہ جاؤں گردن سے مری، ہے کسی تلوار کا وعدہ
آنے دو اُسے، چلتے ہو گر سیرِ چمن کو
تھا ہم سے میاں مصحفیِ زار کا وعدہ

1۔ وعدہ بمعنی موت (مجازاً)

ی

345

اِس پردگی سے، کیوں کے وہ آنکھیں لڑا سکے　جو پردۂ مجاز سے باہر نہ آ سکے
واں باریابِ جلوہ اُسی کی نگاہ ہو　آنکھوں سے اپنی جو کوئی پردہ اُٹھا سکے
آئینۂ محیط جہاں اس قدر نہیں　اِس آئینے میں حُسن ترا کیا سما سکے
حرزِ[1] بدن ہو جس کا ترا حفظِ معنوی　آتش جلائے اُس کو نہ پانی بہا سکے
تکلیفِ بارِ عشق اگر دیجے عرش کو　واللہ وہ بھی تابِ تحمل نہ لا سکے
یاں ذرے ذرے میں ہے وہ خورشید جلوہ گر　بینائی یہ کہاں جو کوئی اس کو پا سکے
حیراں ہے عقل اپنی طلسمِ فلک کے بیچ　ایسا طلسم اور تو کوئی بنا سکے
بازارِ مصر میں جو زلیخا صفت کوئی　ق　سر بیچ کر، نہ اپنا اگر جی چلا سکے
اتنا تو چاہیے کہ طرح پیر زال کی　اک ریسماں تو قیمتِ یوسف میں لا سکے
تو عاشقی کا نام عبث لے ہے مصحفی
عاشق تو وہ، جو جان کو اپنی کھپا سکے

346

مسّی کو مل کے، غیر کے گھر آپ کل گئے　ہم رو سیاہ آ، کفِ افسوس مل گئے
اُس فتنۂ زماں کے مقابل جو شورِ حشر　آیا، تو آہ اُس کے وہیں پانو جل گئے
یارب وہ گُل کہاں ہیں جو فصلِ بہار میں　صحرا کو، جیب پھاڑ کے اپنی نکل گئے
پھسلے تھے بزمِ بادہ میں آتے ہی شیخ جی　بارے ہوئی یہ خیر، کہ گر کر سنبھل گئے
کیا خو بُری پڑی ہے یہ طفلانِ اشک کی　دیکھا جب اچھی چیز کو، اُس پر مچل گئے

1۔ حرز (بکسرِ اول) تعویذ

پھینکے جو شب میں شمع پہ اک مشت برگِ گل　　گرتے ہی اُس پہ جوں پرِ پروانہ جل گئے
کیوں کر لکھوں نہ ان کو، کہ بے خواست مصحفی
پھر اس زمیں میں مجھ سے کئی شعر ڈھل گئے

347

نالے سے میرے کوہ و بیاباں دہل گئے　　وحشی گھروں کو چھوڑ کے اپنے نکل گئے
لڑکے جواں ہوئے، تو جواں پیر ہو چلے　　کیا دیکھتا ہے، یاں کے تو نقشے بدل گئے
گل گیر نے جو بوسہ لیا روے شمع کا　　پروانے رات آتشِ غیرت سے جل گئے
کچھ بات درمیاں میں جو رنجش کی آ گئی　　یک بار ڈھب پہ چڑھ کے مرے وہ نکل گئے
اے سروِ خوش خرام، کوئی یہ بھی چال ہے　　پانو تلے ترے دلِ عشاق مل گئے
دل جا چکا ہے کب کا، یہ ہوش و حواس ہیں　　سن لیجو تم کہ یہ بھی میاں آج کل گئے
بستر سے غم کے پھر نہ اُٹھا، گر کے مصحفی
بیمار اس طرح کے سنے ہیں سنبھل گئے

348

لیلیٰ کا محمل اُس کے محافے سے دور ہے　　یہ بات تو کچھ اپنے قیافے سے دور ہے
اوروں کے خط تو لکھتے ہی سرنامہ[1] ہو گئے　　میرا ہی خط ہے وہ جو لفافے سے دور ہے
نافے سے مشکِ زلف کو نسبت نہ دیجیے　　نافے کی کیا ہے قدر، وہ نافے سے دور ہے
میں ملتجی ہوں اک قدحِ بنگ کے لیے　　ساقی کا ہاتھ اب تئیں صافے[2] سے دور ہے
ان قافیوں میں تو نے، صد اَحسنت مصحفی
ایسی غزل کہی کہ قیافے سے دور ہے

1۔ سرنامہ ہو گئے = لفافے میں بند ہو گئے　　2۔ صافہ = غالباً بھنگ چھاننے کا کپڑا مراد ہے

349

لے گئے دل کو مرے چھین کے بالے والے کر گئے مجھ پہ ستم شالے دوشالے والے

ساتھ معشوقوں کے یوں نالہ کشاں ہیں عشاق جوں سواری میں کہیں چلتے ہیں بھالے والے

بَر میں ہوں گر مہ و خورشید کے، سَو حلّۂ نور مال کیا اُن کو سمجھتے ہیں دومالے والے

جس محلّے میں بسا جا کے تو اے خانہ خراب اپنے گھر بیچ کے جائیں گے قبالے[1] والے

مصحفیؔ، میں یہ رسالہ جو کیا ہے موزوں

اِس کو سمجھیں گے محبت کے رسالے والے

350

کیا غم ہے گر سحر وہ گئی چشمِ تر لیے شبنم نے گل کے ساتھ تو شب عیش کر لیے

اس ماہِ خانگی کے تجسّس میں روز و شب شوقِ نظارہ مجھ کو پھرا دربدر لیے

ہووے قبولِ چشم یہ تحفہ، تو ہر گھڑی پلکوں تک آنسو آتے ہیں لختِ جگر لیے

مر جاؤں میں قفس میں، تو صیاد میرے بعد پھر یوں تو گلستاں میں مرے مُشتِ پر لیے

یہ اشک و لختِ دل نہیں، پھرتے ہیں اہلِ درد بازارِ روزگار میں لعل و گہر لیے

اُس تیغ زن کو اپنی تجسّس[2] ہے، تو یہاں مدّت سے ہم بھی ہاتھ پہ پھرتے ہیں سر لیے

شہرِ عدم کو ہم تو چلے یاں سے، مصحفیؔ

تم اب خوشی سے بیٹھے رہو اپنا گھر لیے

351

با گیسوے آشفتہ جو تو باغ میں جاوے سنبل ترے بالوں کے تئیں دیکھنے آوے

ہر چند کہ رکھتا ہے فلک پنجۂ خورشید طاقت ہے کہ دامن کو ترے ہاتھ لگاوے

اپنی یہ دعا ہے رخ آرام نہ دیکھے جو ہم کو شرارت سے رخ اپنا نہ دکھاوے

1۔ قبالہ = مکان کی دستاویز، کاغذ 2۔ تجسّس (تلاش) کو مؤنث باندھا ہے

ہوں پیرِ جگر سوختگاں، چاہیے آکر پروانہ چراغی[1] مری تربت پہ چڑھاوے
ختم اس ہی پہ ہے مرتبہ تسلیم و رضا کا جو تیغ تلے بیٹھ کے پھر سر نہ ہلاوے
کچھ کم بھی نہیں نفت[2] سے یارو مرے آنسو چاہے تو سمندر میں ابھی آگ لگاوے
اے مصحفی اُس نے تو کیا یار کوئی اور
کر جان مری تو بھی، جو کچھ تجھ سے بن آوے

352

بس کہ تھی حسن میں یوسف سے سوائی مہنگی مصر میں جا تری تصویر بکائی[3] مہنگی
کل گیا تھا میں ذرا حسن کے بازار تلک چیز واں جو نظر آئی، نظر آئی مہنگی
آنکھیں رینی سی نہ ٹپکیں، جو ترے عاشق کے جامۂ سرخ کی ہوجائے رنگائی مہنگی
تو بھی بینا ہے، جو سمجھے تو یہ سودا کر چک[4] اک نگہ پر نہیں سرمے کی سلائی مہنگی
قیمتِ مے جو میں پوچھی، تو مرے ساقی نے جان کر اپنا خریدار بتائی مہنگی
اب کی برسات میں مے خانے ہوئے بسکہ خراب مے کسی بستی میں پائی تو وہ پائی مہنگی
دل خریدار کا پھسلا ہی کیا اُس پہ مدام ہے جو ان آئینہ رویوں کی صفائی مہنگی
قیمتِ سہل پہ ہاتھ آوے ہے کب اُس کا ہاتھ اِن دنوں، ہے وہ سر انگشت حنائی مہنگی
سیرِ بازار نظر کو میں گیا تھا کہ وہاں ق صورت اک چڑھ گئی نظروں، تو وہ پائی مہنگی
دل عوض اُس کے میں دیتا تھا، ولیکن دل نے جان بھی دیتے ہیں، یہ کہہ کے چکائی مہنگی
کچھ گنہ چشم کا ہے اس میں نہ میری تقصیر مجھ کو دلاّل نے یہ جنس دلائی مہنگی
مصحفی حیف ہے جی تک بھی تو سودا نہ بنا
بسکہ تھی اُس لبِ شیریں کی مٹھائی مہنگی

1۔ چراغی = مزار پر چڑھاوا 2۔ نفت = تیل 3۔ بکائی بجائے بکی (عوامی)
4۔ کر چک = نمٹادے (روزمرّہ)

353

سرخ ہیں مے سے، وہ چشمِ نیم خوابِ نرگسی
یا یہ باغِ حسن میں پھولا گلاب نرگسی

آنکھیں خوباں جہاں نے جب سے سیں[1] رخ پر ترے
دیکھنے میں اپنے آیا آفتابِ نرگسی

گر تو جا بیٹھے لبِ دریا پہ، تیری دید کو
چشم ہو، دریا سے سر کھینچے حبابِ نرگسی

روزن اُس جالی کے جو ہیں یک قلم نرگس کی شکل
حسن کی خاطر بنے ہیں وہ نقابِ نرگسی

معنوی نسبت ہے اُس کی چشم و ابرو کو بہم
جز ہلالی کون دیوے یاں جوابِ نرگسی[2]

ساقی، اُن آنکھوں کا جو ہو مست تو اُس کے تئیں
ساتھ دو فنجاں کے دینا دو کبابِ نرگسی

مصحفی گذرا تھا اک دن اُس کی آنکھوں کا خیال
آئینے میں دل کے اب تک ہے حبابِ نرگسی

354

جورِ فراق اور ستمِ آسماں بھی ہے
اِس عشق میں نہیب[3] دل و بیمِ جاں بھی ہے

بے تلخیِ خمار نہیں یہ شرابِ وصل
چاہت کے ساتھ کشمکشِ امتحاں بھی ہے

اُس ماہ رُو کی آج جو میں جستجو کروں
اِس کام میں شریک مرا آسماں بھی ہے

بے صرفہ کیجیے نہ دلا، گفتگوے عشق
کہتے ہیں، ایسی باتوں میں جی کا زیاں بھی ہے

دیکھوں ہوں میں قفس میں جو مرغِ اسیر کو
اتنا کہو ہوں: ''کچھ خبرِ آشیاں بھی ہے''

اکسیر پر رکھے تھی شرف جن کی خاکِ پا
دیکھو تو خاک پر کہیں اُن کا نشاں بھی ہے

شمشاد کو یہ کہہ کہ، ذرا دھج بدل کے آئے
قمری، چمن میں آج وہ سروِ رواں بھی ہے

اے گل کنارہ کر تو، کہ بلبل کی گھات میں
صیاد ہے اِدھر، تو اُدھر باغباں بھی ہے

بیٹھا ہے شمع رو[4] تری بالیں پہ مصحفی
کم بخت کچھ تو کہہ، ترے منہ میں زباں بھی ہے

1۔ سیں = یعنی سی لیں (روزمرّہ) 2۔ ہلالی اور نرگسی دونوں شاعروں کے نام ہیں

3۔ نہیب = ترس، وحشت، ڈر 4۔ شمع رو = شمع کی طرح

355

عجب پاکیزہ صورت اُس بتِ کافر ادا کی ہے
غرض میں اور کچھ تو کیا کہوں، قدرت خدا کی ہے

نہ برگِ لالہ اُس کو لگ سکے، نے برگِ گُل، ہے ہے
کفِ پا سے بھی افزوں کچھ، نزاکتِ پشت پا کی ہے

درخت اُس باغ کے سب جھومتے ہیں جیسے متوالے
نشہ ہے لالہ و گل تک، یہ کیفیت ہوا کی ہے

نہ لگنے دیں کبھی شبنم کو ہرگز کان سے گُل کے
و لیکن کیا کریں، خاطر ہمیں بادِ صبا کی ہے

ہوئے ہیں خوں کئی کوچے میں اُس قاتل کے ہاتھوں سے
گناہ اُس کا ہے کیا، اس میں یہ رنگینی حنا کی ہے

مرا اور اُس کا خلطہ[1] آج کل کا کچھ نہیں یارو
یہ الفت دوستی جو کچھ کہ ہے، سب ابتدا کی ہے

تمھاری ایک میں کہتا نہیں، ورنہ جدھر دیکھو
زمانے میں تو اب تک رسم یہ مہر و وفا کی ہے

سزاوارِ تغافل کون سے دن تھا میں سودائی
ان آنکھوں کی نہیں تقصیر، یہ شوخی حیا کی ہے

خیال اُس مانگ کا یہ ہے، تو کب جینا ہوا میرا
ہے آدھی رات، اور سر پر مرے آفت بلا کی ہے

1۔ خلطہ = میل ملاپ، ملاقات

نہ نامِ عشق لے اے مصحفی، میں تجھ سے کہتا ہوں
کہ ان باتوں میں اے کم بخت تیری ہی ہلاکی ہے

356

سرِ ہر خار سے دامن کو جھٹکتے آئے ہم تو اِس دشت میں سو جا کہ اٹکتے آئے
نہ ملا ہم سے دلِ گم شدہ ہر چند کہ ہم وادیِ عشق میں ہر گام ٹھٹھکتے آئے
کتنے پیچھے رہے، محمل کے، جرس کے مانند کتنے دل ساتھ ہی محمل کے، لٹکتے آئے
کون کہتا ہے گئے شاد گلی سے تیری ہم تو ہر گام پہ واں سر کو پٹکتے آئے

نہ ملی کوے بتاں کی کوئی اک سیدھی راہ
مصحفی یاں جو ہم آئے تو بھٹکتے آئے

357

کب اِس طرف وہ بتِ کج کلاہ آتا ہے گدا کے گھر میں کہیں بادشاہ آتا ہے
دو چند ہوتی ہے پھر چاندنی، شبِ مہ میں جو بے نقاب ہو وہ رشکِ ماہ آتا ہے
اُچھل پڑیں ہیں وُہیں ساکنانِ وادیِ عشق جب اِس طرف کوئی گم کردہ راہ آتا ہے
سُنا ہے میں نے، کہ پھر آج کل گلی میں تری بہ زیرِ تیغ کوئی بے گناہ آتا ہے
کٹے گی کیوں کے شب اس کی، مریضِ غم کو ترے نہ نالہ آتا ہے اور نے کراہ[1] آتا ہے
مرے بھی دیدۂ خوں بار کیا برستے ہیں مقابل اِن کے جب ابرِ سیاہ آتا ہے
وہ آوے، اِس کا تو مذکور کیا ہے، ہاں مجھ تک خیال اُس کا مگر گاہ گاہ آتا ہے

مری تو آنکھیں بھر آتی ہیں مصحفی کو دیکھ
جب اُس گلی سے بہ حالِ تباہ آتا ہے

1۔ کراہ مذکر باندھا ہے۔

358

نہیں بندگی میں تو کچھ راہ اُس کی نکلتی نہیں دل سے کیوں چاہ اُس کی
بھلا بام پر چڑھ تو آیا تو لیکن ہوئی روکشی[1] تجھ سے اے ماہ اُس کی؟
دل اپنا میں کیوں دوں، ترے غم کے ہاتھوں نہ ہو اس کو خواہش ہی ہر گاہ اُس کی
گدا کو کرے شاہ، چاہے تو پل میں عجب لا اُبالی ہے درگاہ اُس کی
رہے آرسی سامنے ہی نظر کے میں صورت بھی دیکھوں نہ اے آہ اُس کی
کہوں ہو جو تم مصحفی سے، تو مِل جا ق اطاعت کروں گا میں اے واہ اُس کی

وہ اتنا بڑا ہے کہ ہردو جہاں میں
نہ دکھلا وے صورت بھی اللہ اس کی

359

میؔر کیا چیز ہے، سوؔدا کیا ہے مجھ کو اِن لوگوں کی پروا کیا ہے
یہ اگر عرصے میں آئے زیں پیش دیکھ تو، میرا بھی ٹھہرا کیا ہے
اے صبا، شمعِ سحر کو نہ ستا اب بجھی جائے ہے عرصہ کیا ہے
گر کیا قتل کسی کو تو کیا چلو، اِس بات کا چرچا کیا ہے
ایک دن اُس کے میں در تک جو گیا ق یہ سمجھ، دیکھوں تو ہوتا کیا ہے
تھے کئی شخص بہم حرف زناں میں کہا اُن سے، یہ غوغا کیا ہے
سن کے واں سے، جو نکل آیا ایک وہ مجھے دیکھ کے کہتا کیا ہے
آپ جو دیر سے اِس جا ہیں کھڑے یہ کہیں آپ نے بیچا کیا ہے

مل گئے خاک میں ہم اب تو کہہ
مصحفی تیری تمنا کیا ہے

1۔ روکشی = مقابلہ، آمنا سامنا

360

گر ابر گھِرا ہوا کھڑا ہے آنسو بھی تُلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کس کا، جو سمندر مدّت سے رُکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسمِ گُل، چمن میں ہر نخل پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد، برابر اُس کے قد کے دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے
ہے چاک کسی کا جیب و داماں کوئی خستہ لُٹا ہوا کھڑا ہے
تو آ کے تو دیکھ، در پہ تیرے کیا سانگ[1] بنا ہوا کھڑا ہے
خلوت ہو کبھو تو یوں کہے وہ ق کوئی در سے لگا ہوا کھڑا ہے
میں: "خیر[2] ہے" گر کہوں تو بولے: "وہ دیکھ چھپا ہوا کھڑا ہے!"
خونیں کفنِ شہیدِ اُلفت دولھا سا بنا ہوا کھڑا ہے
تیرا ہی ہے انتظار اُس کو ناقہ تو کسا ہوا کھڑا ہے
اے جان نکل کہ مصحفی کا
اسباب لدا ہوا کھڑا ہے

361

مُنھ خنجرِ قاتل پہ رکھوں، بے ادبی ہے ہر چند کہ پانی کی مجھے تشنہ لبی ہے
شیریں، تو ذرا جانبِ فرہاد گذر کر کہتے ہیں کہ پتھر تلے واں لوتھ دبی ہے
جس روز سے دیکھا ہے تری مانگ کا جلوہ اُس روز سے عاشق کی دعا نیم شبی ہے
پہنچا نہ مَلک رتبۂ انسان کو کہ اب تک اِس دودۂ آدم[3] کی شرافت نسبی ہے
نکلے ہے مری خاک سے نت دستِ تمنّا یاں خاک ہوئے پر بھی یہ ساغر طلبی ہے

1۔ سانگ = (سوانگ) تماشا 2۔ خیر ہے = بہ معنیٰ نہیں ہے (روز مرّہ)

3۔ دودۂ آدم = نسلِ آدم

عالم نہیں جانا ہے ہنوز، اُس کی صفا کو آئینۂ دل یا کہ یہ شیشہ حلبی ہے

اے مصحفی جس دم کہ پیا بھنگ کا پیالہ
پھر کام[1] میں اپنے وہ شرابِ عنبی[2] ہے

362

گو کہ مخلِّ ہمدمی چرخِ جفا طراز ہے
ہم کو تو اب تلک وہی بندگی و نیاز ہے

کیوں کے شبِ فراق سے ہووے گی میری جاں بری
داغ یہ سینہ سوز ہے، درد یہ جاں گداز ہے

بے خود و مست کون ہے، ہوش و تمیز ہے کسے
بزمِ شراب ہے یہاں، کس کو یہ امتیاز ہے

وقتِ تکلّم اُس کا منھ، دیکھ رہوں نہ کیا کروں
حرف ہے سو وہ ہے ادا، بات ہے سو وہ ناز ہے

آوے شبِ وصال اگر، بعدِ ہزار جستجو
تو بھی نہ لب کو وا کرے، تو وہ بہانہ ساز ہے

سمجھے تھے ہم کہ جائے گی، جیسے گیا ہے روزِ وصل
کب ہمیں اِس کی تھی خبر، ہجر کی شب دراز ہے

دامن اُٹھا کے چلتے ہو، میرے مزار پر عبث
خاک میں تو میں مل گیا، کس سے اب احتراز ہے؟

صدقے گیا تھا، جان و دل ہم کو ہے تجھ سے کیا عزیز
جاں بھی تیری نذر ہے، دل بھی تری نیاز ہے

1۔ کام = حلق 2۔ شرابِ عنبی = شرابِ انگور

دورِ فلک نے مصحفی ہم پہ کیا ہے عرصہ تنگ
سجدہ کہاں کرے کوئی، جاے نہ جا نماز ہے

363

موسمِ گل باغباں، باغ کا در کھول دے
یا نہیں صیّاد سے، کہہ مرے پَر کھول دے

کون کہے ہے کہ کر، غرفہ مرے مُنھ پہ وا
جالی سے لے ہاتھ اُٹھا، راہِ نظر کھول دے

خندۂ لب سے ترے لے جو اجازت، وو ہیں
غنچۂ تصویر کو، بادِ سحر کھول دے

اُس کی درازی ذرا، میں بھی تو دیکھوں بھلا
زلفِ مسلسل صنم، تا بہ کمر کھول دے

ہوں میں دعاے سحر، ہے مری حرمت ضرور
منھ پہ مرے اے فلک، بابِ اثر کھول دے

غمزۂ رہزن ترا، کہتا ہے سورج سے یوں
خیر جو چاہے ہے تو، تیغ و سپر کھول دے

ہم پہ تو کھلتا نہیں، بھید دہن کا ترے
ہے یہ معمّا اِسے، تو ہی مگر کھول دے

گر نہ اتارے مجھے، گھر میں تو اپنے صنم
رہنے کو میرے لیے، اور ہی گھر کھول دے

آج تو کچھ مصحفی غش میں ہے کب کا پڑا
بچنے کی اُمید ہو، آنکھیں اگر کھول دے

364

آب ہو حسرتِ دل آہ بہی جاتی ہے
آرزو دل کی مرے دل میں رہی جاتی ہے

ہم نشیں گو کہ انھیں لاکھ طرح سمجھا دیں
کم نگاہوں کی کوئی کم نگہی جاتی ہے

مجھ کو حیرت ہے، کہ جب خاک میں ملتے ہیں یہ لوگ
کیونکے اِن سے ہوسِ تختِ شہی جاتی ہے

ہم تری بزم میں رہنے کے نہیں ہو کے ذلیل
ہم سے ہر اک کی کوئی بات سہی جاتی ہے

گو طپانچے بھی لگاوے تجھے یہ بادِ صبا
شاخِ گل، تیری کوئی کج کلہی جاتی ہے

سجدہ کرنے سے صفا وہ نہیں حاصل تو نہ ہو
کچھ تو مانندِ نگیں رُو سیَہی جاتی ہے

مصحفی فکرِ سخن ایسا کچھ آسان نہیں
جو غزل ہے سو وہ دِقّت سے کہی جاتی ہے

365

پانوں کا رنگ لب سے ترے آشکار ہے
اِس رنگِ آتشیں پہ قیامت بہار ہے

ہاں اے فلک، خدا سے تو ڈر تو ستم نہ کر
گردن مری بہ تیغِ تغافل دوچار ہے

حیراں ہوں اس قدر، کہ شب وصل بھی مجھے
تو سامنے ہے، اور ترا انتظار ہے

تم اور ہو گئے ہو میاں، ورنہ اب تلک
دیکھو جو غور سے وہی لیل و نہار ہے

حیراں کھڑا رہے ہے، اسے ہو گیا ہے کیا
آئینہ کس کے حسن کا آئینہ دار ہے

لالے کا پھول دیکھ کے کہنے لگا وہ شوخ:
شاید کسی کا یہ جگرِ داغ دار ہے

بلبل کہے ہے گُل سے، کہ اے گُل ذرا تو ٹھیر[1]
جلوے پہ تیری اپنا تو جی بھی نثار ہے

ہوتا ہے بادِ صبح کا تیار قافلہ
ہم بھی تو چلنے والے ہیں، کیا اضطرار[2] ہے

تو سادگی تو دیکھ، کہ تربت پہ میری آ
پوچھے ہے مصحفی سے، یہ کس کا مزار ہے؟

366

شب نالہ ہائے گرم جو سوئے فلک چلے
یک بار میری چشم سے آنسو ڈھلک چلے

وقفہ ہو اِس قدر کہ رخِ مرگ دیکھ لوں
آخر تو تم دکھا کے مجھے اک جھلک چلے

بارش ہوئی وہ دیدۂ گریاں کی اب کی سال
چشموں کا ذکر کیا ہے، کہ دریا چھلک چلے

وہ حور چہرہ سیرِ چمن کو ہو گر سوار
باندھے پرا، رکاب میں حور و ملک چلے

عزمِ سفر ہے ہم کو بھی مدّت سے مصحفی
پر دیکھیے کہ قافلہ یہ کب تلک چلے

367

زلفِ مشکیں ہو جہاں سنبل کی بو کیا چیز ہے
گل کو کہتا ہے ترا عارض، کہ تو کیا چیز ہے

1۔ ٹھیر = بجائے ٹھہر (روزمرّہ) 2۔ اضطرار کے معنی زچ ہونے کے ہیں، مصحفی نے یہ لفظ ''اضطراب'' کے بدلے استعمال کیا ہے۔

ہم وہ وارفتہ ہیں یا رب، جو سمجھتے ہی نہیں
شوق کہتے ہیں کسے، اور جستجو کیا چیز ہے

تیغ کولا، جی کی حسرت دے مرے جی سے نکال
پوچھ لیجو اس گھڑی پھر، آرزو کیا چیز ہے

اور کیا تعریف کیجے اُس بتِ یک چشم کی
آگے یک چشمی کے تصویرِ دو رُو کیا چیز ہے

جان تک ہوتا ہے پاسِ آبرو دانا کے تئیں
جان پر جب آ بنے، تو آبرو کیا چیز ہے

آنکھ کے کھلتے ہی دیکھا اُس نے روے تیغ و تیر
زخمِ دل کیا جانتا ہے یہ، رفو کیا چیز ہے

اُس کے جھنجھلانے میں نکلیں ہیں ہزاروں لطف ہائے
مصحفی میں کیا کہوں، وہ تُند خو کیا چیز ہے

368

نے تیر نہ تلوار، نہ خنجر نہ چُھرا ہے
اک جنبشِ مژگاں ہی میں یاں کام رَوا ہے

سجدہ طرفِ کعبہ کروں، یا طرفِ دل
کعبے میں جو قبلہ ہے، تو دل قبلہ نما ہے

کیا تجھ کو خوش آیا ہے قفس، مرغِ قفس کو
اب گُل کی طرف سے یہی پیغامِ صبا ہے

رنگینیِ دست اُس کی جو مہندی میں ملی ہے
ہوتا نہیں معلوم یہ خوں ہے کہ حنا ہے

جز نالہ و فریاد و فغاں کوے بتاں میں
کوئی اور ہی اِس دردِ محبت کی دوا ہے

اک یار بھی آیا نہ اِدھر ملکِ عدم کا
کیا قافلہ رستے میں کہیں بیٹھ رہا ہے

اس دل پہ چھڑک لا کے، گلاب اپنے ہی ہاتھوں
یہ دیکھ کے صورت تری، بے ہوش ہوا ہے

اے مصحفی اک اور بھی لکھ ریختہ، یعنی
تو شاعرِ غرّا ہے تری فکر رسا ہے

369

سنتے تو ہیں اکثر کہ یہ عنقا ہے ہُما ہے
کیا جانوں میں کیا چیز زمانے میں وفا ہے

اے نکہتِ گل، تو نہ کہیں ہو جو سکدّر
اک میری کفِ خاک بھی ہمراہِ صبا ہے

کیا جانیے کیا صبح کو احوال ہو میرا
پھر رات سے سودا تری زلفوں کا بندھا ہے

اک دردِ محبت ہے کہ جاتا نہیں، ورنہ جس درد کی ڈھونڈھے کوئی، دنیا میں دوا ہے

مضمون مرے خط کا وہ سفّاک سمجھ کر قاصد سے کہے ہے کہ یہ خط کس نے لکھا ہے؟

بکتا ہے تو کیا مرغِ چمن، سامنے گل کے کچھ سوچ بھی ہے تجھ کو، ترا ہوش گیا ہے

وارفتہ ہے اِتنا ترے نظّارے میں، اِس دم ق نے شرم کسی کی ہے اب اس کو، نہ حیا ہے

ٹک دیکھ تو تو مصحفیِ خستہ کی جانب

کیا پیار کی نظروں سے تجھے دیکھ رہا ہے

370

زبس نظروں میں ہیں ڈھنگ اُس بلائے ناگہانی کے

نہ سوئے تا سحر ہم رات، مارے بدگمانی کے

کریں گے یاد کیا اُس بے وفا کو، اتنی چاہت پر

نہیں قاصد سے ہم شرمندہ پیغامِ زبانی کے

خدا لکھے نہ عشقِ ناگہاں دُشمن کے طالع میں

کہ ہم مارے ہوئے ہیں اس بلائے ناگہانی کے

خبر آنے کی سُن کر اُس کے، اُٹھ بیٹھے وہ بستر پر

اُٹھا سکتے نہ تھے سر بھی، جو مارے ناتوانی کے

ادائے لغزشِ پا اُس کی جب لکھنے کو بیٹھے ہیں

قلم گر گر پڑے ہیں ہاتھ سے، بہزاد و مانی کے

مجھے کہتے ہو چاہے ہے کسی کو، پھر تو ان روزوں

ترا دل وہ نہیں، صدقے گیا اس بدگمانی کے

پڑا رہنے لگا جوں نقشِ پا، اب خاک پر یہ دل

اٹھائے اِس نے بھی نقشے ہماری ناتوانی کے

اخیرِ عمر ہے، اب آرزوے عشق کیا کیجیے
ہوئی پیری نمودار، اور گئے وہ دن جوانی کے

انھیں بھی مصحفی جس طرح ہو کر ڈالیے آخر
کچھ اک ایام باقی رہے گئے ہیں زندگانی کے

371

ڈرتا ہوں صبا تجھ سے جو وہ زلف اکڑ جائے
قسمت سے ہماری کہیں کچھ پیچ نہ پڑ جائے

کرتا ہوں میں نالے، تو وہ یوں کوسے ہے مجھ کو
نالوں کو ترے آگ لگے اور تو اجڑ جائے

کیا پانو کرے بند وہ پھر کوے بتاں میں
اُس کُو میں قدم رکھتے ہی دم جس کا اکھڑ جائے

خمیازے پہ خمیازہ تو لیتا ہے، پہ مجھ کو
یہ ڈر ہے کوئی چین کا ٹانکا نہ اُدھڑ جائے

دیکھوں ہوں میں ہر چار طرف بزمِ بتاں میں
شاید کسی بے درد سے یہ آنکھ بھی لڑ جائے

ہو کر کے گُہر پوش، تو آیا ہے چمن میں
جی دھڑکے ہے، پھولوں پہ کہیں اوس نہ پڑ جائے

دیکھے جو تری قدکشی اے سروِ خراماں
شمشاد خجل ہو کے زمیں میں وُوہیں گڑ جائے

اے مصحفی کاغذ پہ ترے نوکِ قلم سے
ہے لطف جو ایسی ہی غزل اور بھی پڑ جائے

372

اینٹھے کبھو خط اور کبھو وہ زلف اکڑ جائے
ڈرتا ہوں کہ آپس میں یہ صحبت نہ بگڑ جائے

صبحِ طرب انگیز ہے وہ ساعدِ سیمیں
روشن ہو ابھی کوس کی سیون[1] جو ادھڑ جائے

دیکھے ہے جو بے طرح کچھ آئینے میں ظالم
ڈرتا ہوں کہ تجھ سے ہی تری آنکھ نہ لڑ جائے

وارفتہ ہوں ایسا میں، کہ کوچے میں بتاں کے
ٹھہراؤں جو ٹک دل کو، تو پھر پانو اکھڑ جائے

گر برق گرے آن کے معمورۂ دل پر
کیا کام ہے اس سے ہمیں جل جائے، اجڑ جائے

1۔ سیون (سلائی، بخیہ) بروزن جیون

ہے جنسِ ملاحت سے گراں ناقۂ لیلیٰ ڈرتا ہوں کہ ناقہ نہ کہیں ریت میں گڑ جائے
لے کر ہی ٹلے بوسہ میاں تیرے لبوں کا
بوسے کی گدائی کو اگر مصحفی اَڑ جائے

373

اُس کی رفتار کا مذکور جب آ جاتا ہے جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رُندھا[1] جاتا ہے
پوچھ مت صفحۂ ہستی پہ مثالِ انساں ہے یہ وہ نقش کہ بنتے ہی مٹا جاتا ہے
ہے جو کاغذ پہ لکھا مطلبِ بے تابیِ شوق خود بخود نامہ ہوا پیچ، اُڑا جاتا ہے
دیکھ کر جامہ کتاں کا ترے بَر میں اے ماہ جوں کتاں اپنا تو دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے
ہے تمھیں روز سیہ کس کو دکھانا منظور کاجل آنکھوں میں دو وقتی جو دیا جاتا ہے
شبِ مہتاب میں دیتا ہے جو تو مکھڑا کھول آگے چہرے کے ترے چاند چھپا جاتا ہے
اب اگر دل کے تئیں لاکھ طرح سمجھا دیں اُس کے بِن دیکھے کوئی ہم سے رہا جاتا ہے
دل سے اُٹھتا ہے دھواں آہ کا جب یک باری آگے آنکھوں کے مری ابر سا چھا جاتا ہے
مصحفی سنیو کہ اس بحر میں اک مطلع اور
بہتر از مطلعِ خورشید لکھا جاتا ہے

374

کون اس باغ سے اے بادِ صبا جاتا ہے رنگ رُخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے
شعلۂ شمع میں گرمی یہ کہاں سے آئی اِس کی گرمی سے تو فانوس جلا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منتِ دست پُرزے ہو ہو کے گریباں اُڑا جاتا ہے
ربطہ پہلے جو ترے یاد کبھی کرتا ہوں بیٹھے بیٹھے مجھے افسوس سا آجاتا ہے
پوچھتا کوئی نہیں، کب سے ترے کوچے میں دل کسی کا ہے کہ پامال ہوا جاتا ہے

1۔ رُندھنا = اٹکنا، بے حال ہونا

گئے وے دن کہ تمنا ہمیں اک اشک کی تھی — اب تو ان آنکھوں سے دریا سا بہا جاتا ہے

شام کے وقت تو کوٹھے پہ جو آتا ہے کبھی — دیکھ کر تجھ کو یہ خورشید چھپا جاتا ہے

بے ادب کے تئیں مطلق نہیں صحبت کا شعور — شانہ کتنا تری زلفوں سے لگا جاتا ہے

یوں قدم رکھ نہ زمیں پر، تری رفتار سے آہ — دل کسی کا ہے کہ ماٹی میں ملا جاتا ہے

مصحفی عشق کی وادی میں گذر ہے کس کا
بھولا بھٹکا کوئی ادھر کو بھی آ جاتا ہے

375

کس منھ سے کریں ہم ہوسِ محملِ لیلیٰ — فریاد میں ہے خود جرسِ محملِ لیلیٰ

مرغِ دلِ مجنوں کا نشاں ہم سے نہ پوچھو — ہووے گا اسیرِ قفسِ محملِ لیلیٰ

ناقے کا قدم نجد میں پڑتا تھا جہاں تک — تھی نکہتِ گل ہم نفسِ محملِ لیلیٰ

مجنوں ہے جہاں، تو مجھے اودھر ہی کو لے چل — لیلیٰ سے یہ ہے ملتمسِ[1] محملِ لیلیٰ

کیا قافلہ اک راہ سے جاتا ہے عرب کا — محمل پہ ہے محمل بہ پسِ محملِ لیلیٰ

فریاد کو مجنوں کی سنے کون، جہاں ہوں — لاکھوں دلِ نالاں، جرسِ محملِ لیلیٰ

اے مصحفی اس وادیِ پُر خوف میں ہم نے
ہر خار کو پایا عسسِ محملِ لیلیٰ

376

لاف گرمی ترے عارض سے جو گلشن مارے — آتشِ گل پہ صبا طیش سے دامن مارے

کیا ستم ہے کہ تو غرفے میں پھرے بال کھلے — اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے

دشمن و دوست کو اُلفت نے تری ایک کیا — ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے

تیری آنکھیں ہیں وہ رہزن کہ جنھوں نے کافر — قافلے لوٹ لیے، سیکڑوں رہزن مارے

1۔ ملتمس = (بہ فتح میم دوم) التماس

سر کو اپنے میں کیا خاکِ رہِ سروِ قداں | اس پہ شاید کوئی ٹھوکر دمِ رفتن مارے
پان و مسّی کی دھڑی دیکھے جو ہونٹوں پہ ترے | لافِ خوبی نہ لب جو، گل و سوسن مارے
کشتنی اور بھی زنداں میں بہت ہیں لیکن | میں یہ چاہوں ہوں، وہ پہلے مجھے گردن مارے

مصحفی چاہے تو اس سے بھی غزل گرم کہے
اس زمیں میں جو کوئی میری طرح گھن[1] مارے

377

غیر سے آنکھ نہ یوں وہ بتِ پُرفن مارے | اور جو مارے تو مجھے[2] تیغ سے گردن مارے
کیا ستم ہے کہ جو گذرے ترے کوچے سے اُسے | چشمک اپنی ہی طرف دیدۂ روزن مارے
اُس کی تربت پہ بنانا ہے چمن اے صیاد | جس کو یاں حسرتِ نظّارۂ گلشن مارے
سختیِ عشق سے ہاتھ اپنا ہے پتھر کے تلے | اس کو سینے پہ کوئی کیا دمِ شیون مارے
سینے آوے جو گریباں ترے دیوانے کا | سر سے عیسیٰ کے وہ لے رشتہ و سوزن مارے
اے خوشا حال اُنھوں کا جو ترے کوچے میں | خاک پنڈے سے ملے بیٹھے ہیں آسن مارے
ہم تو اے غیرتِ لیلیٰ تری خاطر اب تک | قیس کی طرح پڑے پھرتے ہیں بن بن مارے

مصحفی کام مرا ضبط سے اب در گذرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

378

اس ظلم کی آفت کسی ہم فن پہ نہ ہووے | ہم پر جو مصیبت ہے وہ دشمن پہ نہ ہووے
اس ڈر سے میں تکتا نہیں روزن کی طرف بھی | واں آنکھ تری بھی کہیں روزن پہ نہ ہووے
کیا لطف سے دیکھوں میں ترے حسن کا عالم | سورج کی نظر گر ترے چلمن پہ نہ ہووے
منظور ہے گر عرس مرا کیجیے لیکن | انبوہِ رقیباں مرے مدفن پہ نہ ہووے

1۔ گھن = وہ بڑا ہتھوڑا جس سے گرم لوہا کوٹا جاتا ہے 2۔ مجھے بجائے میری (عوامی)

جاتا نہیں اِس ڈر سے میں شمشیر تلے بھی احسان کسی کا مری گردن پہ نہ ہووے
دیکھے جو مرے داغِ جگر بلبلِ بستاں تو شیفتہ رعنائیِ گلشن پہ نہ ہووے
صد چاک ہے کیوں مصحفیِ خستہ کا سینہ
پوچھو تو، وہ عاشق کسی درزن پہ نہ ہووے

379

نہ تو یہ آہ ہی ہم دوشِ اثر ہوتی ہے نہ شبِ ہجر کی کم بخت سحر ہوتی ہے
ذبح کے وقت بھی قاتل سے میں کہہ دیتا ہوں آستیں تیری مرے خون سے تر ہوتی ہے
تو جو بالیں سے مری اُٹھ کے لگے ہے جانے تیرے اُٹھتے ہی قیامت مرے گھر ہوتی ہے
ہے شبِ ہجر، مَیں اُٹھ اُٹھ کے قلق کے مارے دل کو دیتا ہوں تسلّی کہ سحر ہوتی ہے
سیکڑوں معنیِ باریک نظر آتے ہیں جب کبھی پیشِ نظر اُس کی کمر ہوتی ہے
ہم کو درپیش ہے یاں تیغ تلے سر رکھنا یہ مہم دیکھیے کس طرح سے سر ہوتی ہے
یہ بگولا نہیں اُٹھتا ہے ترے کوچے سے حسرتِ دل ہے کہ واں خاک بسر ہوتی ہے
مصحفی ربط یہ پہنچا ہے بہم اُس سے مجھے ق کہ بہ یک خانہ ہی اوقات بسر ہوتی ہے
لیک آنکھوں ہی میں رہتا ہے تصوّر اُس کا
کسی دن اُس سے جُدائی بھی اگر ہوتی ہے

380

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بُت سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں اُس سے، تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
نہ چھیڑ زلف کو اے شانے کیا کرے تو بھلا
یہ ناگنی جو تجھے کاٹ کر ذرا پھر جائے

خدا کرے نہ ملے اُس کو آشنا کوئی
اگر کِسی سے کوئی ہو کے آشنا پھر جائے

ذرا جواب تو دے اُٹھ کے اپنے سائل کو
یہ، بے نصیب ترے آستاں سے کیا پھر جائے

روا ہے یہ کہ نہ آوے تو در تلک اپنے
دلِ ستم زدہ دے کر تجھے دعا پھر جائے

عجب یہ کیا ہے جو دیکھے وہ گھور کر مجھ کو
لبوں پہ آکے مرے نالۂ رسا پھر جائے

ہوا ہے دل مرا گم، پاوے سو بٹھا رکھے
فغانِ نالہ، منادی یہ جا بجا پھر جائے

وہ آفتاب جدھر رُو کرے، عجب کیا ہے
منھ اُس طرف کو گلِ آفتاب کا پھر جائے

کرے اشارہ جو مژگانِ سرمہ سا کا وہ شوخ
تو دل کے گرد مرے، لشکرِ بلا پھر جائے

پھرا جو واں سے سو وہ زینہار پھر نہ گیا
گلی میں اُس کی کوئی ہم سا بے حیا پھر جائے؟

ہوا ہے، ابر ہے، بھر ساقیا گلابیِ مے
نہ کر دِرنگ[1]، مبادا کہ یہ ہوا پھر جائے

میں تلخ کام ہوں زہرِ فراق سے ایسا
کہ جیسے مردمِ بیمار کا مزا پھر جائے

1۔ دِرنگ = دیر، تاخیر

نہ پلٹے تیغ تری، سر سے تیرے عاشق کے
یہ بات اور ہے، آئی ہوئی قضا پھر جائے

سناؤ اب کی غزل مصحفی اک ایسی بھی
کہ جس سے سن کے، زبانوں پہ مرحبا پھر جائے

381

دکھا کے در سے وہ مڑنے کی گر ادا پھر جائے
تو پارسائی سے پھر اپنی پارسا پھر جائے

بہ رنگِ مار گزیدہ رہے وہ سوتا ہی
کسو کے سر پہ جو وہ کاکلِ رسا پھر جائے

وہ اضطراب ہے اُس کے تئیں، جو آوے بھی
تو دے کے خط مجھے قاصد برہنہ پا پھر جائے

پیالے دیتے ہو بھر بھر کے سب کو تم، کیا ہو
مری طرف بھی اگر ہاتھ آپ کا پھر جائے

کریں ہیں غیر خبر اُس کو میرے مرنے کی
کہ رستے ہی میں سے سن کر یہ ماجرا پھر جائے

وہ آفتاب جو آوے نکل تو اُس کی طرف
خود آفتاب، گلِ آفتاب سا پھر جائے

جو دے سکے نہ رہِ عشق میں ہمارا ساتھ
ہمارے ساتھ نہ آوے وہ آشنا پھر جائے

دیا ہے مجھ کو یہ برگشتہ طالعی نے اثر
کہ آکے سر پہ مرے سایۂ ہُما پھر جائے

ستم ہے یہ کہ پھریں ہم سے، اک تو وے زلفیں
اور اُن کے ساتھ میاں، ہم سے رخ ترا پھر جائے

ہوا کچھ اور ہی واں بندھ رہی ہے، دور نہیں
جو پچھلے پانْو گلی سے تری صبا پھر جائے

ترے شہید کا کوئی نہیں، اُسی کا خون
تری گلی میں مگر ہو کے خوں بہا پھر جائے

پھروں میں آپ سے ممکن نہیں یہ، بے تقصیر
مزاج آپ کا مجھ سے اگر پھرا، پھر جائے

بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

بدل کے قافیہ لکھ اک غزل اب ایسی اور
کہ جس کے پڑھتے ہی اے مصحفی ہوا پھر جائے

382

غم اس کا کچھ نہیں گو مجھ سے اک جہاں پھر جائے — پہ یہ نہ ہو کہ مرا یارِ مہرباں پھر جائے
بیاں کروں خطرِ وادیِ محبت گر — تو راہ ہی میں سے یاروں کا کارواں پھر جائے
نقاب منھ سے نہ کھول اپنے، میری آنکھوں میں — خدا ہی جانے کہ اِس وقت کیا سماں پھر جائے
برس تو ابرِ مژہ اِس قدر کہ جس سے ذرا — گلوں کو تازگی ہو، رنگ گلستاں پھر جائے
روا ہے یہ کہ ترے آستاں پہ جو آوے — لگا کے منھ سے تری خاکِ آستاں پھر جائے
اگر مقابلِ ابروے یار ہو ارجن — تو ہاتھ اُس کے لگیں کانپنے، کماں پھر جائے
بعید کیا ہے جو قبلے سے تیرے منھ کی طرف — برنگِ قبلہ نما روے زاہداں پھر جائے
ہے جاے رحم یہاں اُس اسیرِ بے بس پر — قفس کو، دیکھ کے جو اپنا آشیاں پھر جائے

زمیں شگفتہ ہے، اب دوسری غزل کی طرف
کُمیتِ[1] خامہ کی اے مصحفیؔ عناں پھر جائے

383

جہاں سے جائے وہ، جو تم سے اے بتاں پھر جائے — ستارے پھیر لیں منھ اُس سے، آسماں پھر جائے
سَمومِ آہ مری، رو کرے جدھر کو وہیں — گلوں کے چہرے پہ اک زردیِ خزاں پھر جائے
تو در کو شوق سے رکھ بند، پر نہ اتنا بھی — کہ آوے جو کوئی، وہ ہو کے بدگماں پھر جائے
سنہری حسن کی اُس کے پڑے جو اس پہ جھلک — تو کچھ عجب نہیں گر رنگِ زعفراں پھر جائے
جو تیرے حفظ میں ہو، اُس کے قصد پر دشمن — کماں جو ہاتھ میں لے تو رُخِ کماں پھر جائے
گلی میں اُس کی مجھے سب کہیں ہیں آتا دیکھ — نہ اپنی جان پہ کھیلے یہ نوجواں، پھر جائے
گماں غلط ہے یہ اک آدھ کا، خدا نہ کرے — ق — کہ اپنی طرزِ سخن سے مری زباں پھر جائے
ہزار بار میں چورنگ[2] اِس سے کاٹے ہیں — یہ تیغ وہ نہیں جو وقتِ امتحاں پھر جائے

1۔ کُمیت = گھوڑا 2۔ چورنگ یعنی چاروں انگ

پھریں نہ مصحفی ہم اُس سے، شرطِ عشق ہے یہ
ہزار اپنی طرف سے وہ دل ستاں پھر جائے

384

جب جاتے جاتے اُس نے پردہ اُٹھا دیا ہے — عالم کو رہ گذر میں عالم دکھا دیا ہے
ہر لحظہ جعد[1] اُس کی دل مانگتی ہے مجھ سے — کافر نے کِس بلا کو پیچھے لگا دیا ہے
مذکور میں دہن کے، لایا ہوں زلف کا ذکر — تھوڑی سی بات کو میں کتنا بڑھا دیا ہے
آیا ہے جب چمن میں نازک نہال میرا — ہر شاخِ گل نے اپنے سر کو جھکا دیا ہے
اُٹھے ہیں سرگراں ہم، خوابِ عدم سے ہم کو — یہ کچی نیند میں سے کس نے جگا دیا ہے
نے خط و نے کتابت، یارانِ رفتہ نے تو — یک بار اپنے جی سے ہم کو بھلا دیا ہے
گھڑیوں پہ آرہی ہے اب اپنی زندگانی — جوں شمع داغِ غم نے ازبس جلا دیا ہے
بادِ صبا چمن میں آئی ہے گر کبھی تو — غنچوں نے چٹکیوں میں اُس کو اُڑا دیا[2] ہے

گر مصحفی میں اُس سے مانگا ہے کوئی ساغر
ساقی نے میری ضد سے شیشہ لُڑھا[3] دیا ہے

385

نہ قاصد ہے نہ نامہ ہے نہ پیغامِ زبانی ہے
کئی دن سے ہمارے حال پر نا مہربانی ہے
اگرچہ اوٹ تو دل لوٹ ہونے کی نشانی ہے
ادا چتون کی اُس کی پر بعینہٖ خصم جانی[4] ہے

1۔ جعد = زلف، چوٹی 2۔ چٹکیوں میں اڑانا = تمسخر کر کے بھگا دینا،
3۔ لڑھانا بجائے لنڈھانا (روزمرّہ) 4۔ تصحیح قیاسی

خلل سا آگیا ہے جلوۂ دامن درازاں میں
زبس رونے سے میرے تا کمر گلیوں میں پانی ہے

خرام اُس کے میں ہے انداز آشوبِ قیامت کا
قیام اُس کے میں، اک ترکیبِ سرو بوستانی ہے

سرِ شب سے ہی سو رہتے ہو کیا تم ڈھانپ کر منھ کو
میاں کچھ شغل بھی لازم ہے، قصہ ہے، کہانی ہے

دیے آتا ہوں اپنا چاکِ جیب اُس گُل کو یہ کہہ کر
کہ "لے، جاتا ہوں میں یہ مجھ دوانے کی نشانی ہے"

قفس میں ہوں میں اُس کے، تو اُس صیاد کافر کو
مرا ہی فکر ہے، ہردم مری ہی پاسبانی ہے

اگر میں مر گیا، تیری بلا سے، تو نہ ہو غمگیں
بلا سر سے ٹلی تیرے، پھر اب کیا سرگرانی ہے

خدا کے واسطے اے شب، نہ جا اتنی شتابی سے
کہ اُس نے بعد مدّت کے مری اک بات مانی ہے

کناری[1] گردِ دامن برق سی چمکے ہے، اے ظالم
یہ جوڑا آسمانی بھی بلائے آسمانی ہے

قدم آگے اُٹھا سکتے نہیں ہم اُس کے کوچے سے
کہ پانو پر ہمارے سر جھکاتی ناتوانی ہے

لیا ہے چلتے چلتے جو اُٹھا ہاتھوں میں دامن کو
خدا جانے اُسے منظور کیا آفت اُٹھانی ہے

1۔ کناری = دامن کی سجاوٹ کے لیے گوٹ

جو نقشِ اوّل غزل کا تھا، سو تو نے مصحفی دیکھا
غزل اب دوسری لکھتا ہوں، سو یہ نقشِ ثانی ہے

386

نہ وہ راتیں نہ وہ باتیں نہ وہ قصہ کہانی ہے
فقط اک ہم ہیں بستر پر پڑے، اور ناتوانی ہے

بھلا میں ہاتھ دھو بیٹھوں نہ اپنی جان سے کیوں کر
خرام اُس کے میں، اک آبِ رواں کی سی روانی ہے

تو یوں بے پردہ ہو جایا نہ کر ہر ایک کے آگے
نیا عالم ہے تیرا، اور نئی کافر جوانی ہے

نہ تنہا میں ہی اپنے دل کو اس کوچے میں ڈھونڈھوں ہوں
کہ یاں خضر و مسیحا نے بھی آ کر خاک چھانی ہے

بسانِ صورتِ شب باز، ہم جیتے تو ہیں لیکن[1]
جو سچ پوچھو بہ دستِ غیر اپنی زندگانی ہے

کسی نے کچھ کہا ہرگز نہیں، تم ناز تو دیکھو
نزاکت کے سبب سے، اُس کو آپ ہی سرگرانی ہے

نہ تنہا گل گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ اس سج کو
چمن میں آب جو بھی چال پر اُس کی دوانی ہے

طبیعت ناگہاں آوے نہ روے خوش پہ دشمن کی
کہ اِس کا ناگہاں آنا، بلائے ناگہانی ہے

مجھے وحشت سی اک ہوتی ہے پیدا، آہ کیا کیجیے
کہ اُس بن کیا اندھیری رات ساون کی ڈرانی[2] ہے

تری باتوں نے تو اے مصحفی جی کو جلا ڈالا
خدا کے واسطے چپ رہ، یہ کیا آتش زبانی ہے

387

نصیب اپنے میں غم، اَوروں کو عیش و شادمانی ہے
ہم اِس جینے سے درگذرے، یہی گر زندگانی ہے

اگر ہے دشمنِ جاں، تو بھی اپنا یارِ جانی ہے
تغافل میں بھی اُس کے، اک طرح کی مہربانی ہے

1۔ صورتِ شب باز = کٹھ پتلی کے تماشے کی طرف اشارہ ہے

2۔ ڈرانی بجائے ڈراونی باندھا ہے

اُٹھیں کیوں کر نہ مُر دے گور سے، وقتِ خرام اُس کے
کہ یہ بُوٹا سا قد اُس کا، قیامت کی نشانی ہے

سنجافِ سرخ یوں لگتی ہے اُس کے سبز جامے پر
کہ گویا برق دامن گیر سروِ بوستانی ہے

کوئی کس وقت دردِ دل کہے جب جایئے واں تو
تغافل ہے، تجاہل ہے، ادا ہے، سرگرانی ہے

سر اپنا کاٹ کر رکھ دیں گے اک دن روبرو اس کے
کریں کیا آہ ہم نے بھی یہی اب جی میں ٹھانی ہے

کروں کس طرح ضبطِ عشقِ خوباں مصحفی دل میں
کہ اپنی بے قراری دشمنِ رازِ نہانی ہے

388

مہندی نے ترے ہاتھوں پہ یہ رنگ دیا ہے　　یا لالے کی پتّی کو بہم کرکے سیا ہے
ٹک تو بھی تو جا اُس کی عیادت کو، کہیں ہیں　　بیمار تری چشم کا، مر مر کے جیا ہے
آتا ہے بھبوکا سا نظر وہ گُلِ عارض　　کافر نے جو جامِ مئے گُل رنگ پیا ہے
معلوم نہیں مجھ سے غرض کیا ہے، صبا نے　　کیوں میری کفِ خاک کو برباد کیا ہے

اے مصحفی سنیو کہ اِنھیں قافیوں کے بیچ
اک ریختہ میں اور قلم بند کیا ہے

389

کاجل تری آنکھوں میں میاں کس نے دیا ہے　　اس روپ نے کاجل کے تو سُتھراؤ کیا ہے
اے دستِ جنوں کیجیو ٹک تو تو توقف　　ناصح نے ابھی میرے گریباں کو سیا ہے
نکھرا ہے جو ٹک رنگ پھر اُس رشکِ پری کا　　کیا خونِ جگر سے مرے تنبول[1] پیا ہے

1۔ تنبول = پان

اُس دستِ حنائی میں جو میں دیکھے ہیں پانسے
بن پھینکے ہی اپنا دل و دیں ہار دیا ہے
مارے ہیں پشیماں ہو منھ اپنے پہ طمانچے
اِس منھ سے اگر ہم نے ترا نام لیا ہے
کہتے ہو غلام اپنا جو ہر ایک کے آگے
کیا مصحفی کو تم نے میاں مول لیا ہے؟

390

غصّے کو جانے دیجیے نہ تیوری چڑھایئے
میں گالیاں بھی آپ کی کھائیں، اب آیئے
رفتار کا جو فتنہ اُٹھا تھا سو ہو چکا
اب بیٹھے بیٹھے اور کوئی فتنہ اُٹھایئے
میرا تو کیا دہن ہے، جو بوسے کالوں میں نام
گالی بھی مجھ کو دیجیے تو گویا جلایئے
بولا کسی سے میں بھی تو کیا کچھ غضب ہوا
اتنی سی بات کا نہ بتنگڑ بنایئے
ایسا نہ ہو کہ جائے شتابی سے دم نِکل
چاکِ جگر سے پہلے، مرا منھ سلایئے
رکھا جو اک شہید کی تربت پہ اُس نے پانو
آئی صدا یہ واں سے کہ دامن اُٹھایئے
بِکتے ہیں تیرے نام سے ہم اے کمندِ زلف
تجھ کو بھی چھوڑ دیجیے تو کس کے کہایئے
اس کی گلی نہ مکتبِ طفلاں ہے مصحفی
تا چند جایئے سحر، اور شام آیئے

391

دیں تو کیا چیز ہے ایمان بھی صدقے کیجیے
ایسے معشوق پہ جی جان بھی صدقے کیجیے
اب کی گر فصلِ گل آوے تو گلوں کے اوپر
پھاڑ کر اپنا گریبان بھی صدقے کیجیے
گل فروش اُس کی تمنا میں یہی کہتے ہیں سب
اِدھر آجائے تو دکّان بھی صدقے کیجیے
گرچہ انسان میں ہوتا ہے عجب حسن و نمک
اے پری تجھ پہ تو انسان بھی صدقے کیجیے
عارضِ گل سے نہیں کم، ترے تلووں کی صفا
اس صفا پر مہِ تابان بھی صدقے کیجیے
وقت بوسے کے حلاوت ہے وہ ان میں کہ میاں
تیرے دندان پہ دندان بھی صدقے کیجیے

فصلِ گل کہتی ہے، اے مصحفی داغوں پہ ترے
گل تو کیا، لالۂ نعماں بھی صدقے کیجیے

392

یہ لوگ میاں جی سے گذر جاتے ہیں کیسے
عاشق جو ترے ہوتے ہیں مر جاتے ہیں کیسے

جی جھونک کے آتے ہیں جو مژگاں کے مقابل
کام اپنا وہ اک آن میں کر جاتے ہیں کیسے

جا کر کے گھر اپنے میں، بتاں بیٹھ رہیں ہیں
یہ اُٹھ کے مرے پاس سے گھر جاتے ہیں کیسے

ہے سیر کو اکب میں تجھے دخل تو کہہ دے
مجھ پر یہ دن اے رشکِ قمر جاتے ہیں کیسے

یا شانے تک ان بالوں کے تئیں تھی نہ رسائی
یا دوڑے ہوئے تا بہ کمر جاتے ہیں کیسے

صدقے میں گیا ان کے، ترے موے پریشاں
اک باؤ کے جھونکے میں بکھر جاتے ہیں کیسے

آ نکلے ہے وہ شوخ جو ٹک منھ کو بنائے
ہم دیکھتے ہی بس اُسے ڈر جاتے ہیں کیسے

پر توڑ کے صیاّد مرے پھینک دے اور دیکھ
اُڑتے ہوئے گلزار کو پر جاتے ہیں کیسے

میں طالعِ عشاّق کا بندہ ہوں کہ ہے ہے
کام اِن کے بگڑنے میں سنور جاتے ہیں کیسے

پاسِ سخن ازبس نہیں پیماں شکنوں کو
یہ سر کی قسم کھا کے مکر جاتے ہیں کیسے

جانے سے جدھر کے مجھے کرتے تھے سدا منع
ہمدم مرے اب آپ اُدھر جاتے ہیں کیسے

ناسور جو سینے میں نہیں، داغِ محبت
آنسو ترے اے دیدۂ تر جاتے ہیں کیسے

اے مصحفی پھرتے نہیں جو ملکِ عدم سے
ہستی کے سفر والے سفر جاتے ہیں کیسے

393

یہ دل کہ آتشِ غم پر سپند رہتا ہے
نت اُس کی آگ سے شعلہ بلند رہتا ہے

کراہنے کی سی آواز شب کو آتی ہے
تری گلی میں کوئی دردمند رہتا ہے

جو غیر سے اُسے رہتی نہیں بہم خلوت
تو کیوں در اُس کا شب و روز بند رہتا ہے

دلِ رمیدہ ترے دامِ زلف میں پابند　بسانِ آہوے سر در کمند رہتا ہے

ہیں مصحفی کی وہی شورشیں جو تھیں آگے
لَونڈیوں سے کوئی یہ لَونڈ رہتا ہے

394

دیکھے جو تری فندقِ سفاّک کے ڈورے　بس کھل گئے اپنے تو دلِ چاک کے ڈورے
یا رب نہ لگے چشمِ بد اِن کو کہ غضب ہیں　نیلے وہ ترے ساعدِ چالاک کے ڈورے
تسبیحیں بنا وے جو کوئی خاکِ شفا کی　لازم ہے رگِ جاں کرے اُس خاک کے ڈورے
انگور کے دانوں کو شبِ مہ نے صفا دی　یاں تک کہ ہوئے عقدِ گہر تاک کے ڈورے
برساتیں بہت کھائیاں گریے کی ہمارے　تو بھی نہ گلے خیمۂ افلاک کے ڈورے
گر خوں نہیں نظروں سے کیا تو نے کسی کا　کیوں لال ہیں اِس چشمِ غضبناک کے ڈورے
آیا تھا نہانے کو وہ حمام میں، ہوگئے　رشکِ رگِ گل، کیسۂ دلاّک[1] کے ڈورے
زیں سازی اگر آتی مجھے، میں تو مری جاں　پلکوں سے بناتا ترے فتراک کے ڈورے

اے مصحفی کیا کہیے کہ شب فرطِ الم میں
خنجر سے میں کاٹے جگر چاک کے ڈورے

395

ٹوٹے جو رفوے جگرِ چاک کے ڈورے　جا کر بنے اُس نرگسِ سفاک کے ڈورے
مشتاق ترے مل گئے سب خاک میں ظالم　یاں تک کہ ہوئے تارِ کفن خاک کے ڈورے
کیفیتِ چشم اُس کی رقم کرنے کو ہم نے　مسطر میں لگائے ہیں رگِ تاک کے ڈورے
نازک بدنی دیکھ کہ ہنگامِ سواری　خط کھینچتے ہیں پانو پہ فتراک کے ڈورے
مے پینے کے دن ہو چکے، اب آنکھوں میں اُس کی　رہتے ہیں چھپے نشۂ تریاک کے ڈورے

1۔ دلاّک = مساج کرنے والا

جوں رشتہ بپا مرغ ہی جاوے گا چمن کو دو کاٹ کوئی بلبلِ غم ناک کے ڈورے
راتوں کو ستارے یہ چمکتے نہیں، ناداں آتے ہیں نظر خیمۂ افلاک کے ڈورے
اے مصحفی پالی کا اب آ دیکھ تماشا
بندھتے ہیں خروسِ بتِ چالاک کے ڈورے

396

گئے ہیں یار اپنے اپنے گھر، دالان خالی ہے اگر تم آملو ایسے میں، تو میدان خالی ہے
کوئی یوسف سے جا کر مصر میں اتنا تو کہہ دیتا گیا ہے جب سے تو اے ماہرو کنعان خالی ہے
خدا جانے کہ کیا درپیش آیا ہم صفیروں کو بہار آئی ہے اور اب کی برس زندان خالی ہے
تماشا ہے کہ جوں آئینہ، اس صورت پرستی پر تماشے سے ہمارا دیدۂ حیران خالی ہے
خدا جانے کہ میں دیوانہ کس صحرا سے آیا ہوں جو ایسی رُت میں پھولوں سے مرا دامان خالی ہے
برنگِ شیشۂ ساعت دل اپنا گردِ کلفت سے بھرا ہے گر فلک اک آن، تو اک آن خالی ہے
ہزاروں میں کوئی اک آدھ ہاں ایسا بھی ہووے گا تعشق سے وگرنہ کون سا انسان خالی ہے
نہ ہوویں اے دل آنکھیں جس کے چہرے پر سودہ چہرہ مثال اس کی سمجھ، نرگس سے نرگس دان خالی ہے
تڑاوے[1] کے لیے ہے خوان پوشِ مہر ومہ ناداں فریبِ چرخ مت کھانا کہیں، یہ خوان خالی ہے
اگرچہ مصحفی گل پھول لاکھوں میں نے کترے ہیں
پر اب تک شعرِ رنگیں سے مرا دیوان خالی ہے

397

کسی پر دل کا آجانا غضب ہے کسی کا جی کو یوں بھانا غضب ہے
تری زلفوں کی لیتا ہے بلائیں کٹے ہاتھوں پہ بھی شانا غضب ہے
اگرچہ قصۂ خسرو ہے شیریں پہ مجنوں کا بھی افسانا غضب ہے
میاں سر پر غریبوں کے تمھارا سپر تلوار کھڑکانا غضب ہے

1۔ تڑاوے (تڑی دینا) دھوکا (عوامی)

اگرچہ شمع ہے جلنے میں استاد پر اس بت پر بھی پروانا غضب ہے
ترا منہ پھیرنا تو ہے ہی کافر تری زلفوں کا بل کھانا غضب ہے
شرابِ عشق کہتے ہیں جسے دوست بس اُس کا ایک پیمانا غضب ہے
کہے تھا شانہ یوں حیران ہو کر گھنے بالوں کا سُلجھانا غضب ہے
تم اے یارو نہ چھیڑو مصحفی کو
نہیں تو پھر یہ دیوانا غضب ہے

398

زخم کاری جگر پر آیا ہے عشق نے اب مزا چکھایا ہے
کیوں نہ خوش ہوں میں جی ہی جی میں دلا میں نے معشوق خوب پایا ہے
کیوں ڈروں سایۂ پری سے میں تیری زلفوں کا مجھ پہ سایا ہے
کیوں کے لوں نام اپنی ہستی کا میرے گھٹ[1] میں تو تو سمایا ہے
آہ کس سے کہوں میں، میرے تئیں ق تو نے کس کس طرح ستایا ہے
گر ہنسایا ہے مثلِ گل اک دم مثلِ شبنم وہیں رُلایا ہے
یار ہے مصحفی کے گھر مہماں
طالعوں نے یہ دن دکھایا ہے

399

جب گھر سے وہ بعدِ ماہ[2] نکلے منہ سے مرے کیوں نہ آہ نکلے
دل وہ ہے کہ جس سے چاہ نکلے منہ وہ ہے کہ جس سے آہ نکلے
زنداں کی تو اپنے سیر تو کر شاید کوئی بے گناہ نکلے
مانی سے کھنچی نہ خط کی تصویر لاکھوں ورقِ سیاہ نکلے

1۔ گھٹ = دل 2۔ یعنی چاند نکلنے کے بعد

خجلت یہ ہوئی کہ محکمے سے شرمندہ مرے گواہ نکلے
رستے مسدود ہوگئے ہیں اب دیکھیے کیوں کے راہ نکلے
پلکیں نہیں چھوڑتیں کہ اک دم آنکھوں سے تری نگاہ نکلے
اے آہ تو لے تو چل علَم کو تا آنسوؤں کی سپاہ نکلے
نکلا میں گلی سے اُس کی اس طرح جیسے کوئی داد خواہ نکلے
وہ سوختہ میں نہیں کہ جس کی تربت سے گل و گیاہ نکلے
شعر اپنے جو مصحفی پڑھوں میں
منھ سے ترے واہ واہ نکلے

400

شام جلتا ہے دلِ خستہ، سحر جلتا ہے پر تو کیا جانے وہ کم بخت کدھر جلتا ہے
جس طرح سوز دو ہیزم کو بہم ہو، اس طرح آتشِ عشق میں دل اور جگر جلتا ہے
بزم اکسیر گراں ہے یہ طرب خانۂ آز واسطے زر کے یہاں آگ میں زر جلتا ہے
سرکشی خوب نہیں بزمِ شہاں میں اے چرخ اِنھیں باتوں میں تو یاں شمع کا سر جلتا ہے
کاش لے جا کے مرا دل بھی رکھیں آتش پر عود سوزوں میں جہاں عود و اگر جلتا ہے
عشق کی آگ لگی ہے مرے دل میں، ہے ہے دوڑیو لوگو محبت کا نگر جلتا ہے
استخوانوں سے مرے نکلے ہے جلنے میں فغاں آتشِ تیز سے جوں خشک شجر جلتا ہے
جی نکل جائے ہے میرا دو ہیں، پروانے کا شعلۂ شمع پہ گر ایک بھی پر جلتا ہے
آسماں سے مجھے آج آتی ہے کچھ بوے کباب نالۂ نیم شبی تیرا اثر جلتا ہے
کیا کہیں سایۂ خورشید میں آیا، سچ کہہ آج پنڈا[1] ترا اے رشکِ قمر جلتا ہے
ایک نے اُس سے کہا: مصحفی تیری خاطر **ق** تپ کی شدّت میں پڑا آٹھ پہر جلتا ہے
تب کہا اُس سے یہ اِن نے کہ اگر سچ ہے یہ بات میں بھی دیکھوں تو کہاں ہے وہ، کدھر جلتا ہے

1۔ پنڈا = بدن

جوں ہی وہ ساتھ لے آیا اُسے باتوں میں لگا دیکھتا کیا ہے کہ اک شخص کا گھر جلتا ہے

401

نہ فقط مال کا عاشق کے ضرر ہوتا ہے عشق میں جی کا بھی البتہ خطر ہوتا ہے

تاب لاوے نہ ترے تیرِ نگہ کی رُستم دل ہے میرا ہی کہ یوں سینہ سپر ہوتا ہے

کوچۂ یار ہے وہ قتل گہِ بے گنہاں رقصِ بسمل ہی جہاں آٹھ پہر ہوتا ہے

ہے دلا جوہرِ قابل کو قبولیت شرط ابرِ نیساں کا نہ ہر قطرہ گہر ہوتا ہے

کس کی رفتار سے پہنچے ہے یہ صدمہ اس کو دل جو سینے میں پڑا زیر و زبر ہوتا ہے

آپ کو میں ترے ہاتھوں سے لٹایا جس طرح یوں بھی تاراج کسی شخص کا گھر ہوتا ہے

ہے وہ آغشتہ بہ خوں خاک ترے عاشق کی سبز جس خاک سے لالے کا شجر ہوتا ہے

دیکھ آتا ہوں میں جا کر اُسے اُس کوچے میں گر نصیبوں سے کُھلا روزنِ در ہوتا ہے

مصحفی ریختہ اک اور بھی ٹانک اے بے درد
کہ ترا شعر بہ از سلکِ گہر ہوتا ہے

402

ٹکڑے ٹکڑے جو کسی گل کا جگر ہوتا ہے اُس کے صدمے کا مرے دل میں اثر ہوتا ہے

ہے تری کو میں خبر حشر کے ہنگامے کی پر میں کیا جانوں یہ ہنگامہ کدھر ہوتا ہے

کیا کہوں ہائے مری جان نکل جاتی ہے جب شب وصل کا آغازِ سحر ہوتا ہے

میری تربت پہ جو تم آؤ تو کچھ دور نہیں ایک عالم کا اِدھر سے بھی گذر ہوتا ہے

کتنے گردن زدنی سر سے گذر جاتے ہیں نیمچہ[1] جب کبھی واں زیبِ کمر ہوتا ہے

وہ جو اُٹھتا ہے بگولا ترے کوچے سے کبھو اُس کے پردے میں کوئی خاک بسر ہوتا ہے

کب قمر کو ترے رخسار سے تشبیہ میں دی عبث آزردہ تو اے رشکِ قمر ہوتا ہے

1۔ نیمچہ = چھوٹی تلوار، گپتی

کن نے دیکھا، جو میاں پھول سا مکھڑا تیرا   دیکھتا ہوں عرقِ شرم سے تر ہوتا ہے

میں یہ حیراں ہوں کہ اس اجڑے نگر میں یارب   کیوں کے آباد کسی شخص کا گھر ہوتا ہے

دل کو اپنے تو میں دیکھوں ہوں کہ یہ مثلِ صبا   خوار پھرتا ہے پڑا، خاک بسر ہوتا ہے

مصحفی عزمِ سفر ہی تجھے رہتا ہے میاں
تو تو چلتا نہیں جب وقتِ سفر ہوتا ہے

403

آگے ہستی کے تری، ہستیِ عالم کیا ہے   گل جہاں جلوہ کرے قطرۂ شبنم کیا ہے

میں اُسی کشتے کا کشتہ ہوں کہ وہ ذبح کے وقت   کھول کر آنکھیں کہے: خنجرِ بے دم کیا ہے

وقتِ رخصت، مرے یاروں نے مرے قاتل سے   یہ نہ پوچھا کہ مرے زخم کا مرہم کیا ہے

معنیِ محرم کے نہ ہر ایک سے تو پوچھا کر   ابھی لڑکا ہے تو ان باتوں سے محرم کیا ہے

جو مرے جی پہ گذرتی ہے سو جی جانے ہے   تجھ کو اِس بات کا غم اے دلِ بے غم کیا ہے

اس نے چھیڑا نہیں کچھ تجھ کو، مری آہ کے ساتھ   کیوں اُلجھتا ہے عبث، طرۂ پرخم کیا ہے؟

مصحفی اس کی رکھائی ہی سے جی ڈرتا ہے
مہرباں ہووے جو وہ ہم پہ، تو پھر غم کیا ہے

404

تصوّر تیری صورت کا مجھے ہر شب ستاتا ہے
کبھو پاس آئے ہے میرے، کبھو پھر بھاگ جاتا ہے

خدا جانے تجھے اس کی خبر ہے یا نہیں ظالم
کہ وہ اک آن میں کیا کیا سمیں مجھ کو دکھاتا ہے

بلائیں اُس کی میں لیتا ہوں چٹ چٹ اُٹھ کے جس ساعت
مری چالاکیوں کو دیکھے ہے اور مسکراتا ہے

جو اُٹھتا ہوں تو کہتا ہے: ''کدھر جاتا ہے ادھر آ''
جو بیٹھوں ہوں تو کہتا ہے کہ: ''میں جاتا ہوں، آتا ہے''

ق

جو روتا ہوں تو کہتا ہے: ''تو کیوں روتا ہے دیوانے''
جو سر زانو پہ رکھتا ہوں تو ہاتھوں سے اُٹھاتا ہے

جو جاگوں ہوں تو کہتا ہے: ''کہیں اب سو بھی رہ ناداں''
جو سوتا ہوں تو چٹکی لے کے اک دل میں جگاتا ہے

کبھی ہوجائے ہے غائب نظر سے، بات کے کہتے
کبھی پھر سامنے ہوکر کھڑا، باتیں بناتا ہے

کبھی دکھلائے ہے پنڈے کا لطف اور گات کا عالم
کبھی نزدیک آ، بالوں کی اپنے بو سنگھاتا ہے

غرض اے مصحفی میں کیا کہوں شب تا سحر یوہیں
نہ اُس کو چین آتا ہے نہ مجھ کو چین آتا ہے

405

قاصد نویدِ وصل زبانی ہے یار کی — یا تو کہے ہے بات بنا اُس کے پیار کی
تقریب طرفہ ہے یہ ملاقات کے لیے — کم بخت آکے سیر تو کر لالہ زار کی
بس تو نے اپنے منھ سے جو پردہ اُٹھا دیا — حسرت نکل گئی دلِ اُمیدوار کی
اُٹھا، گیا فلک پہ، گرا، خاک میں ملا — آخر ہوئی یہ شکل ہمارے غبار کی
گر دیکھیے تو آئینۂ قد نما کی شکل — صورت میں بن رہا ہوں تمام انتظار کی
یہ اضطراب اُس کو دلا بے سبب نہیں — مرغِ قفس کو کچھ تو خبر ہے بہار کی
دلّی سے ہم جو نکلے تو آوارہ ہوگئے — صورت نہ دیکھی پھر کے، اس اُجڑے دیار کی

گو سرخی برطرف ہوئی، پردے ہوئے سفید — آنکھوں سے تہ سی نکلے ہے اب تک خمار کی
افسوس اک یہی ہے کہ یاروں سے بعد مرگ — تعمیر ہوسکی نہ ہمارے مزار کی
مجنوں اِدھر تو دیکھ کہ یہ آہوانِ دشت — تکتے ہیں راہ تیرے ہی محمل سوار کی
پہنچا نہ اک ستارہ بھی فریاد کو مری — میں نے شب فراق میں کتنی پکار کی
تو خاکِ راہ کو بھی نہ ٹھکرا کے چل دلا — شاید کہ خاک ہو یہ، کسی کے مزار کی
ساقی تو چل چمن میں، کہ پُر دل فریب ہے — آواز باغباں کی، صدا آبشار کی
آتا ہے جی میں دیدۂ انجم پہ پھینک دوں — اک مشتِ خاک لے کے تری رہ گذار کی
درِ یتیم اشک کو دکھلاؤں تو ابھی — شیخی ہو کرکری گہرِ آبدار کی
سینے میں میرے حشر بپا تھا تمام رات — کیا شوخیاں کہوں دلِ پُر اضطرار کی
سارے حصولِ زر کے جب اسباب جل گئے ق — ناچار ہم نے شاعری ہی اختیار کی
اس پر بھی دیکھتے ہیں تو ہم ساتھ ہے دلا — ہر اک سخن پہ کج روشی روزگار کی

کرتا ہوں دید گلشن گیتی کی مصحفی
مجھ کو تو آرزو ہے نہ گل کی نہ خار کی

406

رکھ کے ہم زانو پہ جس وقت کہ سر بیٹھ گئے — یہ سمجھ لیجو کہ ہمسایوں کے گھر بیٹھ گئے
مجلسِ غیر میں گذرے جو کبھو، تو ہٹ کر — وہ اُدھر بیٹھ گئے اور ہم اِدھر بیٹھ گئے
منھ پہ چڑھنے کا نہیں پھر کوئی اس محفل میں — ہو کے جس وقت کہ ہم سینہ سپر بیٹھ گئے
بس کہ گل برگ سی رکھتے تھے تنک اک سنگینی — رات پانی میں مرے لختِ جگر بیٹھ گئے
خبر ان منتظروں کی بھی تجھے پہنچی کچھ — جو سرِ کوچہ ترے دو دو پہر بیٹھ گئے
چرخ آبی نے کی اُن ساتھ یہاں تک خنکی — کہ بتاشے کی طرح اہلِ ہُنر بیٹھ گئے
ہم تو اس پر بھی خوشی[1] تھے، کہ جو آئے گا ہے ق — پیشِ درتم ہوئے اور ہم پسِ در بیٹھ گئے

1۔ خوشی بجائے خوش۔ آتش نے بھی کہا ہے: خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

سو تو وہ ربط بھی مطلق نہ رہا، کیا کہیے گھر میں تم جا کے میاں ایسے کدھر بیٹھ گئے

مصحفی، گر نہ دبے شان سے اُس کی تو بھلا
کیوں اُسے دیکھتے ہی شمس و قمر بیٹھ گئے

407

آنکھ لڑتے ہی یہ حالت ہم پہ کچھ طاری ہوئی جس سے گھر آتے ہی آتے زندگی بھاری ہوئی

گر نہ کرتے ہم وفا، تو ہوتے کیوں اتنے خراب جان کی دشمن ہماری یہ وفا داری ہوئی

گو کہ میں مارا گیا، اے شوخ تیرے ہاتھ سے بارے خوں ریزوں میں تیری تو نموداری ہوئی

دل کہیں کھویا، کہیں دی جان ناحق، عشق میں جو ہوئی سو ہم سے ایسی ہی زیاں کاری ہوئی

فائدہ کیا ہے جو کیجیے یاد اب وہ اختلاط شک دلوں میں آپڑے، جانوں میں بیزاری ہوئی

آخرِ عمر آہ، دامِ عشق میں ہم پھنس گئے وقتِ آزادی ہمیں حاصل گرفتاری ہوئی

در سے اپنے مصحفی اس نے ہمیں اُٹھوا دیا
آخر آخر عشق کی یہ ذلّت و خواری ہوئی

408

اس نے کتنوں کو مار اُتارا ہے تیغ کے گھاٹ پار اُتارا ہے

اشک نے میرے نخلِ مژگاں سے ثمرِ آب دار اُتارا ہے

نذر کرنے کو تیری، میں نے جنوں جامۂ تار تار اُتارا ہے

بیٹھ قاتل کہ اپنے ہاتھوں سے ہم نے سر لاکھ بار اُتارا ہے

چت چڑھا ہی رہے ہے پھر بھی وہ حسن جی سے ہم نے ہزار اُتارا ہے

ہم ہوئے ہیں گلے کا ہار وہیں اُس نے جب اپنا ہار اُتارا ہے

تیرے اقلیمِ حسن میں خط نے لشکرِ رنگ بار اُتارا ہے

مصحفی دل نہیں یہ سینے میں
یاں کوئی بے قرار اُتارا ہے

409

باز وے کوہ کن کی تلاشی زمین ہے
تیشے سے بے ستوں کے تراشی زمین ہے

صحرا میں جا کے دیکھ تو تو چاندنی کا لطف
ہے بادلے کا چرخ تو طاشی زمین ہے

پیدا کیا ہے بہرِ فراخی زمین کو
یا از برائے تنگ معاشی زمین ہے

کانٹوں پہ لوٹتے ہیں جہاں تیرے دردمند
سب واں کی وقفِ سینہ خراشی زمین ہے

گر بیٹھنے لگوں ہوں میں اس فرشِ خاک پر
کہتے ہیں یوں ادب سے حواشی "زمین ہے"

جاڑوں میں ہے یہ رنگ کہ اپنے لحاف کے
بوٹے جو مونگیا[1] ہیں تو ماشی[2] زمین ہے

سن اس نئی غزل کو مری، مجھ سے مصحفی
جاہل بھی خوش ہو کہتے ہیں: "خاشی[3] زمین ہے"

410

آئی پسند کوے بتاں کی زمیں مجھے
اے کاش بعدِ مرگ بھی رکھیں یہیں مجھے

چھوٹا ہوں ایک بار تو پھنس کر ابھی، یہ چشم
ڈرتا ہوں میں کہ پھر نہ پھنساوے کہیں مجھے

کل سیرِ باغ کو میں گیا تھا، سو کیا کہوں
کتنا کیا ہے خندۂ گل نے حزیں مجھے

مضمونِ یاس و معنیِ حسرت کو مجھ سے پوچھ
صحبت رہی ہے با دلِ اندوہ گیں مجھے

دن وہ ہی خوب تھے جو کیا تھا بہار میں
با ساکنانِ کنجِ قفس، ہم نشیں مجھے

تلوار میرے قتل کو مت لا کہ جوں چراغ
بے درد بس ہے جنبشِ یک آستیں مجھے

کھاتا ہے تاب شمع کا شعلہ جو باؤ سے
آتی ہے یادِ یار کی چینِ جبیں مجھے

اس گلستاں میں صحبتِ بلبل کے رشک نے
جانے دیا نہ سایۂ گل کے قریں مجھے

1۔ مونگیا = مونگ کا رنگ 2۔ ماشی = ماش (اڑد) کا رنگ

3۔ خاشی (خاصی) جہلاء کی زبان

411

کس چاؤ سے دل کا مرے ارمان نکل جائے　　سر قدموں پہ رکھتے ہی اگر جان نکل جائے
ہے جائے تعجب کہ خبر دل کو نہ ہو اور　　پہلو سے مرے تیر کا پیکان نکل جائے
اس کوچہ سے آوارہ ہوا یوں میں سفر کو　　جس طرح کوئی بے سروسامان نکل جائے
ہوئے نہ خبر قیس کو اس دشت میں ہے ہے　　اور ناقۂ لیلیٰ کئی میدان نکل جائے
خمیازہ نہ اِس طرح سے لے مجھ کو یہ ڈر ہے　　کہنی نہ تری اے بتِ نادان نکل جائے
جب تجھ سے پری جلوہ سے ہو چشم مقابل　　صحرا کو نہ کس طرح سے انسان نکل جائے

اُس کُو سے نکلنے کا نہیں مصحفی جیتا
خاک اُس کی مگر ہو کے پریشان نکل جائے

412

منھ سے ترے "مر بھی" جو مری جان نکل جائے　　مرتے ہوئے، جی کا مرے ارمان نکل جائے
دیکھے جو ترے جامۂ چسپاں کو چمن میں　　گل کر کے ابھی چاک گریبان نکل جائے
تیر اس کا مرے دل سے نہ نکلے تو نہ نکلے　　لیکن یہ کسو طرح سے پیکان نکل جائے
اے آئینہ، کر اُس کی تک اک چشم نمائی　　شاید کجیِ زلف پریشان نکل جائے
ہر چند کہ ہے ہوش رُبا صورتِ شیریں　　دیکھے تری صورت کو اگر، جان نکل جائے
مجنوں کو مَفَر عشق سے لیلیٰ کے کہاں ہے　　دیوانہ مگر سوے بیابان نکل جائے

کیا مصحفیِ خستہ کے طالع ہیں، صد افسوس
یوں ہاتھ سے اُس کے ترا دامان نکل جائے

413

کل اُٹھ گیا جو ہاتھ چھُڑا، میرے ہاتھ سے　　آیا ہوا شکار گیا میرے ہاتھ سے
مہندی کو اپنی دیکھ کے کہنے لگا وہ شوخ　　ہے ہے کسی کا خون ہوا میرے ہاتھ سے

دیتا تھا نامہ اس کو میں، نامے کے سہو میں　　دل لے گئی اُڑا کے صبا میرے ہاتھ سے
ظالم خدا کے واسطے بیٹھا تو رہ ذرا　　ہاتھ اپنے کو نہ کرتو جدا میرے ہاتھ سے
دیں اس نے گالیاں مجھے جس وقت، اُس گھڑی　　کچھ ہوسکا نہ غیر دعا میرے ہاتھ سے
تلواریں ترے ہاتھ سے کھائی ہیں، بھلا میں،　　ظالم کبھی تو پان تو کھا میرے ہاتھ سے
یا رب کبھی وہ دن ہو کہ خلوت میں وہ صنم　　کھلوائے اپنے بند قبا میرے ہاتھ سے
اس سنگ دل کو جا کے دکھاوے گا مصحفی
ٹوٹا ہوا جو شیشہ بنا میرے ہاتھ سے

414

نت اس بُتِ کافر کی ملاقات نئی ہے　　ہر وقت میں ہر آن میں یاں بات نئی ہے
پانی کی جگہ برسے ہے خوں آنکھوں سے میری　　سچ پوچھو جو مجھ سے تو یہ برسات نئی ہے
سو ٹکڑے تڑق[1] کر کے ہوا صبح کا سینہ　　میں تم سے نہ کہتا تھا کہ یہ گات نئی ہے
ہے شوق زبس اس کے تئیں معنیِ نو سے　　جب دیکھو طبیعت مری دن رات نئی ہے
اے مصحفی رک مت تو الگ رہنے سے اُس کے
کیوں، تجھ سے ابھی اُس کی ملاقات نئی ہے

415

کوچے میں اُس کے جو کوئی جی کھو کے جا سکے　　دل کی مرے خبر وہی جاں باز لا سکے
ہر چند گل ہو دستِ زلیخا سے شوخ تر　　دامن کو اُس کے ہاتھ تو اپنا لگا سکے
قُدرت یہ کس مصوّرِ جادُو رقم میں ہے　　یہ خال و خط، یہ چہرہ، یہ نقشہ بنا سکے
ہے اس کی آبِ تیغ میں اعجازِ عیسوی　　لاکھوں کو ایک دم میں جو چاہے جلا سکے
گر رنگ و بُو سے اپنے ہو ٹک اُس کو آگہی　　گل اپنے پیرہن میں نہ پھُولا سما سکے

1۔ تڑقنا = چٹخنا (عوامی)

مجھ سے تو شور آہ کا اخفا نہ ہو سکا — اے دل تو داغ غم کو چھپا، گر چھپا سکے
بُلبل اُڑے تو مجھ سے جب اِس گلستاں کے بیچ — نالے کی میرے طرز تو پہلے اُڑا سکے
آتا ہے سامنے سے وہ بنیے کا مصحفی
سودا ہے مفت ایسے میں گر جی چلا سکے

416

جس سے امیدِ وفا تھی بے وفائی اُس نے کی — آشنائی کر کے، پھر نا آشنائی اُس نے کی
ذوقِ فندق رنگنے کا جب تجاوز کر چکا — رفتہ رفتہ پور پور اپنی حنائی اُس نے کی
ہاتھ گر آوے تو میں شانے کے سو ٹکڑے کروں — پھر تری زلفوں میں، سنتا ہوں، رسائی اُس نے کی
بُت بنایا تھا خدا نے اُس کو، پر اِس پر بھی ہائے — کبریائی پر جو وہ آیا، خدائی اُس نے کی
جب کہا تھا ہم نے اُس کو: بیٹھ غیروں سے جدا — ہم سے اتنی بات پر یار و جدائی اُس نے کی
جب ہوا فرقت کے مارے حال مجنوں کا تباہ — کاسہ لے کر کوے لیلیٰ میں گدائی اُس نے کی
نالہ و فریاد سے امشب جو چُپ ہے مصحفی
دردِ دل کی کچھ نہ کچھ شاید دوائی اس نے کی

417

کچھ حیا آنکھوں میں ہے اس کی، تو کچھ پیار بھی ہے — کچھ تغافل ہے، تو کچھ لطف کا آثار بھی ہے
وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد — کہ اسی وعدے میں اک وعدۂ دیدار بھی ہے
یوں جو پھرتا ہے تو گلیوں میں پڑا، ہوتا خوار — دلِ بدبخت کوئی تیرا خریدار بھی ہے
ہے غضب، ایک تو کھائے ہیں تری تیغ کے زخم — تِس پہ اِس سر کو ہوائے گل و گلزار بھی ہے
شمع کی طرح سے حُسن اُس بتِ ہرجائی کا — رونقِ خانہ ہے اور رونقِ بازار بھی ہے
کفر اور دیں میں تغایر[1] نہیں، گر دیکھیے خوب — ساتھ تسبیح کے دانوں کے تو زُنّار بھی ہے
داغ اپنے، ہیں میں دونوں کو دکھانے اے دل — لالۂ زرد بھی اور نرگسِ بیمار بھی ہے

1۔ تغایر = مصحفی نے غیریت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اردو میں یہ لفظ غریب ہے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو ہم راہِ رقیب ساتھ خدمت کو تمھاری یہ گنہ گار بھی ہے

مصحفی کوے بتاں ہی میں تو چل رہ کہ میاں
واں ہوا ٹھنڈی ہے اور سایۂ دیوار بھی ہے

418

جب شبِ غم اشکِ سرخ اپنے کا یَم چڑھ جائے ہے
تا خمِ نیلِ فلک رنگِ بقم[1] چڑھ جائے ہے

جوش پر آتی ہے جس دم اُس کی سیلِ آبِ تیغ
قلزمِ بیداد و دریاے ستم چڑھ جائے ہے

یا وہ طاقت تھی کہ ہم جاتے تھے اُس تک دوڑ دوڑ
یا یہ حالت ہے کہ دم لینے میں دم چڑھ جائے ہے

مُنھ سے کف آنے لگیں ہیں یوں ترے بیمار کے
سانپ کے کاٹے ہوئے کو جیسے سَم چڑھ جائے ہے

قلعۂ گردوں کو جس دم جا لگے ہے فوجِ اشک
نالہ میرا دوش پر لے کے عَلَم چڑھ جائے ہے

یارو پا بلیاں[2] کہوں کیا اپنے طفلِ اشک کی
یہ تو جنتر[3] پر پلک کے ایک دم چڑھ جائے ہے

آگ دیتا ہوں میں نالے کی قلم کو جس گھڑی
تڑپھ[4] کر اوجِ فلک پر یہ قلم چڑھ جائے ہے

کیسی گھبراتی ہے لیلیٰ، راہِ صحرا بھول کر
نجد پر گر ناقہ اُس کا دو قدم چڑھ جائے ہے

1۔ بقم = قرمز (رنگ کا نام) 2۔ پابلیاں = پینترے، شعبدے 3۔ جنتر = نٹ کے تماشے کی رسی
4۔ تڑپھ کر = بہ سکون دوم باندھا ہے

مصحفی قائل ہوں میں معشوق کا تیرے، میاں
خوب رُو ایسا، کسی کی نظروں کم چڑھ جائے ہے

419

جب کبھی صید افگنی کو وہ صنم چڑھ جائے ہے
کوہ پر ایک ایک آہو کر کے رَم چڑھ جائے ہے

ضعف، اُس تک جاتے، ہم کو سو جگہ مانع ہوا
ہر قدم پر جوں دمے والے کا دم چڑھ جائے ہے

رات کالی ہجر کی، کالے [1] سے کم ہرگز نہیں
دیکھتے ہی جس کی صورت ہم کو سَم چڑھ جائے ہے

کردیے گریہ نے نرم اجزاے تن اپنے تمام
موسمِ باراں میں جوں کاغذ پہ نَم چڑھ جائے ہے

دل کے آئینے کی ہم لیتے ہیں تب ہے بے خبر
اس پہ جب دو دو وَجَب [2] یہ زنگِ غم چڑھ جائے ہے

جب ہم آغوشی کو ہاتھ اپنے اٹھاتا ہوں وہ شوخ
دوڑ کر کوٹھے پہ اپنے، بے ستم چڑھ جائے ہے

مار رکھتا ہے وہ اُس کو مصحفی اک تیر میں
شَست پر اُس کی جب آہوے حرم چڑھ جائے ہے

420

جب ترا ماتھا غضب سے اے صنم چڑھ جائے ہے
کہیے کچھ تو اور بھی، بَھوں پہ ستم چڑھ جائے ہے

پا نہیں سکتا وہ میرے رتبۂ پرواز کو
اُڑتے اُڑتے طائرِ سدرہ کا دم چڑھ جائے ہے

آہ پر لختِ جگر کی کیا کہوں دم بازیاں
ہر مُشعبد [3] بانس پر اس طرح کم چڑھ جائے ہے

وہ سپہ سالار ہے نالہ مرا، جو دم بہ دم
آسماں پر، لے کے فوجِ درد و غم چڑھ جائے ہے

1۔ کالے = ناگ 2۔ اصل میں 'فرق' ہے جو یہاں بے معنی ہے وَجَب = بالشت

3۔ مشعبد = نٹ، شعبدہ باز

سانپ کی سی لہر، جب گذرے ہے جی میں زُلفِ یار
اک پُھریری آکے مجھ کو اُس کا سَم چڑھ جائے ہے

جلد کر یوسف کا سودا اے زلیخا جلد کر
مول لیتے لیتے ایسے ہی رقَم[1] چڑھ جائے ہے

غیر کیا کیا کرتے ہیں گلیوں میں پھیرے مصحفی
اپنے ہتھّے گر کسی شب وہ صنم چڑھ جائے ہے

421

دیکھ تو ہم میں غمِ عشق نے کیا رکھا ہے
بے وفائی نے تری جی کو جلا رکھا ہے

تیرہ بختی کا اثر دیکھیو، اس نے ہے ہے
بالوں میں، چاند سے مکھڑے کو چھپا رکھا ہے

عید کے دن بھی تو، ہم سے نہ ملا تو ہم نے
زہر بازار سے آگو[2] ہی منگا رکھا ہے

میں تو ان لوگوں سے بھاگے تھا، ولے کیا کیجیے
اس کی باتوں نے مرے دل کو لُبھا رکھا ہے

جس شب آیا نہیں تو دل کی تسلّی کے لیے
لے کے خنجر کو میں پہلو میں سُلا رکھا ہے

پھاڑ کر اپنے گریبان کو ہم نے تجھ بن
آکے تو دیکھے، تو اک سانگ بنا رکھا ہے

جب فسوں سازی پہ آئے ہیں وہ لعلِ شیریں
راہ جاتوں کو بھی باتوں میں لگا رکھا ہے

قفس اور دام تو کچھ مانعِ پرواز نہ تھا
ہم کو صیاد کی اُلفت نے بٹھا رکھا ہے

کس کا وعدہ ہے میاں مصحفی تم سے، یہ کہو
آج دروازے کو کیوں تم نے کُھلا رکھا ہے

422

پیری میں بھی ہم الفتِ طفلاں سے نہ چھوٹے
لکھ پڑھ چکے، تس پر بھی دبستاں سے نہ چھوٹے

پہلی مسی تو نے تو لگائی ہے، مزا ہو
گر رنگ مسی کا ترے دنداں سے نہ چھوٹے

1۔ رقم بمعنی قیمت (روزمرّہ)   2۔ آگو بجائے آگے (عوامی)

ہر ایک نے کھینچا ہمیں اپنی ہی طرف کو ہم کشمکشِ گبر و مسلماں سے نہ چھوٹے
ہر چند کہ دھویا بہت اِس دیدۂ تر نے پُرخون کے داغ اپنے گریباں سے نہ چھوٹے
ناداں نہ گرہ زلف کی وا کر، کہ غضب ہے یہ سانپ لپٹ کر جو زنخداں سے نہ چھوٹے
کیا ہم سے اسیروں کو خوشی عید کے دن کی زندانیِ الفت کبھی زنداں سے نہ چھوٹے
دل چھوٹے تو چھوٹے، ترے پیکاں سے ہمارا پرخون کی سرخی ترے پیکاں سے نہ چھوٹے
کیا جانے کس الجھیڑے[1] میں وہ پڑ گئے ہوں گے جو پھنس کے تری زلفِ پریشاں سے نہ چھوٹے
کب سیرِ چمن کو نہ گیا یار تو، کس روز فوّارۂ خوں، دیدۂ گریاں سے نہ چھوٹے
کیا جانیے کیا گذری گرفتاری میں اُن پر جو دامِ بلائے شبِ ہجراں سے نہ چھوٹے
داماں کو تو اپنے نہ جھٹک ہاتھ سے میرے یہ ہاتھ وہ ہے جو کبھی داماں سے نہ چھوٹے
کیا دل کے کبوتر کا کروں ذکر میں ظالم شہباز ترے چنگلِ مژگاں سے نہ چھوٹے

اے مصحفی ہوتا ہے بُرا عشق کا لپکا
مشکل ہے یہ عادت اگر انساں سے نہ چھوٹے

423

نہ دوستی نہ محبت نہ دلبری دیکھی جو کچھ کہ دیکھی میں اس سے، ستم گری دیکھی
کٹاریاں سی لگیں، میرے اُس گھڑی جس وقت میں اُس کے پانْو میں شلوار خنجری دیکھی
اسی سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں کہ سالہا تری زلفوں کی ابتری دیکھی
کیا ہے دعویِ ہم چشمی اُس سے نرگس نے کنیزِ شوخ کی تم نے برابری دیکھی
اُٹھا میں سوتے سے یوں صبح دم سراسیمہ کسو نے جیسے کہ شب خواب میں پری دیکھی
لیا میں بوسہ بزور اُس سپاہی زادے کا عزیزو اب بھی مری کچھ دلاوری دیکھی
تمام رات میں تڑپا کیا گلی میں تری کسو نے پر نہ مری تیرہ اختری دیکھی

1۔ الجھیڑا = الجھاؤ (عوامی)

رہے جہان میں جب تک کہ ہم، خراب رہے مدد فلک کی نہ طالع کی یاوری دیکھی
ہوا جو مصحفی گھربار تج کے گوشہ نشیں
اِسی میں اس نے مگر اپنی بہتری دیکھی

424

نالے مرے ہرچند اثر کچھ نہیں رکھتے لیکن جو سنو تم، تو ضرر کچھ نہیں رکھتے
ہوتا ہے جو ہم پاس، اُٹھا دیتے ہیں وہ ہیں ہم خانہ برانداز تو دَھر کچھ نہیں رکھتے
ملتا ہے جو شام اُس کو سمجھتے ہیں غنیمت آزادہ دلاں فکرِ سحر کچھ نہیں رکھتے
ڈھونڈھو نہ کوئی ہم سے غرض غیرِ تواضع ہم بید ہیں، گل اور ثمر کچھ نہیں رکھتے
ہوجاتے ہیں اُس کی صفِ مژگاں سے مقابل ہرچند کہ ہم جان و جگر کچھ نہیں رکھتے
کیا دوڑیں ہیں منہ پر مرے، کافر ترے دیدے ہے ہے صفِ مژگاں سے خطر کچھ نہیں رکھتے
ایسے ہیں زخود رفتہ کہ اب یاد میں اُس کی ہم اچھے بُرے کی بھی خبر کچھ نہیں رکھتے
کہہ دیتے ہو تم غیر سے گر باتیں ہماری جاؤ جی ہم ان باتوں کا ڈر کچھ نہیں رکھتے
کس طرح سے منزل کے تئیں پہنچیں گے یارب پاس اپنے تو ہم زادِ سفر کچھ نہیں رکھتے
عشق اُن کو ہے جو میری طرح حسنِ بتاں سے جز دید کے، منظورِ نظر کچھ نہیں رکھتے
نرگس کی طرح اِس چمنِ دہر میں ساقی ہم اور بہ جُز ساغرِ زر کچھ نہیں رکھتے
اتنا تو حقارت سے میاں ہم کو نہ دیکھو اک دل تو ہے ہم پاس، اگر کچھ نہیں رکھتے
اے مصحفی ہم اب بھی ہیں دشمن پہ تو بھاری
ہر چند کہ شمشیر و سپر کچھ نہیں رکھتے

425

جس گھڑی یاد وہ زلف و کمر آجاتی ہے جی میں سودے کی سی کچھ اک لہر آجاتی ہے
رتبۂ آہ نہیں داغِ جگر کو، لیکن گاہ گاہ اِس سے بھی بوے اثر آجاتی ہے

گرچہ بیزار ہے وہ مجھ سے، پہ بیٹھے بیٹھے کچھ ہنسی اُس کو مرے نام پر آجاتی ہے
یاد کر اُن دُرِ دنداں کو جو روتا ہوں کبھو روبرو آنکھوں کے سلکِ گہر آجاتی ہے
اُس کا منھ دیکھے ہے صیاد قفس کے نزدیک گر کوئی بلبلِ بے بال و پر آجاتی ہے
کس طرف جاؤں کہ افعیٰ کی طرح زلف سیاہ خواب میں آکے مجھے شب کو ڈرا جاتی ہے
گرچہ وہ جست نہیں اشک میں میرے تو بھی بوند اک آدھ برنگِ شرر آجاتی ہے
اِس قدر محو خور و خواب نہ رہ اے غافل باخبر رہ، کہ اجل بے خبر آجاتی ہے
مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ جاتا ہوں
طبع اِس وقت مدد پر اگر آجاتی ہے

426

تازہ ترکیب کوئی جب نظر آجاتی ہے آفت اک تازہ مری جان پر آجاتی ہے
گرہِ زلف کو جس وقت کہ دیتا ہے وہ کھول سانپ کی طرح وہیں تا کمر آجاتی ہے
کیا اسیرانِ قفس میں بھی خوشی ہوتی ہے جب کبھی باغ سے بادِ سحر آجاتی ہے
جنبشِ زلف کا مکھڑے پہ کہوں کیا عالم گہ اُدھر جاتی ہے گاہے اِدھر آجاتی ہے
گھر سے نکلوں ہوں میں جب کر کے تصور اُس کا اُس کی تصویر وہیں پیشِ در آجاتی ہے
کس کی تصویر ہے یہ، کوئی اِسے سمجھاؤ سامنے بال کھلے بے خطر آجاتی ہے
کر دکھاتے ہیں ابھی خاک کو اکسیر کے رنگ اِس طرف اپنی طبیعت اگر آجاتی ہے
مصحفی واسطے قاصد کے نہ اتنا گھبرا
آج کل اس کی گلی سے خبر آجاتی ہے

427

خط کھینچے تو نے مجھ پر، تحریر کیا نکالی زخموں سے خوں میں رنگا تصویر کیا نکالی
عاشق تو کیوں ہوا تھا، تقصیر کیا نکالی خنجر سے سر کو کاٹا، تعزیر کیا نکالی

وہ قتل کو جو میرے آیا تو خلق بولی　　اِس ناتواں پہ تم نے شمشیر کیا نکالی
دے چھوڑ کام اپنے تقدیر پر تو سارے　　کم طالعی نے میری تدبیر کیا نکالی
اُلٹا جگر کو میرے یہ تو لگا جلانے　　نالے نے ان دنوں میں تاثیر کیا نکالی
بل دے کے لیفِ خُرما[1] مجنوں کے پانو باندھے　　سستی نے طالعوں کی زنجیر کیا نکالی

گلیوں میں مصحفی کو دیوانہ کر پھرایا
اس عشق فتنہ گر نے تشہیر کیا نکالی

428

رونق، بہار، حسن تمھارا، ہمیں سے ہے　　جو کچھ کہ ہے بناؤ یہ سارا ہمیں سے ہے
آتی ہے دوڑی خلق ہمارے ہی رستے پر　　عالم کا اُس گلی میں گذارا ہمیں سے ہے
گر ہم نہ ہوں تو کون کرے سیرِ کائنات　　دو دم کی زندگی سے نظارا ہمیں سے ہے
آغوشِ مدعی میں تو رہتا ہے ساری رات　　اے بحرِ حسن تجھ کو کنارا ہمیں سے ہے
دیتا نہیں وہ اُٹھنے کی تکلیف غیر کو　　نظروں میں ہر گھڑی یہ اشارا ہمیں سے ہے
ہم کیوں نہ اُس کی گردش رو[2] کا کریں گلا　　برگشتہ اِن دنوں یہ ستارا ہمیں سے ہے

شب مصحفی کی شان میں کہتا تھا یوں وہ شوخ
برسر[3] کی بازی آج وہ ہارا ہمیں سے ہے

429

ملنا ترا اغیار سے منظور کسے ہے　　پر تجھ سے کہے اتنا، یہ مقدور کسے ہے
وہ جی میں یہ نازاں، کہ مرا رعب تو دیکھو　　میں خوش، کہ خیالِ نگہِ دور کسے ہے
پُوچھا جو مرا قصہ کسی نے تو وہ ہنس کر　　یوں کہنے لگا: یاد یہ مذکور کسے ہے

1۔ لیفِ خُرما = کھجور کے تنے یا پتوں کے ریشے، بافت　2۔ گردش رو کا = منھ پھیرنے کا
3۔ برسر = چوسر کی اصطلاح ہے

کیا حور کا مذکور تو کرتا ہے ہمیشہ　　چل دور ہو زاہد، ہوسِ حور کسے ہے
گو نالہ کرے شب کو پڑا، گو تو کرا ہے　　پرواہ[1] تری اے دل رنجور کسے ہے
تو مائلِ عشاق کُشی ہے تو یہاں بھی　　جینے کی طمع اے بتِ مغرور کسے ہے
موسیٰ سے ہزاروں ہیں یہاں مصحفی لیکن
سودائے تجلی کدۂ طور کسے ہے

430

صورت عرق میں ہے یہ رخِ پُر حجاب کی　　بھیگی ہو جیسے اوس میں پتّی گلاب کی
مَہ کس شمار میں ہے کہ ایسے جلال پر　　جلتی ہے تیرے حسن سے آنکھ آفتاب کی
ایسی جھمک ہے حسن میں تیرے کہ دور سے　　آنکھوں میں آسماوے ہے سرخی نقاب کی
یہ کیا غضب ہے ہائے کہ بجلی کی کوند میں　　نکلے ہے ایک شکل تمھارے عتاب کی
جاتے ہی یہ تو تیرے میاں لُٹ گُھسٹ گیا[2]　　کیا شکل ہوگئی دلِ خانہ خراب کی
اے آہِ گرم، دل کو تو پہنچا نہ ہووے داغ　　سینے سے آج بو مجھے آئی کباب کی
آئی پسند مجھ کو بہت، میں نے مصحفی
دیوان سے ترے یہ غزل انتخاب کی

431

یہ نہ سمجھو کہ سحر چاک گریباں ہووے　　سو قباحت ہے، جو وہ زلف پریشاں ہووے
کاش آزاد کرے مجھ کو قفس سے صیاد　　خاص جب موسمِ گل گشتِ گلستاں ہووے
بے طرح برق اکڑتی ہے دموں پر اپنے　　کہیں ایسے میں تری تیغ نہ عریاں ہووے
حسن ایسا ہی دیا ہے تجھے سبحان اللہ　　آئینہ کیوں نہ تری شکل کا حیراں ہووے
اُس دمِ تیغ پہ ہیں یوں مرے خوں کے قطرے　　جیسے دریا میں لبِ آب چراغاں ہووے

1۔ پَرواہ بجائے پَروا (عوامی)　2۔ لُٹ گُھسٹ گیا = تباہ و برباد ہوگیا (روزمرہ)

کاش وہ دن تو دکھاوے مجھے اے جوشِ جنوں کہ میں آوارہ ہوں، اور کوہ و بیاباں ہووے
رنگِ فندق نے ترے خون کیا ہے میرا چاہیے تُو بھی اب انگشت بدنداں ہووے
اے کماں دار میں ہوں صیدِ زبوں میرے پر تیر وہ پھینکیو جو بے پَر و پیکاں ہووے
ایسے جینے سے تو جی اپنا بہ تنگ آیا ہے کہیں یہ محنتِ دشوار بھی آساں ہووے
ہے صنم رخ سے ترے نورِ تجلّی پیدا دیکھے کافر جو تری شکل مسلماں ہووے
جان کھایا ہے مرا عشق کی بے تابی نے یا الٰہی نہ کوئی دشمنِ انساں ہووے
خوں کی کیا قدر ہے میری، جو میں قرباں کروں رنگِ گل رنگِ کفک پر ترے قرباں ہووے
جرسِ قافلہ کہتا ہے کہ اب میرے سوا کوئی اِس قافلے میں اور نہ نالاں ہووے
موج مارے ہے مرا خوں ترے کوچے میں ہنوز تا کسی طرح سے تیرا زہِ داماں ہووے
ہمّت اپنی ہے کہیں ہمّتِ حاتم سے بڑی بخش دیجیے ابھی گر ملکِ سلیماں ہووے

مصحفی اُس کی گلی میں تو بہت جاتا ہے
میں یہ ڈرتا ہوں کہ کچھ تجھ پہ نہ بہتاں ہووے

432

لباسِ سرخ میں کافر بھبھوکا بن کے آیا ہے کسو کا گھر جلاوے گا جو لُوکا[1] بن کے آیا ہے
شبیہِ مہر و مہ کو تہ کیا ہے پیرِ گردوں نے ورق جب اس کی تصویرِ دو رو کا بن کے آیا ہے
مقابل آج ہونے دو ہمیں کو اُس کے اے یارو کہ تیغا اس گھڑی اُس جنگجو کا بن کے آیا ہے
ورق زانو پہ رکھے اب تلک حیران ہے مانی زبس نقشا درست اُس ماہ رو کا بن کے آیا ہے

خدا کے واسطے مت مصحفی کو اب تو کچھ کہنا
ترے آگے وہ پُتلا آرزو کا بن کے آیا ہے

433

یار کا سیبِ زنخداں تو مرے ہاتھ میں ہے ضعفِ دل اپنے کا درماں تو مرے ہاتھ میں ہے

1۔ لُوکا = شعلہ (روزمرہ)

کون کہتا ہے کہ میں اُس کو کیا سو ٹکڑے
اب تلک میرا گریباں تو مرے ہاتھ میں ہے

جوں میں چاہا کہ چھٹوں، جلدی سے بولا شاہد
دامنِ زلفِ پریشاں تو مرے ہاتھ میں ہے

باندھ کر مہندی کی پٹی، وہ کہے ہے سب سے
ہاں دلِ خستہ دروناں تو مرے ہاتھ میں ہے

دسترس اُس کے گریباں پہ نہیں ہے تو نہ ہو
یار کا گوشۂ داماں تو مرے ہاتھ میں ہے

اِس کا کیا ڈر ہے جو میں چاہِ زنخداں میں گرا
رسَنِ گیسوے جاناں تو مرے ہاتھ میں ہے

دوستو طعنہ نہ دو مجھ کو تہی دستی کا
کچھ نہیں اور، گریباں تو مرے ہاتھ میں ہے

طرف ابرو کے میں دیکھوں ہوں، تو کہتی ہے مژہ
ناز کا خنجرِ برّاں تو مرے ہاتھ میں ہے

آستیں تو نے چھڑا لی تو ہوا کیا قاتل
یہ ترا دامنِ افشاں تو مرے ہاتھ میں ہے

ہاتھ اپنا دلِ ناداں پہ دھرے رہتا ہوں
شکر ہے یہ دلِ نالاں تو مرے ہاتھ میں ہے

مصحفی کیونکے عدو دعویِ تسخیر کرے
خاتمِ دستِ سلیماں تو مرے ہاتھ میں ہے

434

سو مفر ہیں اُس کے، گر کوئی بلا پیچھے پڑے
کس طرف جاوے جو بندے کے خدا پیچھے پڑے

ہم نشیں بہرِ خدا کاکل ہی کا کر اُس کی ذکر
تیری باتوں سے مرا دل تو ذرا پیچھے پڑے

بال ان زلفوں کے عارض کے ہوئے جی کے وبال
آشنا کے جیسے کوئی آشنا پیچھے پڑے

بسکہ وہ کاندھے پہ ڈالے ان کو پھرتا ہے مدام
ان دنوں رہتے ہیں وہ بندِ قبا پیچھے پڑے

میں کفِ افسوس ملتا ہوں اِسی غم سے کہ ہائے
نازنیں تجھ سے کے، یوں جعد دوتا پیچھے پڑے

تم سے میں پوچھوں ہوں وہ پھر بھاگ کے جاوے کہاں
دوستو جس کے فلک کا اژدہا پیچھے پڑے

جعد سے اپنی ہو جس کو بے کلی شام و سحر
کیا غضب لاوے اگر آہِ رسا پیچھے پڑے

جو سبک رو عشق کی راہوں میں ہیں اُن کا سراغ
خاک بھی پاوے نہ گو بادِ صبا پیچھے پڑے

اُس نے پھر کر بھی نہ دیکھا سایہ ساں اے مصحفی
اس بتِ کافر کے ہم تو بارہا پیچھے پڑے

435

ہاتھ میں لے کے وہ جب تیغِ دوسر نکلے ہے
زخمی اک آدھ ہر اک کوچے میں کر نکلے ہے

زلف سر کی تو ہوا جلوہ نمایوں عارض
جس طرح ابر کے لکّے [1] سے قمر نکلے ہے

نہیں معلوم بلا کیا ہے ترے کوچے میں
جو کہ اِس کوچے سے نکلے ہے سو مر نکلے ہے

چاکِ پیراہنِ ساقی پہ پڑھوں کیوں نہ درود
اُس کے سینے سے تو اک لطفِ سحر نکلے ہے

کوچۂ عشق میں جاتے ہیں چلے پر ہم کو
نہیں معلوم کہ یہ کوچہ کدھر نکلے ہے

کیا زری پوش ہی یاں دفن ہوئے تھے سارے
اب تلک خاک سے دہلی کی جو زر نکلے ہے

کون سے گل کا تو عاشق ہے بتا اے بُلبل
تیرے نالے سے جو اک بوے اثر نکلے ہے

سینہ مجروح ہے کس خنجرِ مژگاں کا مرا
ہر دم آنکھوں سے جو کٹ کٹ کے جگر نکلے ہے

جام بھر بھر کے پیاپے تو مجھے دے ساقی
ایک پیالے سے کوئی دل کا کدر [2] نکلے ہے

دیکھ ہوتا ہے اُسے خطِ شعاعی بھی خجل
سر پہ جب طرۂ زرتار وہ دھر نکلے ہے

ابرِ تر نے تو کیا کوہ و بیاباں سیراب
کام کچھ تم سے بھی اے دیدۂ تر نکلے ہے

سوزشِ سینہ کی تاثیر نہ پوچھ اے ہم دم
سنگِ تربت سے مرے اب بھی شرر نکلے ہے

ہمسری اشک سے میرے وہ کرے، کہہ تو صدف
تجھ سے کوئی کبھی ایسا بھی گہر نکلے ہے

مصحفی اب کی اُٹھا لیویں گے ہم سر پہ پہاڑ
ہاتھ پتھر تلے سیں اپنا اگر نکلے ہے

436

صبح کی شام ہوئی، شام کی پھر رات ہوئی
یہی وعدے ہیں تو کہہ اُس کی ملاقات ہوئی

صبح نے حسن سے سینے کے، گریباں پھاڑا
چاندنی دیکھ کے اس رخ کی صفامات ہوئی

یار آیا تو کیا پیشکش اس کی دل و دیں
غیر اس کے تو نہ کچھ ہم سے مدارت ہوئی

1۔ لکّہ = بادل کا ٹکڑا 2۔ کدر = میل کچیل

پھر لگے چھیڑ کے تم گالیاں دینے صاحب بارے پھر آپ کی بندے پہ عنایات ہوئی
متصل دیدۂ گریاں کے وہ ساون برسے غرض اس سال تو کیا خوب ہی برسات ہوئی
مصحفی کے تئیں اب کچھ نہ کہو جانے دو ق جب ملا اُس سے یہی حرف و حکایات ہوئی
دوستو فائدہ کرتی ہے نصیحت کب اُسے گالیاں کھانا ہی جس شخص کی اوقات ہوئی

437

گر چشمِ تر سے ہم نے ٹک آستیں اُٹھائی تو دل نے نالہ کر کے سر پر زمیں اُٹھائی
محفل کے بیچ ناگہ آیا جو ذکر میرا اُس جنگجو نے ووہیں شمشیرِ کیں اُٹھائی
اے دیو بے حمیت ہوتا ہے کیوں تو منکر انگشترِ سلیماں تو نے نہیں اُٹھائی؟
پہنچے میں موچ اُس کے، کہتے ہیں آگئی ہے کم بخت نے صراحی مے کی کہیں اُٹھائی
کل چیخیں مار رویا اتنا یہ دل، کہ اس نے مجلس تمام سر پر اے ہم نشیں اُٹھائی
نقشِ جبیں ہمارا اُس در پہ رہ گیا گو جوں مُہر سجدہ کر کے ہم نے جبیں اُٹھائی

اے مصحفی نہ ہم نے رونے سے پائی فرصت
آنکھوں پہ ہاتھ رکھے، گر آستیں اُٹھائی

438

شرم آتی ہے اب اُٹھ کریاں سے کیا گھر جایئے آستاں پر اُس کے بیٹھے بیٹھے ہی مر جایئے
ہم تو کب اس بات سے راضی، ہیں پر تم نے میاں دل میں جانے کی ہی ٹھہرائی، تو بہتر جایئے
اشتیاق اُس کی گلی کا دل کو کرتا ہے کباب گر بہم ہوں بال و پر اپنے، تو اُڑ کر جایئے
وہ تو آتا ہی نہیں اب، کب تلک گذری کے بیچ بیچنے کو ہاتھ میں لے کر کبوتر جایئے
آیئے کر کر کے دل، سخت اپنا اُس کوچے سے ہائے کیا قیامت ہے کہ پھر ہو، ووہیں مضطر جایئے
تا کہ بعد از مرگ ہووے وہ مرا لوحِ مزار اک ذرا چھاتی پہ میری پانو تو دھر جایئے

مصحفی یہ بحر معنی خیز آتی ہے نظر
اک غزل تو اور بھی اس میں رقم کر جایئے

439

جی میں آتا ہے مرے، گر اُس کے در پر جائیے — سر پٹکیے یاں تلک اپنا، کہ بس مر جائیے
ڈر سے جاسوسوں کے، مجھ کو سوچ رہتا ہے یہی — کس طرح جا ملیے اُس سے، آہ کیوں کر جائیے
بے قراری کا بُرا ہو، کب تلک راتوں کو ہائے — کھولیے دروازہ ہر دم اُٹھ کے باہر جائیے
اُس کے ملنے کو گر آتا ہے معزز سا کوئی — مجھ سے کہتا ہے کہ اس وقت آپ تو گھر جائیے
کاش یہ خجلت نہ ہوتی، اُس گلی میں کب تلک — سر جھکائے آیئے، با دیدۂ تر جائیے
گوشہ گیری ہی بھلی ہے، کیا مناسب ہے دلا — بزمِ شاہاں میں بہ ایں احوالِ ابتر جائیے
آپ کا بس بس، بہت میں نے کیا اب تک ادب — ق — کھینچیے ہر دم میاں صاحب نہ خنجر، جائیے
اِس قدر اچھا نہیں کچھ خانہ جنگی کا گھمنڈ — بس بہت شیخی نہ کیجیے، بندہ پرور جائیے

اضطرابِ دل سے میں تو مصحفی گھبرا گیا
یار ملتا ہی نہیں، کیا کیجیے کیدھر جائیے

440

نہ اس رونے سے آفت دیدۂ گریاں پر آئی ہے — یہی رونا ہے تو دیکھو گے اک دن جاں پہ آئی ہے
نہیں زلفِ سیہ رخسار سے اُس کے جدا ہوتی — عجب کم بخت بدلی اِس مہِ تاباں پہ آئی ہے
صدف میں یہ صفا موتی نے کب پائی تعالی اللہ — صفا کچھ اور ہی اس کے دُرِ دنداں پہ آئی ہے
کوئی اتنا تو کہہ دے جا کے زنداں بانِ یوسف سے — زلیخا پیٹتی سر کو درِ زنداں پہ آئی ہے
ہوا ہے گر کے دل مجروح چاہِ عشقِ خوباں میں — شکست اس طرح سے اِس رستمِ دستاں پہ آئی ہے
جب اس کی انگلیاں فندق بندھی کر یاد رویا ہوں — لہو کی بوند میرے ہر سرِ مژگاں پہ آئی ہے
یہ تیرِ غمزہ کس کے خون میں بوندی ہوا سچ کہہ — کہ سرخی زور ہی اِس کے پیر و پیکاں پہ آئی ہے
سنی ہے جھوٹ سچ بھی میرے مرنے کی تو اُس ساعت — بشاشت اور ہی کچھ اُس گلِ خنداں پہ آئی ہے
دریشہ سے کیا ہے منع گر صاحب کمالوں کو — اُلٹ کر چوبِ درباں بھی سرِ درباں پہ آئی ہے

غزل اک اور بھی اے مصحفی میں کہہ سناتا ہوں
طبیعت ان دنوں پھر کچھ ذرا جولاں[1] پہ آئی ہے

441

بہار موسم گل اب کے پھر طغیاں پہ آئی ہے
پھر ان ہاتھوں سے آفت جیب اور داماں پہ آئی ہے

میں کر کے یاد وہ دستِ حنائی اتنا روتا ہوں
کہ روتے روتے لالی دیدۂ گریاں پہ آئی ہے

قرینِ زلف یوں آویزۂ لعل اُس کے ہیں گویا
کلی لالے کی جھک کر شاخِ نافرماں پہ آئی ہے

پڑا پہلو میں تیرے رات دن فریاد کرتا ہے
نہیں معلوم کیا چوٹ اِس دلِ نالاں پہ آئی ہے

ذرا تو بھی تو عالم دیکھ، اپنے پان کھانے کا
عجب سرخی میاں تیرے لب و دنداں پہ آئی ہے

جو تیرا دَورِ دامن دیکھتا ہے وہ یہ کہتا ہے
اسی دامن سے گردش، گردشِ دوراں پہ آئی ہے

شب ہجراں سیاہ اتنی نہ تھی شاید کہ ان روزوں
سیاہی بخت کی میرے، شب ہجراں پہ آئی ہے

لبوں پر اُس کے مسّی کی دھڑی کا رنگ تو دیکھو
عجب کالی گھٹا اس چشمۂ حیواں پہ آئی ہے

بہت بے طرح چمکے ہے تمامی کی سنجاف اس کی
یہ بجلی دیکھیں کس کس کے سروساماں پہ آئی ہے

جدھر دیکھو اُدھر خوش قامتوں کا فتنہ برپا ہے
قیامت ایسی ہی اِس شہرِ ہندوستاں پہ آئی ہے

گرفتارِ مصیبت جس قدر اے مصحفی میں ہوں
مصیبت اِس قدر دنیا میں کس انساں پہ آئی ہے

442

یاد اُس کو دیدہ بازی کے ہیں فن نئے نئے
نت ہر طرف کو نکلے ہیں روزن نئے نئے

گذرا میں اُس گلی سے، تو آئے مجھے نظر
کتنے اسیر، طوق بگردن نئے نئے

تجھ سے رفو نہ ہووے گا زخمِ دل اے مسیح
لاتا ہے کیوں تو رشتہ و سوزن نئے نئے

مسّی کی اُن لبوں کی دھڑی یاد آئی ہے
پتّے نکالتی ہے جو سوسن نئے نئے

1۔ جَولاں بجائے جولانی باندھا ہے

آنکھوں کو موند لے تو، کہ آویں تجھے نظر | آئینۂ خیال میں گلشن نئے نئے
یاروں[1] سے پیش لولیِ دنیا نہ لے گئی | از بسکہ ہم کو یاد تھے آسن نئے نئے
دیوانہ کیوں نہ ہوں میں کہ ہر روز وہ پری | نقشے مجھے دکھائے ہے بن ٹھن نئے نئے
آتا ہے اب یہ جی میں کہ ایجاد کیجیے | ماتم میں دل کے نالہ و شیون نئے نئے

سب صرفِ چاکِ جیب ہوئے، تھے جو مصحفی
بُغچے[2] میں طفلِ غنچہ کے دامن نئے نئے

443

خط نیا، خال نیا، زلف کی تحریر نئی | اِن دنوں مجھ کو نظر آتی ہے تصویر نئی
کردیا اور خفا ملنے سے میرے اُس کو | دیکھی اے آہِ سحر تجھ میں یہ تاثیر نئی
پہلے مجھ پر ہی لگایا اُسے ہنستے ہنستے | گر کبھی اُس نے خریدی کوئی شمشیر نئی
بات کو کس کی میں باور کروں اِس محفل سے | جو کوئی آوے ہے کرتا ہے وہ تقریر نئی
کس سے یہ ٹھوکریں سیکھا ہے، خدارا سچ کہہ | ہے تری چال تو کچھ اے بتِ بے پیر نئی
خانۂ دل کے تو نقشے پہ ذرا غور تو کر | دستِ صانع نے بنائی ہے یہ تعمیر نئی

مصحفی شب میں لیا اُس کے کفک کا بوسہ
جائے خوں ہے کہ ہوئی مجھ سے یہ تقصیر نئی

444

کاجل آنکھوں میں نہ اتنا بھی لگایا کیجے | تیرہ روزی مجھے ان کی نہ دکھایا کیجے
منھ چھپاؤ نہ چھپاؤ نہیں اس کا کچھ ڈر | لیک سینے کو دوپٹے سے چھپایا کیجے
جی میں آتا ہے کہ اُس (در پہ) تماشے کے لیے | پرُزے کر کر کے گریبان اڑایا کیجے

1۔ یاروں سے = مراد ہم سے (روزمرّہ) 2۔ بُغچہ (عوامی تلفظ ہے) اصل میں بُقچہ ہے جو بستے یا پوٹلی کو کہتے ہیں جس میں سامان باندھ کر رکھا جاتا ہے۔

دیکھنے والوں پہ آجاتی ہے بے ہوشی سی منھ سے یکبارگی پردا نہ اُٹھایا کیجے
قابل اس لطف کے کیا ہم نہیں، غیروں کے تئیں عطر مل مل کے نہ ہاتھوں کو سونگھایا کیجے
وے جو مارے ہوئے ہیں طرزِ تغافل کے، انھیں کبھی چتون کی ادا بھی تو دکھایا کیجے
کوئی کہتا تھا کہ اِن روزوں وہ بیمار ہے سخت ق دمبدم اُس کی خبر لینے کو جایا کیجے

ہو چکا مصحفیِ خستہ کا سو کام تمام
آپ اب بیٹھے ہوئے باتیں بنایا کیجے

445

بہ حالِ نزع ہوں میں، دے مجھے شمشیر سے پانی نہیں رکھتے دریغ اِس وقت میں نخچیر سے پانی
گرفتاری پہ میری بسکہ آہن گریہ کرتا ہے رواں ہوتا ہے چشمِ حلقۂ زنجیر سے پانی
اگر بیت الصنم میں پردہ تو رُخ سے اُٹھا دیوے بہے جوں چشمِ مردم، دیدۂ تصویر سے پانی
مزاجِ پیر سے سردی کا کھونا سخت مشکل ہے ملے پر پھر جدا ہوتا ہے کوئی شیر سے پانی
جوں ہی لکھنے لگا کاغذ پہ میں مضمون گریہ کا ٹپکنے ہی لگا ماہیِ کاغذ گیر سے پانی
تجھے پانی پلاتے غیر کو شب خواب میں دیکھا دل اپنا تو ہوا اِس خواب کی تعبیر سے پانی
یوں آنسو چاکِ دل سے آتے ہیں پھر پھر کے آنکھوں میں خیابانوں میں آوے جیسے اک تدبیر سے پانی
وہ اپنا تیر خوں آلودہ جب پانی سے دھوتا ہے ٹپکتا ہے شہابی ہو کے اُس کے تیر سے پانی
دلِ بگداختہ یوں چھن گیا غربالِ سینہ سے بآسانی نکل جاتا ہے جوں کفگیر سے پانی
گلستانِ شہادت تازہ و تر کیوں نہ ہو جس میں رواں ہو آبشارِ چشمۂ شمشیر سے پانی

پڑا ہے مصحفی یاں مُہرۂ تدبیر ششدر میں
بہت دشوار ہے بازی ہمیں تقدیر سے پانی

446

جوں جوں الفت زیادہ ہوتی ہے دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے

دیکھتا ہوں جو تیری صورت کو مجھ کو حسرت زیادہ ہوتی ہے
دن بدن[1] بے مروّتی تیری بے مروّت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا میں نہیں جو تجھ کو ذرا غم کی شدّت زیادہ ہوتی ہے
دل کو روکے ہوئے ہوں میں، تو بھی ہائے چاہت زیادہ ہوتی ہے
میری اور تیری یہ نہیں معلوم کیوں محبت زیادہ ہوتی ہے
بڑھ چلا پھر تو، دیکھ کہتا ہوں غمِ فرقت، زیادہ ہوتی ہے!
مصحفی وقتِ شب مری اُس کی ق گرچہ صحبت زیادہ ہوتی ہے

لیک جب اُٹھ چلوں ہوں میں واں سے
پھر مصیبت زیادہ ہوتی ہے

447

جُز نجد کے دیکھی نہ کوئی منزلِ لیلیٰ سو بار گیا حی[2] سے اُدھر محملِ لیلیٰ
ہے ہے وہ ستم کرتی ہے آوازِ حدی[3] کی محمل میں ہلا جائے ہے جس سے دلِ لیلیٰ
جاتا ہے بگولے میں اُڑا قالبِ مجنوں تا قافلے میں جا کے وہ ہو شاملِ لیلیٰ
لیلیٰ ہے اگر حسن کا دریا تو نظر میں جُز ناز و کرشمہ نہیں کچھ ساحلِ لیلیٰ
یاں خوں میں تڑپتے ہیں کئی طفلِ دبستاں مرغِ دلِ مجنوں ہی نہیں بسملِ لیلیٰ
سچ عشق میں ہیں عاشق و معشوق برابر جو مشکلِ مجنوں ہے سو ہے مشکلِ لیلیٰ
اِس خاک سے کہتے ہیں بنے پیکرِ مجنوں جو خاک تخمر[4] تھی بہ آب و گلِ لیلیٰ
کاسے پہ پڑیں اس کے اگر سنگ ہزاروں جاوے نہ کسی در پہ کبھو سائلِ لیلیٰ
ہیں بال جو مکھڑے پہ پڑے اُس کے، اُٹھا دے کب تک یہ سیہ خانہ رہے حائلِ لیلیٰ

1۔ دن بدن بجائے روز بروز (روزمرّہ) 2۔ حَی = محلہ، علاقہ 3۔ حدی = اُونٹ یا کارواں کی رفتار تیز کرنا، اصل یہ لفظ حُداء اور حِداء ہے، اردو/ فارسی والوں نے حُدی (بروزن خودی) کر لیا ہے۔
4۔ تخمر (بروزن معمر) جس کا خمیر تیار کیا گیا ہو۔

اے مصحفی لیلیٰ ہے اگر قاتلِ مجنوں
معشوق مرا وہ ہے کہ ہے قاتلِ لیلیٰ

448

نہ ڈر سے شیخ کے جامِ مُل[1] آستیں میں ہے ۔۔۔ برنگِ شیشہ یہاں قُلقُل[2] آستیں میں ہے
نہ کر غرور کہ گجرے ہیں میرے ہاتھوں میں ۔۔۔ کہ اشکِ سرخ سے یاں بھی گل آستیں میں ہے
میں آستیں جو نچوڑوں تو جائے عالم ڈوب ۔۔۔ ہنوز اشک کا دریا کل آستیں میں ہے
اُتار سر سے میاں پیرہن کو اپنے شتاب ۔۔۔ کہ مثلِ مارِ سیہ کاکُل آستیں میں ہے
شب اُس کی زلف کو ٹک لگ گیا تھا میرا ہاتھ ۔۔۔ جو دیکھتا ہوں سحر، سنبل آستیں میں ہے
چمن میں جا کے زبس دے ہے دادِ صیادی ۔۔۔ ہر ایک طفل کے اِک بُلبل آستیں میں ہے

نہ مصحفی پہ کرو تہمتِ تہی دستی
کہ نقدِ داغ سے اُس کے پُل آستیں میں ہے

449

نہ یہ وہ دل ہے کہ اب جس سے نالہ سر کھینچے ۔۔۔ نہ وہ زمیں ہے جگر، جس سے لالہ سر کھینچے
کسی سے ہم نے یہاں سرکشی نہ کی، پسِ قتل ۔۔۔ ہمارے خون کا شاید قبالہ سر کھینچے
لے اپنے ہاتھ میں ساقی اگر تو ساغرِ لعل ۔۔۔ تو شاخِ گل سے نہ گل کا پیالہ سر کھینچے
مری بغل سے تو جاتا ہے اب کہاں، نہ سنا ۔۔۔ کہ ماہ ہو کے ہم آغوشِ ہالہ سر کھینچے
اسیرِ زلف میں ہوں اُس غزالِ رعنا کا ۔۔۔ نہ جس کے دام سے ہرگز غزالہ سر کھینچے
شہیدِ رنگِ حنا کا ترے جہاں ہو مزار ۔۔۔ عجب نہیں ہے اگر واں سے لالہ سر کھینچے
نہ آرسی اُسے دکھلاؤ کوئی، ڈرتا ہوں ۔۔۔ مَباد پھر کے وہ مشکیں کُلالہ سر کھینچے

کسی کا حق جو کوئی غصب کر کے کھا جاوے
تو مصحفی نہ پچے[3] وہ نوالہ سر کھینچے

1۔ مُل = شراب 2۔ قُلقُل = انڈیلنے میں شراب کی آواز 3۔ پچنا = ہضم ہونا، راس آنا

450

دور رہنا ہی بھلا ہے ہمیں محبوبوں سے
رنگی خوب نہیں اتنی خوش اُسلوبوں سے

بسکہ طومار[1] کے طومار میں لکھ لکھ بھیجے
ہوگیا یار بھی عاجز مرے مکتوبوں سے

تلخ دشنام تری، ہم کو گوارا ہے و لے
جانِ من خوب نہیں بے مزگی خوبوں سے

سیر کو چل تو کہ جھاڑا ہے صبا نے اے گل
صحنِ گلشن پرِ طاؤس کی جاروبوں[2] سے

مددِ بخت نہ ہو اہلِ دُول کو جب تک
بازی پاتے ہیں کوئی عقل کے منصوبوں سے

دل دھڑکتا ہے کبھو، آنکھ پھڑکتی ہے کبھو
کیونکے جانبر ہو کوئی عشق کے آشوبوں سے

مصحفی مانگے ہے یا رب یہ دعا بعدِ نماز
حشر کے دن نہ اُٹھانا اُسے مغضوبوں سے

451

گو تم نے مجھے زیست سے بیزار رکھا ہے
پر میں نے تو تم سے ہی سروکار رکھا ہے

میں مارتہِ سنگ ہوں سر کیونکے اُٹھاؤں
کافر کی اداؤں نے مجھے مار رکھا ہے

صیاد کا احساں ہے کہ دیوارِ چمن پر
لاکر قفسِ مرغِ گرفتار رکھا ہے

روتے ہوئے کروٹ میں کبھی لی ہے تو گویا
تکیہ پہ مرے موتیوں کا ہار رکھا ہے

ہو قافلہ راہی تو چلیں، گھر میں ہمارے
اسباب سفر کرنے کو تیار رکھا ہے

رہتا ہے جو دل سینے میں بے تاب ہمیشہ
اللہ نے اس میں بھی کچھ اسرار رکھا ہے

کاوش تو ذرا دیکھیو اُس شوخ نے آکر
تربت پہ مری، گل کی جگہ خار رکھا ہے

تو گھر سے جو نکلے تو نماز اُس کی پڑھی جائے
عاشق کا جنازہ پسِ دیوار رکھا ہے

مرہم بھی رکھا ہے جو مرے زخم پر اُس نے
تو وائے ستم مرہمِ زنگار رکھا ہے

میں سینہ زنی کی ہے شبِ ہجر تو برسوں
بیماریِ دل تو نے مجھے مار رکھا ہے

1۔ طومار = لمبا کاغذ 2۔ جاروب = جھاڑو بھی اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے

چاہو سو کرو، خواہ جفا خواہ وفا تم　میں آپ کو اِس کام میں مختار رکھا ہے

تربت پہ کبھی مصحفی کی چلیے نہ صاحب
نزدیک تمھارا یہ گنہ گار رکھا ہے

452

مروت بھی اگر آنکھوں میں اُس کی اک ذرا ہوتی
تو نظروں سے مری اُس کی نظر خود آشنا ہوتی

گریباں کے تو کر ڈالے ہیں پرزے مثلِ گل، ہے ہے
ذرا ہاتھ اور اُٹھ جاتا تو چولی بھی ہوا ہوتی

نظر مژگاں تک اب آتی نہیں، یا ایک دن وہ تھا
کہ اُس کے روئے زیبا سے نہ اک ساعت جدا ہوتی

چمن کو دیکھتے ہم، کس طرح سرسبز ہوتا پھر
اگر اُس گل کے بر میں گل کے بوٹے کی قبا ہوتی

نہ دیتا میں اگر اُس شوخ ہرجائی کو دل اپنا
تو کیوں اِس بات کی عالم میں شہرت جا بجا ہوتی

گلی میں اُس کی گر ہم خاک ہوجاتے تو بہتر تھا
موئے پرواں ہماری خاک کی وارث صبا ہوتی

جو لگ چلتی ہمارے خوں کی سرخی اس کے پاتوؤں سے
تو یہ بھی رفتہ رفتہ خوشتر از رنگِ حنا ہوتی

نظر آتا نہ اُس کو گر، یہ تیرا پھول سا مکھڑا
صبا اس طرح کیوں گلشن میں آتش زیرِ پا ہوتی

خفا ہے ہم سے وہ اے مصحفی اتنا ہی بہتر ہے
غضب تھا اُس سے گر اپنی طبیعت بھی خفا ہوتی

453

غرض کہ جو حرکت ہے سو دل لبھانے کی
ادا میں کیا کہوں کافر کے منھ پھرانے کی

کہیں ہیں آگ لگی ہے چمن کو بے دردو
خبر تو کوئی لے بلبل کے آشیانے کی

گلہ نہ کیجیے یاروں کی بے وفائی کا
کہ اِن دنوں یہی تاثیر ہے زمانے کی

وہ رعشہ مہ میں کہاں ہے، جو میں نے جمنا میں
ادائیں دیکھی ہیں کافر کے تھرتھرانے کی

کہاں ہے قافلۂ رفتگانِ ملکِ عدم
کوئی تو بات کہو اک ذرا ٹھکانے کی

کبھی خوشی نہ کیا مجھ کو آکے قاصد نے
کہی جو بات بھی کوئی تو جی کڑھانے کی

کہوں میں کیا مری آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے
ادا جب آتی ہے یاد اُس کے پان کھانے کی

لگائے اُس نے مری قبر پر کل اتنے تیر
کہ مٹی بھی نہ رہی مصحفی نشانے کی

454

تم ہم کو اپنا منھ نہ دکھاؤ تو خوب ہے
پردے میں اور چاہ بڑھاؤ تو خوب ہے

مرتے ہیں جو تمھاری اس آواز پر اُنھیں
آواز بھی اگر نہ سناؤ تو خوب ہے

چولی چسی ہوئی ہے تمھاری، تو کیا ہوا
دو چار دن اِسے نہ سلاؤ تو خوب ہے

اے ساکنانِ کنجِ قفس، آئی ہے بہار
ایسے میں تم بھی دھوم مچاؤ تو خُوب ہے

جھپکی ہے مصحفی کی ابھی آنکھ اک ذرا
تم اُس کو اس گھڑی نہ جگاؤ تو خوب ہے

455

اُس کی چاہت کے گرفتار ہیں ہم بھی، سچ ہے
دیکھنے کے تو گنہ گار ہیں ہم بھی، سچ ہے

کون کہتا ہے نہیں روے نکو کے خواہاں
جنس اچھی کے خریدار ہیں ہم بھی، سچ ہے

تہمتِ حسن پرستی نہیں ہم پر بے جا
ہاں ترے طالبِ دیدار ہیں ہم بھی، سچ ہے

غیر ہی تجھ کو نہیں دیکھتے سر کر کے بلند　　اِس ہوس میں پسِ دیوار ہیں ہم بھی، سچ ہے
کیا کریں دیکھنے بن رہتی نہیں یہ آنکھیں　　اپنی آنکھوں سے تو ناچار ہیں ہم بھی، سچ ہے
حق تعالیٰ ترے جلوؤں کو سلامت رکھے　　ایسے جلوؤں کے خریدار ہیں ہم بھی، سچ ہے
مصحفی گر کوئی مل جائے نصیبوں سے تو ہاں
روز و شب طالبِ دیدار ہیں ہم بھی، سچ ہے

456

کوئی کیا جانے کہ اس عشق میں کیا بنتی ہے　　دیکھتے دیکھتے ہی جان پر آ بنتی ہے
اب کے سردی میں تو ہوویں گے بہت لوگ نہال　　واسطے اُس کے مشجر[1] کی قبا بنتی ہے
اُس کی صورت کا وہ عالم ہے کہ سبحان اللہ　　کوئی تصویر بایں حسن و صفا بنتی ہے
کس پہ ظالم کی چڑھائی ہے یہ معلوم نہیں　　اِن دنوں تیر جُدی، تیغ جدا بنتی ہے
زلف کو اُس کی بناتی ہے جو مشاطہ کبھو
مصحفی کہتے ہیں، دونی وہ بلا بنتی ہے

457

بجلی کی کوند دیکھ اُسے منھ چھپا گئی　　دل کی تڑپھ تو مجھ کو تماشا دکھا گئی
بھیجیں گے ہم بھی گل کو کوئی رقعہ اُس کے ہاتھ　　اب کی طرف چمن کے، جو بادِ صبا گئی
مت پوچھ اس کی گات کا عالم میں کیا کہوں　　نظروں میں کیا کھُبی کہ وہ جی میں سما گئی
تصویر تیری دیکھی جو شیریں نے ایک دن　　ہے بسکہ با شعور، وہ نقشا اڑا گئی
سروِ رواں کی اپنے میں تعریف کیا کروں　　رفتار اُس کی خاک میں مجھ کو ملا گئی
کب اُس پری نے وصل کا وعدہ وفا کیا　　بالا دِکھاکے[1] نت ہمیں بالا بتا گئی[2]

1۔ مشجر = کپڑے کی ایک قسم جس پر پھول پتے ہوتے ہیں　2۔ بالا دکھانا۔ چہرہ دکھانا

3۔ بالا بتانا = ٹرٹی مارنا، فریب دینا

تو دیکھتے ہی اُس کو جو دیوانہ ہو گیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آگئی

458

رفتار اُس کی دل پہ جو ٹھوکر لگا گئی — یک بار بختِ خفتہ کو میرے جگا گئی
میں اس نگاہِ تیز کے صدقے گیا، کہ وہ — دل پرزے پرزے کرکے ہوا میں اڑا گئی
دیکھا نہ ہوگا وہ کبھی مانی نے خواب میں — تصویر اُس کی مجھ کو جو عالم دکھا گئی
کیا جانے اُس کو مرغِ سحر خواں نے کیا کہا — آزردہ دل چمن سے جو بادِ صبا گئی

مُردہ سا کیا پڑا ہے تو بستر پہ مصحفی
کیوں بولتا نہیں، تجھے کیا موت آگئی

459

کب ہاتھ مرا اُس کے گریباں کے تلے جائے — سو بار نہ تا سیبِ زنخداں[1] کے تلے جائے
کیا ایسی نگہ سے کوئی خوش ہووے، جو کافر — مژگاں سے جدا ہوتے ہی مژگاں کے تلے جائے
مرغِ دلِ بسمل شدہ ہے رحم کے قابل — وقتیکہ تڑپھ کر ترے داماں کے تلے جائے
وحشت اُسے ہوجائے، گر اس فصل میں کوئی — ٹک سایۂ دیوارِ گلستاں کے تلے جائے
گو جی سے گذر جائے کوئی، پر یہ نہ ہوگا — انگشتِ تاسّف تری دنداں کے تلے جائے
ہے عید کا دن، دیکھیے آج اُس کی گلی میں — کس کس کا گلا خنجرِ برّاں کے تلے جائے
اُس سینۂ مجروح سے ہو کیا کوئی واقف — خوں بہتا ہوا جس کے گریباں کے تلے جائے

اے مصحفی دیکھے نہ وہ شوخ آنکھ اُٹھا کر
گر دجلۂ خوں دیدۂ گریاں کے تلے جائے

460

جوں جوں دل زخم کھائے جاتا ہے — وہ بھی تیغا لگائے جاتا ہے

1۔ یعنی جب تک ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر سو بار خوشامد نہ کروں

مجھ کو پامال کر گیا ہے ابھی یہ جو دامن اُٹھائے جاتا ہے
الَمِ عشق کا بُرا ہووے دل مرا بلبلائے جاتا ہے
فتنہ گر تیری چشم کا بیمار کہتے ہیں دم چُرائے جاتا ہے
گرچہ ہم چھک رہے ہیں پھر بھی ہمیں شوق دارو پلائے جاتا ہے

دیکھیو اُس کو دیکھ کر کیسا
مصحفی سٹ پٹائے جاتا ہے

461

گاہ مد[1] سرمہ کی کاجل کی گہے تحریر ہے عالم اُن آنکھوں کا رشک عالم تصویر ہے
دل جو چاہے ہے تجھے میرا، تو پھر میں کیا کروں تو ہی کر انصاف ایسی کیا مری تقصیر ہے
توڑ جاتا ہے توے[2] اک پل میں نہُ افلاک کے تو کہے نالہ مرا روئیں کماں[3] کا تیر ہے
گرد ٹوپی کے جو ہے کافر کی یہ گوٹا لگا آہ مت پوچھو مرے حق میں دمِ شمشیر ہے
کیا بلا نازل ہوئی اِس دل کو یہ کیا ہو گیا میں وہی، دل بھی وہی، پر نالہ بے تاثیر ہے
دیکھیے اِس معرکہ میں کس کی ہو فتح و شکست یاں میں اُس کی فکر میں ہوں، واں مری تدبیر ہے
کیا ترے زندانیوں کو اس شب آئی خوابِ مرگ نَے صدا شیون کی وہ، نے نالۂ زنجیر ہے
اُس کی زلفوں کو میں شب دیکھا ہے دستِ غیر میں یارو اس خوابِ پریشاں کی بھی کچھ تعبیر ہے؟

اُس کی باتوں پر لگاؤں کیوں نہ اب جی دوستو
مصحفی ہے اک تو شاعر، تس پہ خوش تقریر ہے

462

آیا تھا میں سجدے کو ترے، شہرِ عدم سے جوں سایہ اُٹھایا نہ کبھی سر کو قدم سے
گو میں نے یہ جانا کہ تو آئے گا نہیں لیک کر میری تسلی تو ذرا جھوٹی قسم سے

1۔ مد = لکیر 2۔ توے = ڈھکن، طبقے 3۔ روئیں کماں = فولادی کمان والا، بہادر

تا سمجھے حقیقت دلِ خوں گشتہ کی میرے میں نامہ لکھا ہے اُسے مرجان[1] قلم سے

گر چشم تری دیوے ذرا زلف کو پَر چک[2] روکش ہو ابھی سنبل گلزارِ ارم سے

کعبہ کو تو ہم جاتے ہیں پھر کیو نکے پھریں گے گر لڑ گئی واں آنکھ کسی تازہ صنم سے

سچ پوچھو تو کچھ جسم میں اپنے نہیں باقی اک بیٹھی ہوئی کھال سی ہم دھونکیں[3] ہیں دم سے

اب مصحفی تو جانے ترا کام، مری جان

کی ہم نے تو اپنی سی، جو کچھ ہو سکی ہم سے

463

ملو ہو غیروں سے اور ہم سے بیوفائی ہے یہ کون شیوہ ہے، کیا رسمِ آشنائی ہے؟

رہی ہے آرسی آنکھوں سے اُس کی آنکھ ملا ذرا تو دیکھ تو، کیا دیدے[4] کی صفائی ہے

اسیر مر گئے لاکھوں قفس کدے کے قریب کہا تھا آ کے کسی نے: ''بہار آئی ہے''

ہزاروں مومن و کافر سجود میں ہیں یہاں بتوں کے گھر میں جو دیکھا تو اک خدائی ہے

زخویش رفتہ ہوں اتنا کہ کچھ نہیں معلوم شبِ وصال ہے یہ یا شبِ جدائی ہے

مجال کیا دلِ عاشق میں ہو تصورِ غیر کہ اس نگر میں شہِ حسن کی دہائی ہے

فقط نہ رنگِ کفک نے کیا ہے دل کو خون بلائے جاں یہ ترا پنجۂ حنائی ہے

بغور دیکھے کوئی مصحفی تو سمجھے سچ

غرورِ حسن میں اک شانِ کبریائی ہے

464

یوں ہے نازاں جی سے مجھ کو وہ ستمگر مار کے جوں کوئی غازی مسلماں خوش ہو کافر مار کے

اک ادا دکھلا کے بھاگے، دل پہ نشتر مار کے اس ادا پر تو میں مرجاؤں گا خنجر مار کے

1۔ مَرجان قلم = مونگے کا قلم اس میں (مر + جان) کی رعایت لفظی سے فائدہ اُٹھایا ہے

2۔ پَر چک دینا = اشارہ کرنا، ترغیب 3۔ دھونکنا = لوہار بھٹی گرم کرنے کے لیے مشک جیسے آلے سے ہوا دیتے تھے اُسے دھونکنا کہتے ہیں 4۔ دیدے کی صفائی = بے شرمی، بے لحاظ ہونا

دوش کیوں لیوے کسی کو وہ ستمگر مار کے
لوگ جب مرتے ہوں اُس پر، آپ خنجر مار کے

روز کی خارا تراشی تھی بلائے جانستاں
چھٹ گیا فرہاد، بس اک تیشہ سر پر مار کے

میری تربت پر گر آنا بھی تو از بہرِ ثواب
جائیو اے ابر، دو چھینٹے مقرر مار کے

چل سکا اُس سے نہ جب ہرگز مرے نامے کا بوجھ
رہ گیا آخر کو مرغِ نامہ بَر پر مار کے

خوش قدوں کی شوخیِ رفتار میں ہے یہ اثر
بختِ خفتہ کو جگا دیتے ہیں ٹھوکر مار کے

آ پڑی ہے اب دلوں میں صید، دیکھیں ہووے کیا
جان پر کھیلے ہیں ہم اُس کا کبوتر مار کے

قصۂ خسرو سے ظاہر ہے کہ وقت زورِ عشق
باپ کو بیٹا سُلا رکھے ہے خنجر مار کے

وا نہیں ہوتا کسی کے منہ پہ ہرگز دَر ترا
یاں جو آتے ہیں چلے جاتے ہیں وے سر مار کے

جب نہ نکلا خوں رگِ جاں سے مری، فصادِ عشق
منفعل کتنا ہوا نشتر پہ نشتر مار کے

اس کے کوچہ سے منانے آئے تب ہم کو حریف
اُٹھ چلے ہم جب بغل کے بیچ بستر مار کے

چوٹ ہے اس بات کی دل پر کہ تم جاتے رہے
تازیانے کی طرح زلفِ معنبر مار کے

عشق کے ورطے سے ٹک نکلی اگر کشتی مری
بیٹھ جاتی ہے وہیں پھر اُس میں چکر مار کے

مصحفی کو رات ساقی نے جو دی لاے[1] شراب
اُٹھ گیا جھنجھلا کے وہ شیشہ پہ ساغر مار کے

465

مار ڈالا ہے ادا نے تیری
جی جلایا ہے حنا نے تیری

وقتِ فرصت کے بھی اے گُل مجھ سے
نہ کہی بات صبا نے تیری

کیوں نہ گھوروں کہ بنائی ہے صنم
صورت ایسی ہی خدا نے تیری

گور کے سوتوں کو بیدار کیا
آخر اِس جنبشِ پا نے تیری

ظلم ہے یہ کہ حیا پر میری
نہ کیا رحم حیا نے تیری

1۔ لاے شراب = شراب کی گاد، دُردِ تہِ جام

نام پایا ہے زمانے میں میاں　　بے وفائی میں وفا نے تیری

مصحفی عشق کا اب نام نہ لے
جان رکھی ہے خدا نے تیری

466

دیکھ کر صورت تمھاری ہم بہت پُر غم ہوئے　　برہمی زلفوں کی کیا کم تھی کہ تم برہم ہوئے

حسن نے اُس کے بوقتِ گریہ دی دونی بہار　　اشک کے قطرے گُلِ عارض پہ آ شبنم ہوئے

اب لگاتے ہاتھ اُس سینے کے تئیں آتی ہے شرم　　ہاتھ کس کس کے خدا جانے کہ اب محرم ہوئے

اُٹھ گئے جب بزم سے تم آخرِ شب مست خواب　　عاشقوں نے پھوڑ ڈالے سر، بڑے ماتم ہوئے

داغ اس ملنے کا ہے دل پر کہ ہم تو روزِ وصل　　ایک ساعت پاس بیٹھے، ایک دم ہمدم ہوئے

ایک عالم پر نہ دیکھا ہم نے اِس گلشن کا رنگ　　جب تلک گل آنکھ کھولے یاں کئی عالم ہوئے

مصحفی دلّی سے نکلے پر گیا سب دل کا چین
تھے جو اوراق اپنی جمعیّت کے سب برہم ہوئے

467

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے　　بچ کے چلیو، نہ ترا خون سے دامان بھرے

دیدۂ تر کا بتاؤں میں سبب کیا تم کو　　بیٹھے بیٹھے یونہیں کچھ آتے ہیں ہر آن بھرے

دیکھ کر کیوں وہ مجھے آنکھ چرا جاتا ہے　　مدعی نے نہیں اُس گل کے اگر کان بھرے

وہ پُر آشوب ہے ہر اشک مری آنکھوں کا　　جس کے ہر قطرہ میں ہیں سیکڑوں طوفان بھرے

کشتۂ ناوکِ مژگاں کی جہاں تربت تھی　　اُس جگہ نکلے ہیں خوں سے ترے پیکان بھرے

آدمیت جسے کہتے ہیں سو ہے چیز جُدی　　یوں تو ہر شہر میں ہیں گبر و مسلمان بھرے

مصحفی جس کو سخن کہیے، سو وہ بات کہاں
رطب و یابس سے ہیں یوں یاروں کے دیوان بھرے

468

مثلِ آئینہ فقط وہ ہے اور اک حیرت ہے
عاشقِ بے سر و پا کی بھی عجب صورت ہے

نہیں آتا ہے زیارت کو کبھی واں کوئی
کشتۂ تیغِ تغافل کی جہاں تربت ہے

سیکڑوں صحبتیں غائب ہوئیں اِس خاک کے بیچ
کوئی کیا جانے کہ اِس پردے میں کیا صحبت ہے

اک گُل پھول میں سو رنگ دکھاتی ہے بہار
قلمِ قدرت صانع کی عجب صنعت ہے

اور دو زخم لگا نعش پہ میری قاتل
ہے یہی وقتِ کرم، تجھ میں اگر فرصت ہے

جب تلک تو ہی بلاوے نہ اُسے، بے ایما[1]
آئینہ سامنے آوے ترے، کیا قدرت ہے

کر کے قربان مجھے وہ بتِ بے دیں بولا
اب تلک آنکھوں میں اِس کی نگہِ حسرت ہے

مجھ کو اے دوست جو چاہے تو ملادے تجھ سے
میں تو عاجز ہوں پر اللہ میں سب قدرت ہے

عید کا دن ہے کہ آئی ہے قیامت یا رب
اُس کے کوچے میں جو دیکھا تو عجب کثرت ہے

دیکھیے گلشنِ ہستی کا تماشا کیوں کر
دیدنی خار تک، اور چشم زدن فرصت ہے

ابرِ تر خوب ہی رویا تو مری تربت پر
چاہیے یونہیں تجھے، تیرے تئیں رحمت ہے

بے کلی گل کی کلی پر نہ ہو کیوں بلبل کو
کہ نیا عشق ہے یہ، اور نئی چاہت ہے

خوبرو دیکھ کے دوڑے ہے یہ اُس کے پیچھے
مصحفی دل میں مرے باز کی خاصیت ہے

469

چمن ہے، سبزہ ہے، ساقی ہے اور ہوا بھی ہے
جو یار ایسے میں ہووے تو اک مزہ بھی ہے

گئی نہیں عطشِ دل ابھی تو اے ساقی
خبر تو لیجو، گلابی میں کچھ رہا بھی ہے

کیا ہے قتل ہزاروں کو اس نے دزدیدہ
کسی کے خون کا چرچا کہیں ہوا بھی ہے!

میں کیونکے جان نہ دوں اپنی اُس کے ہاتھوں پر
ہیں پور پور میں چھلّے، تو پھر حنا بھی ہے

تو اُس سے آنکھ ملاتی ہے آرسی کیسے
خبر تو لے، تری آنکھوں میں کچھ حیا بھی ہے

1۔ ایماء = اشارہ

میں اعتماد کروں کس کی آشنائی پر کوئی کسی کا زمانے میں آشنا بھی ہے
جوابِ خط کے لیے کیوں پڑا ہے اے قاصد کسی کو اُس بتِ کافر نے خط لکھا بھی ہے
ہمیشہ لٹتے ہی دیکھی ہے راہِ ملکِ عدم کوئی یہاں سے کچھ اسباب لے گیا بھی ہے
نسیم ہی نہیں مرتی ہے تیری زلفوں پر جو دیکھتا ہوں تو وارفتہ کچھ صبا بھی ہے
دعا لکھی ہے میں نامے میں اُس کو لیک بغور کوئی پڑھے تو دعا بھی ہے مدّعا بھی ہے
جواب نامہ تو یک سو رہا، یہ پوچھو کوئی کہ اُس کے ہاتھ میں قاصد نے خط دیا بھی ہے
بغور دیکھے جو دیوانِ مصحفی کو کوئی
تو خود کتاب ہے یہ بلکہ مرثیا بھی ہے

470

ہر ایک قدم پر جو وہاں غش کی جگہ ہے کوچے کی ترے خاک بھی غَش غَش کی جگہ ہے
باندھا ہے جو ترکش کے تئیں تو نے کمر سے انصاف کرو آپ بھی، یہ ترکش کی جگہ ہے
ڈھونڈھو نہ مری آہ کو آتش کی جگہ میں افلاک پہ اِس شعلۂ سرکش کی جگہ ہے
رکھتا ہوں ترے غم کو سدا اُس میں میں جانی ہر چند کہ سینہ مرا آتش کی جگہ ہے
اے دل مرے پہلو سے شبِ وصل جدا رہ کس واسطے، یہ اُس بتِ مہ وِش کی جگہ ہے
ہرگز دلِ عارف نہ ستا، جائے کدورت یہ شیشہ، ہمیشہ مئے بے غشِ[1] کی جگہ ہے
خالی نہیں اے مصحفی یاں رنج سے کوئی
یہ بزم بھی اک طرفہ کشاکش کہ جگہ ہے

471

دلِ خارا میں مرا نالہ اثر کرتا ہے لیک سختی سے ترے دل کی حذر کرتا ہے

1۔ یہ لفظ کھوٹ اور ملاوٹ کے معنی میں بکسر اوّل غِش ہے مگر مصحفی نے غَش بفتح اول باندھا ہے جس کے معنی غفلت اور بیہوشی ہیں۔

چشمِ بد دور، ہے واں بے خبری کا عالم　　میرے احوال سے کون اُس کو خبر کرتا ہے
میں بھی گذرا جو کبھی یاں سے، تو کیا قہر ہوا　　ایک عالم ترے کوچے سے گذر کرتا ہے
گھر خدا کا تھا یہ دل، جس میں وہ بُت آکے رہا　　یہ نہ سمجھا کہ کوئی گھر میں بھی گھر کرتا ہے
اُس کی بالیں پہ ذرا تو بھی تو آ وقتِ وداع　　کہ تری چشم کا بیمار سفر کرتا ہے
دیکھیو دم کشی بلبل بستانی کو　　کیا بُری طرح شب اپنی یہ سحر کرتا ہے
کیونکے حیراں نہ رہوں میں، کہ تری مجلس میں　　جو کوئی آوے ہے مجھ پر ہی نظر کرتا ہے
مصحفی کے تئیں از بسکہ نہیں عقلِ معاش
گھر میں بیٹھا ہوا اوقات بسر کرتا ہے

472

جھپٹے[1] میں آگیا ہے دل اپنا اُس پری کے　　لاکھوں ہیں یاد جس کو انداز دلبری کے
چاہت نے تیری ہم کو سب کچھ بھلا دیا ہے　　کیا لطف میں کٹے ہیں اوقات بے زری کے
اِس دل کی ابتری کا میں حال کیا بتاؤں　　ہیں ڈھنگ سارے اِس میں زلفوں کی ابتری کے
اُس رُخ سے جو صبا نے پردہ اُٹھا دیا تھا　　گرتے تھے اشک ٹپ ٹپ شب ماہ و مشتری کے
لطفِ مجسّم اُس کا ہے سرو قد و لیکن　　اسلوب ہیں سب اُس میں پیدا ستمگری کے
اے مصحفی گلی میں کون اس کی پوچھتا ہے
پھرتے ہیں خوار و رسوا واں لاکھوں ہم سری[2] کے

473

ہر قدم انداز ہے ہر گام پر اک ناز ہے　　ہم عناں اُس کے جلو میں ناز اور انداز ہے
جس نے چہرے کی ترے تصویر دیکھی یہ کہا　　ہائے اس تصویر کا کیا ہی غضب پرداز ہے
کیا کروں اب باغ میں رہ کر، کہ اے گُل تجھ بغیر　　آشیاں اپنی نظر میں چنگلِ شہباز ہے

1۔ جھپٹا = آسیب　　2۔ ہم سری کے = ہم جیسے (عوامی)

نقشِ دیبا کی طرح ہم بسترِ غم پر مدام — ہیں پڑے تنہا، نہ کوئی ہمدم ہے نَے ہمراز ہے
یار کی آوازِ خوش نے مار رکھا ہے ہمیں — سچ تو یہ ہے کیا گلا ہے اور کیا آواز ہے
بال و پر ہم وا نہیں کرتے، وگرنہ دوستو — فرش سے تا عرش اپنی ایک ہی پرواز ہے

آخر اُس طفلِ کبوتر باز کو دے گا فریب
مصحفی بھی عشق کے فن میں کبوتر باز ہے

474

مُنھ پھرا لینے میں تو بارے بھلا اک ناز ہے — دائیں بائیں دیکھتے جانا یہ کیا انداز ہے
گو کوئی ہووے فدا ان خوبرویوں کے تئیں — کب خیالِ جان و مالِ عاشقِ جانباز ہے
دل تڑپنے جو لگا خنجر تلے، بولا وہ شوخ — دیکھیو اس مرغ کو کیا حسرتِ پرواز ہے
مان کہنے کو مرے، امرد پرستوں سے نہ مل — جان چہرے پر ترے خط کا ابھی آغاز ہے
درد یہ کس سے کہوں جا کر کے یارو، ان دنوں — دشمنِ جاں ہے جو اپنا محرم و ہمراز ہے

مصحفی کی قدر اُس مجلس میں اتنی تو نہیں
لیکن اتنا ہے کہ اوروں سے ذرا ممتاز ہے

475

یوں قتلِ غریبوں کا اے شوخ روا کب ہے — شایاں تری خوبی کے یہ جور و جفا کب ہے
کھل جاویں اگر آنکھیں، تو آوے نظر تجھ کو — وہ شاہدِ بے پردہ، پردے میں چھپا کب ہے
غنچہ ہے سو افسردہ، اور گل ہے سو پژمردہ — گلزارِ زمانہ کی خوش آب و ہوا کب ہے
میں دعویِ خوں اُس سے کس طرح کروں یارب — اُس کے دمِ خنجر پر خوں میرا جما کب ہے
کاہے کو کروں شکوہ، میں اُس کی جدائی کا — معشوق مرا مجھ سے، اے یارو جدا کب ہے
خط اُس کو ہی دیتے ہم، سو یوں بھی نہیں بنتی — جاوے ترے کوچے میں، مقدورِ صبا کب ہے

1۔ کوئی بروزن فَع باندھا ہے

اُس کی شبِ ہجراں کا دل مار گزیدہ ہے
تہمت ہے عبث اُن پر، زلفوں نے ڈسا کب ہے

خوباں کی جفا پر دل، ناچار رکھا ہم نے
گر ان سے وفا ڈھونڈھیں تو اُن میں وفا کب ہے

لوہو کسی بسمل کا ہاتھوں سے لگایا ہے
قاتل میں نہ مانوں گا یہ رنگِ حنا کب ہے

آ گو ہی دل اپنے کو، کرتا ہوں تسلّی میں
قاصد ابھی اُس کو سے، خط لے کے پھرا کب ہے

اک عمر ہوئی اس کو، مرتا ہے نہ جیتا ہے
بیمارِ محبت کی کیا جانے قضا کب ہے

آئینہ کو تجھ پر سے سو بار کروں صدقے
آئینے کے چہرہ پر یہ حسن و صفا کب ہے

اے مصحفی ناحق تو کھینچے ہے تعب ناداں
اس دردِ محبت کی دنیا میں دوا کب ہے

476

اے فلک آپ کو اتنا جو پھرایا تو نے
کوئی معشوق بھی عاشق کو ملایا تو نے؟

خاک میں مجھ کو مری جان ملایا تو نے
فائدہ اس میں تو کچھ خاک نہ پایا تو نے

فاتحہ کا بھی تو ممنوں نہیں میں تجھ سے، بھلا
میری تربت پہ کبھی ہاتھ اُٹھایا تو نے؟

میں جو دیوانہ سا جاتا ہوں تو اُس کوچے کے[1]
مجھ کو کہتے ہیں، یہ کیا رنگ بنایا تو نے

عید کا چاند تجھے کیونکے کہوں میں کہ میاں
عید کے دن بھی مجھے منھ نہ دکھایا تو نے

دیکھیے گذرے گا کیا، کتنے گریبانوں پر
اب کی جامہ تو بہت تنگ سلایا تو نے

مصحفی حال ترا کچھ نظر آتا ہے تغیر[2] ق
سچ تو کہہ کس سے دل اپنے کو لگایا تو نے

رنگ چہرے کا ترے، ہم سے کہے دیتا ہے
عشق چھپتا ہے کوئی، گو کہ چھپایا تو نے

477

شب وہ ان آنکھوں کو شغل اشکباری دے گئے
لے گئے خواب اُن کا اور اختر شماری دے گئے

چلتے چلتے اِس ادا سے وعدہ آنے کا کیا
دھر کے ہاتھ اس دل پہ اور اک زخم کاری دے گئے

1۔ اُس کوچے کے = یعنی کوچے والے (خالص روزمرّہ) 2۔ تغیر (بروزن سفیر) بدلا ہوا (عوامی)

خواب و خور صبر و سکوں یک بار سب جاتا رہا بے قرار اپنے کو کیسی بے قراری دے گئے
یہ خبر تو نے سُنی ہوگی کہ اس کوچے میں رات داد رونے کی ہم اے ابرِ بہاری دے گئے
آپ جا بیٹھے کسی منزل پہ ہو تھانی امیر[1] اور دیارِ دل کی غم کو فوجداری دے گئے
گر کہیں آیا نظر اُن کو کوئی ماٹی کا ڈھیر گالیاں، اُس کو سمجھ تربت ہماری، دے گئے
آپ تو جاتے رہے باتیں بنا اور مجھ کو آہ بے قراری، بے خودی، بے اختیاری دے گئے
گر ہوا عزمِ سفر اُن کا سحر پر مصحفی
وقتِ شام آ کر مجھے اپنی پٹاری دے گئے

478

خطرہ ہے مجھے اس دلِ کم بخت کی خو سے ڈرتا ہوں کہ ہو جائے محبت نہ کسو سے
دم تیرے مریضوں کا ٹھہرتا نہیں کافر جانوں پہ بنی ہے ترے تعویذِ گلو سے
یہ خوں نہیں آتش ہے، مبادا بھڑک اُٹھے دامن کو بچانا تو ذرا میرے لہو سے
کیا باغ میں آیا تھا صبا، وہ اگری پوش جو اب تئیں مہکے ہے چمن عطر کی بو سے
ٹک غمزۂ خوں ریز کو سمجھا کہ ہمیشہ اک کشتہ نیا نکلے ہے قاتل تری کو سے
چل سوزنِ تدبیر کو لے جا تو مسیحا یہ زخم سمٹنے کے نہیں تیرے رفو سے
سر کعبہ نشیں مارے ہیں دیوار سے اب تک اک روز کہیں پردہ اُٹھا تھا ترے رُو سے
جب سر کھلے وہ سامنے آ جائے ہے میرے جی اُلجھے ہے کافر کی پریشانیِ مو سے
ساقی کا مرے حال پہ، گر یہ ہے تغافل سر اپنا میں دے ماروں گا اک روز سُبو سے
اے آئینے ہوتا ہے تو اُس رو سے مقابل چل دور خبر لے کہیں اپنی، اسی رو سے؟
اے مصحفی کرتا ہے تو کیوں زخم کا شکوہ
تجھ کو بھی تو اک لاگ ہے اُس عربدہ جو[2] سے

1۔ تھانی امیر = تھانیدار 2۔ عربدہ جو = جنگ جو

479

چھیڑے سے مرے ہمدم زلف اُس کی اکڑتی ہے　　جوں جوں میں بناؤں ہوں، وہ زور بگڑتی ہے
طولِ شبِ ہجراں کو ہر چند بیاں کیجیے　　نے رات نبڑتی ہے، نے بات نبڑتی ہے
گو حسن پرستی کا انکار تو کرتا ہے　　آئینے سے پر تیری کچھ آنکھ تو لڑتی ہے
رخ یار کی مژگاں نے شاید کہ کیا ایدھر　　کچھ کل سے کلیجے میں اک پھانس سی گڑتی ہے
گو شیخ جی نت اپنی داڑھی کو کریں شانہ　　ناحق کی یہ شیخی ہے، کیا اِن سے اُکھڑتی ہے؟
حجّت مری بلبل کی، گلشن میں کوئی دیکھے　　میں اُس سے جھگڑتا ہوں، وہ مجھ سے جھگڑتی ہے

احوال ہے جو تیرا اُس سے نہیں گھبرانا
انساں پہ مصیبت بھی اے مصحفی پڑتی ہے

480

طاق پر خوشۂ انگور دھرا رہتا ہے　　یاں علاجِ دلِ رنجور دھرا رہتا ہے
تو جو ہوتا نہیں ساقی، تو مری مجلس میں　　سامنے شیشۂ مَے دُور دھرا رہتا ہے
بخت اسے کہتے ہیں، تکیہ پہ مرے یاروں کے　　نت سرِ ساقیِ مخمور دھرا رہتا ہے
مدّعی کر نہ تو مقدور کا اپنے دعویٰ　　جب حریف آئے ہے، مقدور دھرا رہتا ہے
مقتلِ عشق میں فہمیدہ قدم رکھ ناداں　　دار پر یاں سرِ منصور دھرا رہتا ہے
ذکر آجائے ہے جس جا کہ مری وحشت کا　　قیس کا واں سرِ پُر شور دھرا رہتا ہے

مصحفی آئینہ اُس ناوکِ مژگاں کے حضور
صورتِ خانۂ زنبور دھرا رہتا ہے

481

ہر ایک بال وہ جس کے تئیں کمر نہ لگے　　خدا کرے کہ ترے بالوں کو نظر نہ لگے
شبِ فراق کی ایسی ہی ہے ڈراونی رات　　اکیلے گھر میں بھلا مجھ کو کیونکے ڈر نہ لگے

قفس سے تازہ میں آیا ہوں، کیا عجب اس کا　　چمن میں موسمِ گل جی مرا اگر نہ لگے
جو لے چلا ہے مرے خط کو تو، تو ہے مختار　　پر اتنا کچھ تجھے دیر نامہ بَر نہ لگے
خیال دل میں سمایا ہے مانگ کا اُس کی　　عجب نہیں جو مری آنکھ تا سحر نہ لگے
اگر چہ تشنۂ خوں ہے، وہ پُر نزاکت دست　　یہ چاہے ہے کہ مرے زخم کارگر نہ لگے
لگائے تیغ تو، بہرِ ثواب عید کے دن
جو مصحفی کے گلے سے وہ سیم بر نہ لگے

482

جو تھے سننے والے اِس آہِ حزیں کے　　میاں پہلے دشمن ہوئے تم انھیں کے
خدا کی قسم ہے، کیا گر میں نالہ　　گزر جائے گا پار عرشِ بریں کے
ذرا آنکھ اُٹھا کر اِدھر دیکھ تو بھی　　میں صدقے تری نرگسِ شرگیں کے
معلّم نے چھڑیاں لگائیں کہ جھڑیاں　　الف دیکھیو اُس تنِ نازنیں کے
انھیں دسترس اتنی کب ہے کہ ہوتے　　مرے اشک تکیے تری آستیں کے
ہنسو ہو مری بات پر کِھل کھلا کر　　بڑے ہنسنے والے تم آئے کہیں کے
تری طبع کو مصحفی آفریں ہے
کہ دل چسپ ہیں شعر سب اس زمیں کے

483

کوئی ایسا نہیں مِلتا کہ ہم کو ہم سے لے جاوے
دکھا دے اور عالم، اور اِس عالم سے لے جاوے
کوئی اس وقت میں جرّاح ایسا بھیج دے یا رب
کہ میرے کُہنہ زخموں کے الم مرہم سے لے جاوے
تمھارے دستِ نازک کا بھروسا یہ نہ تھا مجھ کو
کہ میرا کاٹ کر سر خنجرِ بے دم سے لے جاوے

مرے آگے سے جانے کا نہیں غم میں یہ چاہوں ہوں
کہ محرم تجھ کو پنہاں کر کے نامحرم سے لے جاوے

جو وہ خورشید رو آوے سحر سیرِ گلستاں کو
لطافت، حسن و رنگینی، گل و شبنم سے لے جاوے

نئے قلیاں تلک کھانے کو اپنے منہ پسارے ہیں
بسر کیا اس زمانے میں کوئی ہمدم سے لے جاوے

غم دوری کے ہم بندے ہیں کہیے آفریں اس کو
سلامت جان و دل گر مصحفی اِس غم سے لے جاوے

484

هم تجھ سے جدا ہوتے ہی آنکھوں کو سِئیں گے　　جب تو ہی نہ ہوگا تو کسے دیکھ جئیں گے
غیروں کے گلے پر تری تلوار چلے گی　　ہم سامنے بیٹھے لہو کے گھونٹ پئیں گے
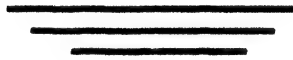
ترکیب بند مسدس

اے کہ صورت میں بنایا تجھے حق نے جوں ماہ کیوں نہ دیکھے سے ترے ہووے فزوں نورِ نگاہ
اُس کا مذکور ہے کیا، قصۂ یوسف در چاہ وصف کیجے تو ترے حسن کا، سبحان اللہ

گر بروے تو زلیخا مژہ ای وا می کرد
آنچہ در خواب ندیدست تماشا می کرد

پر عجب یہ ہے کہ کچھ تجھ کو نہیں اپنی خبر میری آنکھوں سے نہیں تجھ پہ پڑی تیری نظر
اس صفائی و صباحت پہ بھی اے رشکِ قمر حسن تیرا نہیں کرتا ہے ترے دل میں اثر

ہر نفس آئینہ می بینی و رُو می تابی
بندہ دارم عجب از تو، کہ عجب در خوابی

ہے زبس جان مری حسن ترا[1] تو بر تو دل کو زلفوں میں تری رکھتے ہیں زُہّاد رگرد
تجھ تلک آکے میں پہنچا تو ہوں باصد تگ ودو بے وفائی کو تری میں بھی ذرا دیکھوں تو

چارۂ کار من و دل نتوانی تا چند
حالِ من بشنوی و باز ندانی تا چند

جب سے پھینکی ہے ترے کاکلِ مشکیں نے کمند رہ گیا ہے یہ مرا آہوے دل، کر کے زقند
اسی باعث ہے مرے عزم کا گھوڑا جا بند مجھ سے یہ فعل عمل میں نہیں آتا، ہر چند

ہر شب اندیشۂ دیگر کنم و رائے دگر
کہ من از دستِ تو فردا بروم جائے دگر

1۔ حسن ترا، قیاسی تصحیح ہے

حال اپنا مجھے ہر دم بتر آتا ہے نظر اب یہ ڈر ہے کہ نہ ہو جائے کہیں اس سے بتر
بسترِ غم پہ پڑا رہتا ہوں، با دیدۂ تر غمِ فرقت میں غرض روز و شب و شام و سحر

سوزدم سینہ و دل تا کہ مرا جانی ہست
عشقِ بیدرد عجب آتشِ سوزانی ہست

اُبھرا پھرتا ہے تو واں کوچہ و بازار کے بیچ یاں رمَق بھی نہیں باقی ترے بیمار کے بیچ
جاں کھپی جاتی ہے یاں اپنی اِس آزار کے بیچ بیقرارانہ تری حسرتِ دیدار کے بیچ

شب کہ دل در گروِ یک نفسِ دیگر بود
ہر نگاہم نفسِ بازپسِ دیگر بود

حسرت آلودہ بھری ہے مری آنکھوں میں نگاہ نہ تو ہے نالے کی قوت، نہ رہی طاقتِ آہ
حالتِ نزع تو پہونچا ہوں میں اے غیرتِ ماہ میرے احوال سے اب تک بھی نہیں تو آگاہ

چند گوئی کہ ترا در دلِ بے حاصل چیست
در دلِ من ہوسِ تُست، ترا در دل چیست؟

پوچھ مت حال مرا اے صنمِ بے پروا حال ہو جائے گا تیرا متغیر بخدا
دل جفاؤں سے تری بسکہ بھرا ہے میرا غیر اس کے نہیں کچھ میرے تئیں بن آیا

باز خواہم گلہ از جورِ تو بنیاد کنم
زیرِ دیوار تو بنشینم و فریاد کنم

بھیجتا ہے تو ہر اک شخص کو پیغام و سلام میری قسمت میں نہیں لب سے ترے یک دشنام
آخرش عشق میں تیرے میں ہوا ہوں بدنام قحط قاصد کا نہیں، اِس سے تو مت رکھ نا کام

از تو دشنام و عتابے چہ شود گر برسد
یا سلامے بجوابے، چہ شود گر برسد

ہیں جفاؤں کے تری شہر میں آثار عیاں ایسی خوں ریزی سے مانگیں ہیں ملائک بھی اماں
نہ فقط میں ہی پڑا خون میں تڑپوں ہوں میاں جس طرف دیکھے کوئی نیک و بد و پیر و جواں

تا ز مژگانِ تو شوری بجہان افتادہ است
ستمے بر سر ہر کوچہ تپان افتادہ است

ڈر مری جان بتا دے مجھے کس کا ہے تجھے　　دیر کرنی غرض اِس امر میں بے جا ہے تجھے
تیغ خوش آب کی بیہودہ تمنا ہے تجھے　　قتل کرنے کا مجھے پھر جو ارادہ ہے تجھے

سرِ من قابلِ شمشیر ستم نیست بیا
آب در خنجر مژگانِ تو کم نیست بیا

ہے نظر بند مری دیدۂ قربانی میں　　تو نے جوں آئینہ رکھا مجھے حیرانی میں
ڈھونڈھوں جمعیتِ دل کیونکے پریشانی میں　　اب تلک چین پڑی ہے تری پیشانی میں

ازمن خستہ تو بیزاری و من می دانم
سرِ آزار دلم داری و من می دانم

گئی برباد ترے عشق میں سب دانائی　　دے کے دل تجھ کو میں مشہور ہوا سودائی
تس پہ ہوں وصل سے محروم، زہے رسوائی　　تو پھر اس پر بھی میاں از رہ بے پروائی

شاد کے گردم اگر دردِ دلم گوش کنی
نشوی بہ کہ کنی گوش و فراموش کنی

بسکہ صانع نے بنایا ہے تجھے رشکِ چمن　　گل سے عارض ترے بہتر ہیں تو غنچے سے دہن
نازکی ختم ہوئی تجھ پہ بس اے سیم بدن　　نرم اندام تو اتنا ہے کہ جوں شاخِ سمن

ہمہ اعضاے تو نازک بود الّا دلِ تو
ماندہ سنگے دمِ ایجاد مگر در گلِ تو

چشمِ بد دور ہے کچھ اور ہی عالم تیرا　　سچ ہے اے جان، مری تجھ کو مری کیا پروا
حال درماندگی اپنی کا کہوں ہائے میں کیا　　کھو کے دل اپنا، سر راہ میں تیری بیٹھا

زار می گریم و از دل خبرے پیدا نیست
وہ کہ از گم شدۂ من اثری پیدا نیست

ہم تو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈھتے اے زُہرہ جبیں دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں
لیک ہم لوگوں کی پرواہ ہے کب تیرے تئیں درمندوں میں تو اپنے ہمیں گنتا ہی نہیں

چند شرحِ طلب و حرفِ تمنا گوئیم
ما کہ باشیم کہ بر روے تو اینہا گوئیم

کیا ہوا ہم سے، کہ وہ راتوں کا ملنا چھوٹا کر دیا گردشِ گیتی نے ہمیں تجھ سے جدا
گو ترے پاس نہ اب بیٹھنے پاویں تنہا تو سلامت رہے، کچھ اِس کا نہیں اندیشا

گر نہ بینیم بخلوت رخ چون ماہ ترا
کس از ما نہ گرفتہ است سرِ راہ ترا

غیر کے ساتھ جلانے تو مجھے آیا ہے میں بھی جانوں ہوں کُڑھانے تو مجھے آیا ہے
اوپچی بن کے ستانے تو مجھے آیا ہے واہ کیا خوب منانے تو مجھے آیا ہے

خیز و دیگر منشین فتنہ میانگیز و برو
خویش را می کشم از دستِ تو، برخیز و برو

میں یہ جانا کہ بہت تجھ پہ ہوئے جور و ستم تنگ آیا ہے تو اب تجھ میں نہیں تابِ الم
زندگانی میں تری اور ہے باقی کوئی دم کوچہٴ یار میں بیٹھا ہوا با صورتِ غم

چند سر بر سرِ زانو نہی اے دل برخیز
اینک اینک بسرت آمدہ قاتل برخیز

تھا تصور کا میں اس شوخ کے جو دامن گیر دل سے آتی ہے بصد رنگ، زباں پر تقریر
روبرو ہے مری آنکھوں کے اُسی کی تصویر دیکھتا کیا ہوں میں ایسے میں کہ وہ ماہ منیر

زلف آشفتہ و خے کردہ وخنداں لب و مست
نیم شب بر سرِ بالین من آمد و نشست

شب کی صحبت کا کہوں یارو میں اب کیا احوال اب تلک ہے اُسی صحبت کا مرے دل پہ ملال
وصل کو اُس کے سمجھتا تھا میں ہر چند محال پر میسر جو ہوا، خواب تھا وہ یا کہ خیال

دستِ شوقے نکشیدیم کہ یار از در رفت
گلِ مقصود نچیدیم و بہار از در رفت

پسِ دیوار میں اب اُس کے جو جا کرتا ہوں طرفِ غرفہ و روزن ہی تکا کرتا ہوں
اپنی خواری پہ نظر پھر جو ذرا کرتا ہوں بھر کے اک آہ یہی شعر پڑھا کرتا ہوں

یاد روزیکہ دلم طالبِ دیدار نبود
منتے بر سرش از سایۂ دیوار نبود

میں تو خواہندہ نہ تھا حشمتِ کاؤسی کا تھا مجھے فکر سدا اپنی ہی محبوسی کا
رہ گیا شوق، سو وہ دل میں قدم بوسی کا ہم نشیں پوچھ نہ قصہؔ مری مایوسی کا

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

ہوں ازیں پیش تو میں عاشقِ رسوا مشہور یار کرتے ہیں ہر اک بزم میں میرا مذکور
ہو چکا کب سے سو یہ شیشۂ دل چکنا چور مجھ کو ان باتوں کے سننے کا نہیں اب مقدور

دوستان از سخن عشق کبابم مکنید
مکنید این سخن و خانہ خرابم مکنید

ہم دل آزردوں کو کیا سیرِ چمن سے سروکار گو بہ صد رنگِ دگر پھولے پھلے یہ گلزار
فائدہ کیا ہے جو تم کرتے ہو اتنے اصرار مگر اِس بات سے واقف نہیں، ایامِ بہار

عہد کردیم کہ بے دوست بہ صحرا نہ رویم
بے تماشہ گہہِ رُدیش بہ تماشا نہ رویم

دلِ دیوانہ نہ سمجھا مرے سمجھانے سے فیض پایا نہ کچھ اپنے سے نہ بیگانے سے
آیا میں شہر میں نومید ہو ویرانے سے مصحفی کچھ نہ ہوا کعبہ و بت خانے سے

حالیا مصلحتِ خویش در آن می بینم
کہ کشم رخت بہ میخانہ و خوش بنشینم

ترجیع بند مسدّس

بخت نے اُس کی مدد تو کی تھی اے رشکِ بہار پر کرے کیا تو، جو ہو جاوے وہی بے اختیار
دیکھ تو لے اُس کی دست اندازیِ بوس و کنار گھر کے جانے کی اُسے تکلیف کی جب بار بار
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

شوق نے آ کر کیا تھا سر پہ اُس کے جو ہجوم دست و ساعد رو و مو لیتا تھا تیرے چوم چوم
بوسہ بازی کی مچا دی تھی جو دیوانے نے دھوم اتنے میں تو درمیاں لایا جو رنجش کے رسوم
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

حال پر اُس کے ہوئی تھی لطف کی تیری نظر ورنہ بخت ایسے کہاں رکھتا تھا یہ خستہ جگر
لیک گستاخی لگا کرنے وہ جب ہو کر نڈر اور لگا رخ پر ترے آنے خجالت کا اثر
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

ہاتھ اس کا جب گیا تھا تیرے بیروں آستیں شرم کے مارے رکھی تھی تو نے زانو پر جبیں
تھی مقدر لیک نومیدی ہی جو اُس کے تئیں آخرش بے جرأتی سے اپنی ہو کر شرمگیں
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

جب کہ پھرتا تھا بدن پر تیرے پیارے اُس کا ہاتھ تھرتھراتی تھی پڑی جوں موجِ دریا تیری گات
بے نصیبی کی و لے تجھ سے کہوں کیا اُس کی بات یک دگر کی کشمکش ہی میں جو آئی آدھی رات

رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

گرچہ وہ مہماں ترا تھا اور تو مہماں دار تھا کامِ دل دینے پہ اُس کے، آپ تو تیار تھا
لیک جوشِ شوق سے وہ بھی جو حد ناچار تھا اور بہت رہنے میں اُس کے تیرے تئیں آزار تھا
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

تو جو اُس کے سامنے بیٹھا تھا اے رشکِ بہار دل میں اُس کے ہجر کے سارے کُھبے تھے خار خار
لیک جب رنجش پہ ٹھہرا صحبتِ شب کا مدار چارپائی سے اُتر اور بھر کے آہ شعلہ بار
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

دوش پر اُس کے پڑا تھا پرتو خورشید وصل کر کے آیا تھا وہ اپنے دل میں ہی امیدِ وصل
کر گئی پہلو تہی، شب اُس سے جب ناہیدِ وصل ہو کے تجھ سے مہ جبیں سے عاقبت نومیدِ وصل
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

یک بہ یک اُس نے اُٹھا کر پردہ شرم و حیا جو نہ کہنا تھا ترے کانوں میں وہ جُھک جُھک کہا
باوجود ایسی مروّت کے، تو اے نازک ادا پاس سے اس کے خفا ہو کر کے جس دم اُٹھ گیا
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

اُس نے چاہا تھا رہوں گا رات ساری تیرے پاس کر دیا تھا شوقِ مشتاقی نے اُس کو بے حواس
ڈر سے بدنامی کے، پر تُو نے جو رکھا اُس کا پاس دیکھ کر مرضی تری اور وصل سے ہو کر نراس[1]
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پانو تلک تیری بلائیں لے گیا

1۔ نراس (ہندی) = نِراش، ناامید

ترجیع بند

تقصیر ہوئی مجھ سے جو میں نے تجھے چاہا   یا اپنی زباں سے تری خوبی کو سراہا
نکلے کسی صورت تو مرے دل کی اُپاہا   مقدور زیادہ نہیں تو جلوہ پناہا

لگ جا تو گلے ہی سے مرے، اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

آشوق میں، ہاتھ اپنا چلایا جو میں تجھ پر   جوں پنجۂ شاہیں وہ گرا سینہ کے اوپر
لیکن نہ ہوا وصل ترا اُس کو میسّر   آ، جانے دے اِس بات کو، اب پیار سے آکر

لگ جا تو گلے ہی سے مرے، اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

کیا لطف رہے دل کی ہوس دل ہی میں میرے   حیرت زدہ بیٹھا رہوں میں سامنے تیرے
آخر تو میں آتا ہوں دو وقتی ترے ڈیرے   جس وقت کہ قابو ہو ترا سانجھ سویرے

لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

کب تک میں دل اپنے ہی میں کھا کھا کے رہوں جوش   چوں غنچہ رہیں ڈر سے ترے لب مرے خاموش
آخر تو کیا ہے مجھے مدھ نے تری مدہوش   اے راحتِ جاں جوں مہِ نو کھول کر آغوش

لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

میں غم زدہ ڈر سے ترے پاتا نہیں قابو ہے مست مئے عشق تری نرگسِ جادو
ہو گو کہ خجالت سے عرق جلوہ فزا رو صدقے میں تری شرم کے، ہاں اے بُتِ خوشخو
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

حیرت زدہ ہوں دیکھ کے صورت کو میں تیری ہوتی نہیں دیدار سے تیرے مجھے سیری
میں ہاتھ لگاؤں تجھے، طاقت نہیں میری از بہرِ خدا تو بھی ٹک اک کر کے دلیری
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

چھاتی پہ نہ رکھ دستِ ردّ اربابِ وفا کے یک بار نکل تو کہیں پردہ سے حیا کے
کیا دیر میں ہے فائدہ سو کام خدا کے انگڑائیاں لیتا ہوا مجھ پاس ٹک آ کے
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

وہ دل کہ کیا تیری طرف سے میں اُسے صاف سینے میں دبا جائے ہے چوں پنبہء ندّاف
جس وقت کھُلا دیکھوں ہوں تیرا شکمِ صاف گذرے ہے غضب مجھ پہ صنم، از رہِ الطاف
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

تا چند رہوں منتظرِ لطفِ نمایاں کر حرفِ نوازش سے ذرا وا، لبِ خنداں
تا خانہ ترا مجھ پہ نہ ہو صورتِ زنداں ہے یہ بھی کوئی جائے حیا، اے بُتِ ناداں
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

تو ہی مجھے کھولے تو کھُلوں ورنہ میں غمناک ہوں زخمِ جدائی سے ترے بادلِ صد چاک
کیا جانیے پھر کیا کرے یہ گردشِ افلاک فرصت یہ غنیمت ہے کوئی دم، بُتِ چالاک

لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

جس دن سے ہوا ہے وہ ترے حسن پہ مائل ∗ سمجھے ہے صنم اپنے تئیں عاشقِ بیدل
دیکھا تو سوا شرم کے کوئی نہیں حائل ∗ اس واسطے ہے مصحفی اِس شعر کا قائل
لگ جا تو گلے ہی سے مرے اور نہیں تو
لوں بوسے ہی چٹ چٹ میں ترے اور نہیں تو

مثمن ترکیب بند

اگرچہ تجھ سا زمانے میں کیا نہیں کوئی ∗ پہ غور کیجیے تو صبر آزما نہیں کوئی
بایں کرشمہ و ناز و ادا نہیں کوئی ∗ ہزار نقشے ہیں، ایسا بنا نہیں کوئی
تو ہی ہے بہتریں صنعِ خدا، نہیں کوئی ∗ تری شبیہ میاں دوسرا نہیں کوئی
بصورت تو بتے کمتر آفریدہ خدا
ترا کشیدہ و دست از قلم کشیدہ خدا

ترے جمال میں ہے چشمِ عقلِ کُل حیراں ∗ مقرّباں جنابِ خدا ہیں سب نگراں
یہ حسن اور یہ لطافت ہر اک بشر میں کہاں ∗ میں تجھ پہ ہوں نہ بھلا کس طرح بلا گرداں
دیا ہے دل تجھے بس یک نگہ میں میں نے میاں ∗ بیاں میں کیا کروں خوبی تری ہے سب پہ عیاں
چو جعدِ پُر گُہرت کہکشاں نمی بینم
بصورت تو مہِ آسماں نمی بینم

تری ہر ایک ادا گرچہ تیغ قاتل ہے ∗ دلِ تپیدہ بھی پہلو میں رشکِ بسمل ہے
یہی تو مجھ کو تری دوستی سے حاصل ہے ∗ میں سر کو پٹکوں ہوں حسرت سے، غیر واصل ہے
مرے کہے میں نہیں یہ، میں کیا کروں دل ہے ∗ غرض کہ مجھ کو تو اب ہر طرح سے مشکل ہے

نہ با تو دستِ ہوس در کمر توان کردن
نہ آرزوے تو از سر بدر توان کردن

خبر ہے تجھ کو بھی کچھ اے ستمگرِ خوں خوار　کہ کھینچتا ہوں میں کس کس طرح کا اب آزار
نہ صبر دل میں ہے میرے، نہ جان میں ہے قرار　بنی ہے شکل مری، جیسے صورتِ دیوار
میں حال اپنا بھلا تجھ سے کیا کروں اظہار　ملا نہ اب کے بھی تو یاں تلک کہ آخر کار
جدائی تو ہلاکم در اشتیاقِ تو کرد
تو بامن آنچہ نہ کردی غمِ فراقِ تو کرد

پھرا کرے ہے تو گلیوں میں پی کے مے دن رات　کٹے ہے اہلِ خرابات میں تری اوقات
کسی کی خاک نہیں تجھ کو فکرِ موت و حیات　تری بلا سے کوئی گو ہو موردِ آفات
زباں سے نکلی مری آمدِ سخن اک بات　وگرنہ میں ترے حق میں کہوں گا کچھ، ہیہات
خدا بہ شکوہ زبانِ من آشنا نہ کند
من و شکایت و انگہ ز تو، خدا نہ کند

کوئی ادھر سے طرف اُس گلی کی جاتا ہے　جو دیکھتا ہو کوئی اُس طرف سے آتا ہے
کوئی کھپائے ہے جی، کوئی دل لگاتا ہے　کوئی اشارہ کرے ہے، کوئی بلاتا ہے
غرض کہ ہر کوئی اب داد تجھ سے پاتا ہے　بھلا تو ایک مجھی کو سدا ستاتا ہے
ز ہر طرف نگرم می رسد خریدارے
بود بہ کوے تو ہر روز، روز بازارے

اگر چہ اتنا تو زیں پیش تو نہ تھا ظالم　کچھ اِن دنوں ہی میں بے طرح ہو گیا ظالم
جو ظلم ہو سکے کر مجھ پہ تو بھلا ظالم　رکھا ہے نام ترا میں نے آشنا ظالم
نکال تیغِ جفا اور مرے لگا ظالم　جفا و جور سے تو ہاتھ مت اُٹھا ظالم
ہنوز صبر ازین بے قرار می آید
ہنوز از دلِ افسردہ کار می آید

کہاں تلک میں کروں اپنے بخت کا شکوا میں اس کے ہاتھ سے، ہے ہے ستم سہے کیا کیا
کبھی تو زہر میں کھایا، کبھی کنوئیں میں گرا یہ باتیں ہو چکیں سب، اب نہ پوچھ حال مرا
تو اُس کے کوچے میں باحالِ خستہ ہوں بیٹھا پہ یہ بھی اُس سے تو جا کر کوئی نہیں کہتا

فتادہ بر سر کوے تو ناتوانے ہست
رسیدہ بر لبش از ضعف نیم جانے ہست

مثنوی گرما

کیا کہوں سوزشِ ہوائے تموز — اِن دنوں ہے ہوا بھی طاقت سوز
سردی عالم سے کر گئی ہے کنار — موسمِ گل ہے اور شروعِ بہار
حُوت[1] میں آفتاب آیا ہے — مرغ و ماہی کے تیئں جلایا ہے
مارے گرمی کے سائے جلتے ہیں — اِس ہوا میں درخت پھلتے ہیں
پھول سارے گئے ہیں یوں مرجھائے — بھوکے پیاسے کا جیسے منھ سُت[2] جائے
ان دنوں باغ بھوت خانہ ہے — سُرب[3] و باروت کا خزانا ہے
آتشِ گل زبس کہ ہے سرکش — اُس پہ لالہ ہوا ہے میر آتش
ہیں صنوبر کے تار شمع کے تار — سرو آتش فشاں ہے مثلِ چنار
وہ جو دستِ چنار بالا ہے — سو وہ آتش کا پنج شاخا[4] ہے
دانۂ نار سب ہیں چنگاری — آگ کے پھولوں کی ہے گلکاری
گل کے جو تمتما رہے ہیں گال — دال ہے تَب[5] پہ اُس کا چہرۂ لال
شاخِ نرگس نے قد کیا ہے علم — بن دیے آگ چھوٹے ہے یہ قلم[6]
کیا عجب شعلہ بن کیے ہی قبول — ہووے گلدستہ ہاتھ میں ہتھ پھول
ٹہنیاں ہیں جو خشک اور کڑیاں — آگ دیجے تو چھوٹیں جوں نڑیاں[7]
بسکہ طبعِ ہوا ہے آتش بیز — شاخِ گل تک چمن میں ہے گلریز

1۔ حوت (مچھلی) برج حوت Pisces جسے ہندی میں "مین" کہتے ہیں
2۔ منھ سُت جانا (روزمرہ) رنگ اتر جانا 3۔ سُرب = سیسہ
4۔ پنج شاخہ۔ آتش بازی کی ایک قسم 5۔ تَب = بخار
6۔ قلم = آتش بازی کی ایک قسم 7۔ نڑی = آتشبازی کی ایک قسم

جا پڑے ہیں اِدھر اُدھر یک بار — پتّے پھولوں کے اُڑ کے مثلِ شرار

کوئی طاؤس ہے جو یاں دلکش — ہے وہ طاؤسِ بازیِ آتش

سیخ کی شکل سروِ دلجو ہے — اُس پہ قمری کبابِ کوکو[1] ہے

کوئی تنکا جو اُڑ کے گل پہ پڑا — جل اُٹھا وہ دیا سلائی سا

شعلہ جاروبِ صحنِ گلشن ہے — خس سے خالی چمن کا آنگن ہے

خشک و تر سب نہال جلتے ہیں — کفِ افسوس پتّے ملتے ہیں

جیسے گلخن[2] کی ہووے گرم رَماد[3] — سائے جلتے ہیں دھوپ سے بھی زیاد

بھول کے سائے میں جو جا بیٹھے — کود کر دھوپ میں پھر آ بیٹھے

پانو سائے پہ جو رکھے ناگاہ — کاٹ کھاوے وہ مثلِ مارِ سیاہ

ہیں سِلیں پتھروں کی گرم تمام — جن پہ پاے نگہ کرے نہ قیام

پھول کھاوے جو مرغِ آتش خوار — شکل گُل گیر اُس کی ہو منقار

آگ پانو سے جو بجھاتے ہیں — دیکھ پھولوں کو جی چھپاتے ہیں

جعفری[4] نے دیا ہے جلوہ روز — گُلِ سُوری[5] بنا ہے شب افروز

شب کو ماہِ فلک میں ہے وہ تاب — جیسے روشن کرے کوئی مہتاب[6]

لگتے ہیں آسماں پہ یوں تارے — دگدگاتے ہیں جیسے انگارے

نَسرِ طائر ہو جل کے کیوں نہ کباب — بان[7] سا چھوٹتا ہے تیرِ شہاب

شفقِ شام کی جو ہے تحریر — برق ہے آسماں کی دامن گیر

وے جو صحرا میں ہیں وُحوش و طیور — گرمی نے اُن سے بھی لیا ہے قصور[8]

گینڈے ڈھالوں سے تن کو ڈھانپتے ہیں — شیر گرمی کے مارے ہانپتے ہیں

1۔ کبابِ کوکو = کباب کی ایک قسم 2۔ گلخن = حمام میں پانی گرم کرنے کا چولھا، سقایہ

3۔ رَماد = راکھ 4-5۔ پھولوں کے نام ہیں 6۔ مہتاب = پھلجھڑی

7۔ آتش بازی کی ایک قسم 8۔ قصور = جرمان

مرغ آئے ہیں گھونسلوں سے نکل　　کہ بسیرے میں آ گیا ہے خلل
باغ بے آب، و خشک ہیں تالاب　　دیکھتی نئیں زمین سبزہ بخواب
بنت کوئیں پر چرس[1] پڑے ہیں چھوٹ　　کہ کنووں کے گئے ہیں پانی ٹوٹ[2]
قدِ آدم جنھوں میں تھا پانی　　اُن سے مشکل ہے بوند بھی پانی
ہے تَوے[3] پر کنووں کے یہ تف[4] وتاب　　ہوگیا ہے تَوے کی بوند سب آب
پوچھ مت کچھ مسافروں کا حال　　اُن پہ لایا ہے آفتاب زوال
وے لوئیں گرم گرم آتی ہیں　　چھاتیاں جن سے جھلسی جاتی ہیں
کوئی جاتا ہے گر کِسی کے گھر　　مثلِ مستسقی[5] آب پر ہے نظر
سبزہ ہے کوہ و دشت میں نایاب　　ہاں مگر خضر پھر کرے سیراب
نہیں گرتا ہے اُس سے اک قطرا　　آسماں بن گیا ہے لوہے کا
ہم کو کب فکر تشنگی کی ہے　　موت ہے سو ٹٹیہری[6] کی ہے
سادہ سبزے سے دشت وصحرا ہے　　سبزہ ہے، سو وہ اک جَوال[7] سا ہے
آکے خشکی نے جو کیا ہے اثر　　پپڑیاں بندھ گئی ہیں ہونٹوں پر
بعضے پیاسوں کے کنٹھ خشک ہوئے　　بیچ صحرا کے تشنہ لب وہ موئے
بعضے گرمی کی تَونس[8] نے مارے　　بعضے بے آسرے ہو بیٹھ رہے
بعضوں کو بے کلی سے لگ گئی ڈاک[9]　　بعضے ہونے لگے چنک[10] سے ہلاک
حلق بے آبی سے پُر ازغم ہے　　جیٹھ کیا، یہ مہِ محرم ہے

1۔ چرس = کنوئیں سے پانی کھینچنے کے بڑے ڈول 2۔ پانی ٹوٹنا (روزمرّہ) پانی کی سطح نیچی ہو جانا
3۔ تَوا = کنوئیں کی منڈ پر جس پر پانو رکھ کر پانی بھرتے ہیں 4۔ تف وتاب = گرمی، تمتماہٹ
5۔ مُستسقی = جلندھر کا مریض 6۔ ٹٹیہری = ایک پرندہ جس کی آواز کے لیے کہا جاتا ہے کہ پیاس کی وجہ سے فریاد کرتا ہے 7۔ جَوال = بورے سینے کا سُوا 8۔ تونس (بروزن دھَونس) = تپش (روزمرہ)
9۔ ڈاک لگنا (عوامی) اسہال 10۔ چنک = جسم میں سوئیاں سی چبھنا

ہیں جو اندارا[1] چاہ یاں ان کے مارے گرمی کے کھل گئے ہیں چہے[2]
کون کرتا ہے چہ[3] بچوں کا حساب حوض و تالاب ہیں سبھی بے آب
مصحفی کیا کروں میں آگے رقم
خشکی دوڑی ہے تا زبان قلم

1۔ اندارا = پکّا کنواں 2۔ چہے = چھوٹے سوتھ

3۔ چہ بچہ = (بچہ میں تشدید نہیں ہے) چھوٹا کنواں، پہلے گھروں کے باہر ایک چھوٹا حوض ہوتا تھا جس میں گھر کا استعمال شدہ پانی آ کر گرتا تھا۔ گھر کے اندران میں استعمال کا پانی بھی ہوتا تھا۔

مثنوی در افراطِ آتش

سوزِ آتش ہے کس قدر اِس سال
جس سے ہے دل پہ مرد و زن کے ملال

بانس سے بانس جو کھڑکتا[1] ہے
آگ کا شعلہ اک بھڑکتا ہے

گھر غریبوں کے جلتے آتے ہیں
ہر طرف لوگ بھاگے جاتے ہیں

یوں پتنگے[2] اُڑیں ہیں یکباری
تو کہے، ہے ہَوا میں پھلواری

جب کہ چھپر کسی کا جلتا ہے
کفِ افسوس شعلہ ملتا ہے

کوئی کاندھے پہ رکھ کے مشکیزا
آب پاشی کو جائے ہے دوڑا

کوئی اُس پر گھڑا بہاتا ہے
کوئی ہاتھوں ہی سے بجھاتا ہے

گھر غریبوں کے ہو رہے تھے جو پھُونس
دن دیے آگ نے لیے ہیں مُوس[3]

ہائے کیا حال میں کہوں ان کا
خانہ باشی شعار ہے جن کا

دم خفا ہو کے پردہ پوش موئیں
چکیاں جل کے سُرمہ سنگ[4] ہوئیں

تھی جو گھر میں کسی کے کوئی تلوار
سو وہ بجلی کی ہو گئی یک بار[5]

جس جگہ ہے پراچے[6] کی دوکاں
آگ ناگاہ لگ گئی ہے وہاں

گھر کو کردے ہے اُس کے جوں گلزار
اُس کو آتش دکھائے ہے یہ بہار

ہیں جو بیوپاری کرتے پھرتے ہیں آہ
منڈیاں ہوگئیں ہیں خاک سیاہ

1۔ کھڑکنا (روزمرہ) ٹکرانا 2۔ پتنگے (روزمرہ) آگ کی اُڑتی ہوئی چنگاریاں 3۔ مُوسنا = ختم کر دینا دن دیے کی جگہ دن دہاڑے بھی کہتے ہیں، یعنی کھلے بندوں 4۔ سرمہ سنگ = وہ پتھر جس سے سرمہ بناتے ہیں 5۔ یعنی آگ میں جل کر بجلی کے کوندے کے مانند ہوگئی 6۔ پراچے کی دکان = جنرل اسٹور (روزمرہ)

آگے آیا ہے اُن کے کردۂ خویش گھاس بھُس والے ہیں سبھی دل ریش
تا بہ ہیزم فروش و پنبہ فروش سر کو زانو پہ رکھ گئے ہیں خموش
اب اگر جاکے اس پہ کیجے نگاہ کوئلے والے کی دوکاں ہے سیاہ
ہے غرض جس فریق کا انساں اس کی بیداد سے ہے شکوہ کناں
سبھی تیلی تنبولی اور بزّاز کانسہ گر، مئے فروش، آتش باز
اس کے ہاتھوں جلے ہوئے ہیں سبھی نہیں بیداغ اک غریب کا جی
پا کے اُن کو بھی سوختہ مغموم دھوبیوں سے بھی سنیے اس کی دھوم
سہا جاتا ہے ہَول[1] سے دریا ماہی پڑھتی ہے آب میں قُلنا[2]
آگ نے بسکہ سر اُٹھایا ہے ایک عالم کا جی جلایا ہے
ایک کے گھر سے جوں ہی شعلہ اُٹھا جا کے گھر دوسرے کے پھول پڑا[3]
گر لیا اُس کے تئیں بجھا، تو خیر نہیں تو اور بھی ہوئی ٹک سیر
ایک کے گھر جو لگتی ہے آتش اور اُٹھتا ہے شعلۂ سرکش
دوسرا چڑھ کے اپنے چھپّر پر اُس کو پانی چھڑک کرے ہے تر
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار گھر کے گھر ہوگئے ہیں یاں فی النّار
لگی کیا آگ فتنہ اک جاگا شُہدا[4] گھر میں سے گٹھری لے بھاگا
لوگ آکر کے جو پڑے سب ٹوٹ مچ گئی گھر میں اک مزے کی لوٹ
کوئی کہتی ہے ہائے رے میں موئی کوئی پھرتی ہے بلبلائی ہوئی
کوئی تکتی ہے منھ کو شوہر کے کوئی ساتھ اُٹھ چلی برادر کے
کوئی ہمسایہ میں چھپی جاکر گر پڑی ٹھوکر اک کوئی کھا کر
سر سے برقع کسی نے پھینک دیا اُٹھ مقابہ کسی نے ہاتھ لیا

1۔ ہَول = خوف، اندیشہ 2۔ قرآن کی آیت قُلنا یا نارُ کُونی بَرداً و سَلاماً علی اِبراھیم [XXI:69] کی طرف اشارہ ہے 3۔ پھُول پڑنا = آگ لگنا 4۔ شُہدا = بدمعاش

رہ گئی کوئی در کے بیچ اڑی　　کوئی اُٹھی جو گرم گر ہی پڑی
سن کے جوں ہی یہ شور ہمسائے　　مل کے آتش بجھانے کو آئے
بعضے رستے کے جانے والے بھی　　دیکھ کر رک گئے یہ شعلہ زری
اس بہانے سے واں تلک آئے　　حسن و آتش نے جلوے دکھلائے
حسن و آتش کی طرفہ سیر ہوئی　　نہ جلا جی کسی کا خیر ہوئی
روے زیبا پہ مت نظر کر تو　　آتشِ حسن سے حذر کر تو

آگ کہتی ہے جلوہ میرا دیکھ
مصحفی گھر جلا تماشا دیکھ

مثنوی ہجوِ مکان

اپنے رہنے کو جو ملا ہے مکاں　　ہے بعینہ وہ صورتِ زنداں
نہ تو روزن نہ اُس میں جالی ہے　　دن دیے جیسے رات کالی ہے
اِس میں مطلق نہیں ہوا کا گزر　　سیر یلدا[1] کی [illegible] کرے ہے نظر
جاے[2] بول اُس کے در کے آگے ہے　　دوزخ اک میرے گھر کے آلے ہے
بوے ناخوش جو اُس سے آتی ہے　　جوہرِ مغز کو جلاتی ہے
تس پہ جالوں کی کیا کہوں میں بات　　تو کہے چھت میں چھا رہی ہے رات
مکڑیوں نے جو گھر بنائے ہیں　　تو نپے کاٹ کر دکھائے ہیں
خاکباری ہے اس کی چھت کا کام　　خاک اس سے جھڑا کرے ہے مدام
چارپائی جو میں اُٹھاتا ہوں　　ایدھر اُودھر اسے بچھاتا ہوں

1۔ یلدا = موسم سرما کی طویل ترین رات　2۔ جاے بول = پیشاب خانہ

بے کدر[1] جا ذرا نہیں ملتی
خاک چھانی صفا نہیں ملتی

دل کو کاوش ہی رات اور دن ہے
بسکہ پشتوں کی اِس میں بھن بھن ہے

الغرض اس میں مجھ کو ہر صورت
رہتی ہے مُوذیات سے صحبت

کبھی چینٹی بدن کو کاٹے ہے
کبھی دیمک ہی پائے چاٹے ہے

چارپائی جو ہے ہمارے پاس
کھٹملوں کی رہے ہے اُس میں نواس[2]

گھونس نے کر لیے زمیں میں سوراخ
مُوشکِ کور[3] پر ہے عرصہ فراخ

گر نظر جائے جانبِ دیوار
نظر آتی ہے چیونٹیوں کی قطار

گھُن نے پایوں کے تئیں جو ہے چاٹا
خوردہ[4] اُس کا چنے کا ہے آٹا

رات دن جی صفا کو ترسے ہے
اپنی قسمت کی خاک برسے ہے

اس میں جتنے کہ ہیں لکھے اشعار
سب وہ لکھے گئے بخطِ غبار

خاک ان پر زبس پڑی پیہم
تیرِ خاکی ہوئے تمام قلم

گرد جزدانوں پر ہے دو دو تُسو[5]
ہے قلمداں اَٹا پڑا یک سو

گھر میں میرے جو کوئی آتا ہے
اپنی صورت کو بھول جاتا ہے

مصحفی جائے سینہ چاکی ہے
گھر نہیں یہ تو برجِ خاکی ہے

1۔ بے کدر = صاف ستھری 2۔ نواس= رہنے کی جگہ 3۔ موشک کور، (موشکور)= چمگادڑ
4۔ خوردہ = بُرادہ 5۔ تُسو = ناپنے کا چھوٹا معیار (جیسے سنٹی میٹر)

مثنوی کھٹمل

کھٹملوں کی زبس کہ ہے افراط
تلخ ہے اُن سے اپنا خواب و نشاط

کافروں نے یہ سر اٹھایا ہے
سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے

کیا کہوں ان گزِندوں کی زِشتی
کہ مجھے کردیا ہے خارشتی

ہے پھنکی آگ سی بدن میں تمام
پڑگئے ہیں دَدوڑے[1] تن میں تمام

بسکہ بے چین ہوں میں ان کے ہات
نیند آتی نہیں ہے ساری رات

دمبدم کروٹیں بدلتا ہوں
ایدھر اودھر پڑا اُچھلتا ہوں

پائچے میں کبھی گھُس آتے ہیں
کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں

اک خلش ساری رات اِزار میں ہے
آنکھیں بند، اور ہاتھ ازار میں ہے

گاہ رو، گہ جبیں کھجاتا ہوں
گاہ سر، گہ سُریں کھجاتا ہوں

مارتا جاتا ہوں اِنھیں جوں جوں
کان پر اِن کے رینگتی نہیں جوں

اِن کے مَلنے سے وقتِ بدخوابی
چٹکیاں ہوگئی ہیں عنابی

بلکہ غصہ سے جو دیا ہے فِشار[2]
سرخ ناخن ہیں جوں لبِ سُوفار[3]

ان کی گردن پہ خون میرا ہے
خوں مری اُنگلیوں پہ ان کا ہے

اس سے رنگیں کوئی نہ تھا مضموں
باندھا میں اُنگلیوں پہ ان کا خوں

1۔ دَدوڑے (روزمرہ) کاٹنے کے نشان، سوجن 2۔ فِشار = دبانا

3۔ سُوفار = تیر کا اگلا حصہ، اُس کا پھل

گو کہ اب پہنچے سب بدن کو گزند ہوگئیں انگلیاں تو فندق بند
لوہو پی پی زبس ہوئے موٹے ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے
لیکن اس بت پہ یہ سبھی خنّاس منہ میں رکھتے ہیں سوزن الماس
ان کے نیشوں سے ہے مری فریاد میں ہوں اور کتنے نشترِ فصاد
ہر سرِ مو پہ میرے ایذا ہے یعنی اِن موذیوں کا بلوا[1] ہے
گرچہ اک قطرہ مجھ میں خون نہیں لیک یہ خالی از جنون نہیں
تلے کروٹ کے آ جو جاتے ہیں ووہیں جھلا کے کاٹ کھاتے ہیں
کچھ مرا اُن سے بس نہیں چلتا میں تو رہتا ہوں ہاتھ ہی ملتا
کاٹتا ہے جو کوئی آ کے کہیں بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑوں ہوں ووہیں
بسکہ ہے اِن دنوں انھوں کا وفور لپٹنے کا تو کیجے کیا مذکور
اِن کے ہاتھوں سے ہے مجھے اے یار بیٹھنا چارپائی پر دشوار
پایوں میں جو نواس ان کا ہے اس کا ہر پایہ بھڑ[2] کا چھتا ہے
الغرض شام سے ہو شب بیدار کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار
مارے جو موٹے موٹے چن چن کر چھینٹ[3] کی تھان بن گئی چادر
گھسے دیوار پر جو کر کے تلاش کر دیا گھر کو خانۂ نقاش
نہ زمیں ہی میں خاک مال ہوے گھر کے کولے[4] تمام لال ہوئے
نہیں مرتے ہیں تو بھی یہ بدذات کیا انھوں نے پیا ہے آب حیات
کوئی کیونکر کرے اِنھوں کا شمار پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار
ہے بجا، بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد کہیے راون کی اِن کو گر اولاد
فائدہ ان سے کچھ نہیں زنہار غیر اس کے، کہ ہوں میں شب بیدار

1۔ بلوا = یورش، حملہ 2۔ بھڑ = زنبور 3۔ چھینٹ = کپڑا جس پر گل بوٹے ہوں
4۔ کولے (بہ فتح اول) = گوشے (روزمرہ)

یہ سمجھ کر کہ لوگ جاگے ہیں — چور بھی اِن کے ڈر سے بھاگے ہیں
اس طرح بسترے پہ ہوویں دَواں — جس کو پاوے نہ اسپ کا جَولاں
دوڑنے میں ز بسکہ ہیں چالاک — میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک
آ چڑھیں ہیں جو میرے ہاتھ کہیں — راہ لیتے ہیں آستیں کی وہیں
کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں — گھائیوں[1] میں سے نکلے جاتے ہیں
ہے زباں ان کی جوں سِناں سر تیز — یاد ہے تب تو اِن کو جنگِ گریز[2]
ان کی بو سے دماغ عاجز ہے — بلکہ دُودِ چراغ عاجز ہے
بوریے پر جو بیٹھیے کوئی دم — واں بھی اِن کا لگا رہے ہے غم
بے خبر وہیں کاٹ کھاتے ہیں — کب یہ بدبخت ہاتھ اُٹھاتے ہیں
میں بھی از بسکہ اِن کا ہوں استاد — قتل کا اُن کے گُر ہے مجھ کو یاد
چارپائی کو جب بچھاتا ہوں — چادر اک اس پہ کھینچ جاتا ہوں
بعد ازاں رکھ سرہانے اک تکیہ — سر کو رکھ اُس پہ سو رہوں ہوں ذرا
اتنے میں سونگھ کر یہ بوے بدن — جوں ہی با صد ہزار حیلہ و فن
فرشِ چادر پہ، ہوکے پُر بے غم — چلنے لگتے ہیں ایک دَر پئے ہم[3]
میں بھی جلدی دیا منگا کے وہیں — بھس بناتا ہوں خوب ان کے تیئں
گرچہ پاتے رہے ہیں نت مالش — پر مری اِن سے ہے وہی نالش
وہی راتوں کو جاگنا ہے ہنوز — اور وہی خواب، صبح دم ہر روز
ان کی ایذا سے میں ہی کچھ نہیں دنگ — عرصہ کرمِ کتاب پر بھی ہے تنگ
یعنی مجھ پاس ہیں جو کچھ اجزا — دخل ان میں بھی کافروں نے کیا
اُن میں جا کر ہوئے تو ہیں یہ بند — لفظ و معنی کے تیئں نہ پہنچے گزند

1۔ گھائی = دو انگلیوں کے درمیان کھلی جگہ (روزمرہ) 2۔ جنگ گریز = گوریلا جنگ
3۔ ایک کے پیچھے ایک

اور قلمداں میں جو گھسے جا کر کیا یہ دیں گے مرے قلم کو ضرر
سو تو اُس کی زباں ہے ایسی تیز جس سے کرنے لگیں بریز بریز
خاصہ ہنگام ہجو کہنے کے الاماں مانگتے ہیں سب جس سے
بیش و کم چلتی ہو زباں جن کی چاہیے ہجو ہی کریں ان کی
دشمنِ جاں نہ مصحفی کے ہیں
تشنۂ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

مثنوی در بیان شدت سرما

اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور ڈھانپ کر منھ کو رہ گئے ہیں تنور
دیگداں گھر میں سب کے ہیں بیکار یعنی آتش کا سرد ہے بازار
آئے ہے ہو کے زمہریر ہوا ہے جہنم زمانہ سردی کا
بن رہے ہیں جو یخ ظروف تمام برف خانہ ہے خانۂ حمام
عوض آتش کے ان دنوں اے یار خاک کھاتا ہے مرغ آتش خوار
شمع تک جا کے کیا کرے گلگیر شمع تو خود ہے بن رہی کشمیر
بیچ پانی کے، جاڑے کے مارے بچۂ بط ہیں یخ بچے سارے
صاحبِ لقوہ جی سے ہے نومید کانپتا نکلے ہے سحر خورشید
کہوں[1] چمکی جو اک ذرا اخگر پھر جو دیکھا تو تھی وہ خاکستر
دل میں سردی سے ہووے ہے اب درد آتشِ عشق ہوگئی ہے سرد
آہ و نالے میں وہ کہاں گرمی دہر سے ہوگئی نہاں گرمی

1۔ کہوں بجائے کہیں (عوامی)

ان دنوں وے جو عشق کرتے ہیں دم بدم آہِ سرد بھرتے ہیں

برف باری ہے اب سحاب کا کام نہیں اِس رُت میں آفتاب کا کام

ابر ہو دگلہ[1] پوش آتے ہیں دانت بجلی کے کڑکڑاتے ہیں

دیکھ پھیکا سا آفتاب کا رنگ آتشِ لعل ہے نہاں در سنگ

جوہری گر کرے اب اس پہ نظر پنبہ دانہ ہے دانۂ گوہر

باغِ ہستی میں دیکھ کر یہ ہوا سیب کیا کیا نہ سرخ و زرد ہوا

نہیں مطلق بہی کو اپنا ہوش نا شپاتی روئی میں ہے روپوش

باغباں ہی نہ منھ کو ڈھانپے ہے بید بھی اِس ہوا سے کانپے ہے

مشک پاتا ہے قیمتِ کافور سر پہ نافے کے ہے کلاہِ سمور[2]

جب غریبوں کے سر پہ آئے ہے رات ہے ہم آغوشی اُن کو زانو سات

سر پہ لے کر گلیمِ بخت سیاہ گر رہے ہیں گدا جو کر کے آہ

مار سرما نہ کاٹ کھائے کہیں بیم سے پا دراز کرتے نہیں

اپنی حدّت سے جو ہوئی ہے نفور فلفلِ زرد اب ہے خود کافور

فلفلِ سرخ کا کروں اظہار ٹک ادھر کان دھر کے سُن، اے یار

اس کو گر تو زبان پر رکھے اور ذرا ان دنوں مزا چکھے

تجھ کو پہنچا دے وو ہیں تا لبِ گور یہی جانے کہ کھا گیا کافور

آگ سے شعلہ جو اُٹھے ہے کبھو وہ بھی کرتا ہے دم بدم ہُو ہُو

سب کی مجمر پہ آنکھ رہتی ہے جیسے ناسور، ناک بہتی ہے

تھی جو گوگرد[3] کی زمین کہیں واں بھی گرمی کا نام خاک نہیں

ہے مزاج زمانہ جوں کافور ہووے گرمی کسی میں کیا مذکور

1۔ دگلہ = روئی کی بنڈی 2۔ سَمور = جانور کی کھال جس سے سردی کا لباس بناتے ہیں

3۔ گوگرد = سلفر

تھی جنھوں کے مزاج میں سردی — اور بھی آگئی ہے نامردی
دست و پا اپنے یخ جو پاتے ہیں — آگ پر کچھ گرے ہی جاتے ہیں
تب کی نے حرف و نے حکایت ہے — ہے تو سردی ہی کی شکایت ہے
غیرتِ دیں نہیں رہی زنہار — صاف آتش پرست ہیں دیندار
سر ہلاتے ہیں صاحبِ تمکین — کون سی جا کہ رعشہ عام نہیں
تھا سمندر جو آگ کا کیڑا — آگ ہی میں وہ ہوگیا ٹھنڈا
پانو چلنے سے ان کے ہیں بے کار — بہ تصوّر پھریں ہیں چوکیدار
چور چوری سے جی چراتے ہیں — شحنے گھر بھاگ بھاگ آتے ہیں
باغ ہستی میں دیکھ کر یہ ہوا — سیب کیا کیا نہ سرخ و زرد ہوا
ہے دوشالوں کی یہ خریداری — نہیں آتی غریب کی باری
پشم پوشی پہ بسکہ مرتے ہیں — بعضے کمبل خرید کرتے ہیں
ہے گراں بسکہ شال کا رومال — اس کو لگتی نہیں ہے قیمتِ شال
پشم پوشی سے اپنی کر کے زیب — سگِ پشمی بنا پھرے ہے رقیب
دی ہے سرما نے کیا مجھی کو شکست — آج حربا[1] ہے آفتاب پرست
جن کے تن پر نہیں ہے اک لتّا — کیا کہوں ہاے حال میں ان کا
آتش افروزی سے ہے سب سروکار — قرص خورشید پر ہے دن کو مدار
تھے جو بعضے خورندہ پانی کے — اب وہ پانی ذرا نہیں پیتے
آگ کے بس کہ کھل گئے ہیں چھپے — ہنستے ہیں اُس کو دیکھ دیکھ توَے
حال کیا ہووے گا غریبوں کا — ہے روئی پر تو زور ہی لرزا
آپ کو بسکہ سرد پاتی ہے — خود وہ پردے میں منھ چھپاتی ہے
طرفہ سردی ہے اِن دنوں یا رب — جس کے ڈر سے گلیم پوش ہیں سب

1۔ حربا = گرگٹ، (اور ایک مرغ آفتاب پرست)

سنگ و آہن جو اب بہم ہوں دوچار | برف اُن سے جھڑے بجائے شرار
ہاتھ میں لیجیے گر انگارا | ہووے محسوس جیسے یخ پارا
دیکھیو شدّتِ شبِ سرما | بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار | آگ کیا اک خدا کا ہے دیدار
مفلسوں کے بغل میں رہتے ہیں ہاتھ | ہیں نمد پوش آئینے دن رات
سرد دیکھی دوکاں کبابی کی | اب کے جاڑے نے کیا خرابی کی
ہے نمکداں میں برف جائے نمک | خاک کھا وینگے بادہ نوش گزک
مہر سے پھر گئے بتانِ جہاں | ڈھونڈیے کوئی گر تو ہے وہ کہاں
کر گئی ہے سفر حرارتِ تن | واں بُرودت کا اب ہوا ہے وطن
گرمی ہوتی نہیں ذرا اظہار | جیسے پانی، ہے نبض کی رفتار

مصحفیؔ اِس ہوا میں کیا امکان
ہووے گرم سخن کِسی کی زباں

آگے اب کیا لکھوں کہیں سردیِ دَے[1] کیونکہ میرا بھی ہاتھ کانپے ہے

1۔ دَے = سردی کے مہینے کا نام (ایرانی)

مثنوی شعلۂ شوق

(در قصۂ عشقِ پسر تنبولی)

یہ جو اک خوں چکاں حکایت ہے | اِس کی راوی سے یوں روایت ہے
کہ کسی نگری میں بہ طرفِ شمال | اک تنبولی بچہ تھا بدر مثال
شہرۂ حسن اُس کا ہر سو تھا | ماہ سیما، ہلال ابرو تھا
خوبرو تھا زبس وہ غیرتِ ماہ | ہر کسو کی پڑے تھی اُس پہ نگاہ
دور و نزدیک اُس پہ مرتے تھے | نقدِ دل مفت نذر کرتے تھے
آ کے دُکاں پہ وہ پری رخسار | بیٹھتا جب کہ بر سرِ بازار
حسنِ یوسف سے یاد دیتا تھا | دِل فریبی کی داد دیتا تھا
جو کہ اُس راہ سے گذر کرتا | اُس پہ خواہش کی اک نظر کرتا
تھے خریدار اُس کے جی سے ہزار | حسن تھا اس کا گرمیِ بازار
اتفاقاً رہا شب آ کے اُتر | اُسی بستی کے باہر اک لشکر
لشکری بستی میں سے ہو نکلے | ایدھر اودھر سے ایک دو نکلے
ناگہاں اک جواں سمند[1] سوار | آن نکلا جو بر سرِ بازار
دیکھ کافر کے ابروے پُرخم | کھا گیا دل پہ زخمِ تیغ الم
آفت اک اُس کی جان پر آئی | بد بلا اُس جوان پر آئی
کُھب گئی دل میں چشمِ کافر کیش | سینہ پلکوں نے کر دیا سب ریش
ہاتھ سے چھٹ گئی زمامِ سمند | خانۂ زیں پہ رہ گیا جا بند[2]

1۔ سمند = گھوڑا 2۔ جابند = اپنی جگہ پر جما ہوا

آکے حیرت نے اُس کو گھیر لیا — دوڑ کر بے ہُشی نے جام دیا
آخرِ کار ہو کے سودائی — دل میں یہ بات اپنے ٹھہرائی
کہ یہاں جب تلک ہے یہ لشکر — رکھیے صورت کو اُس کی مدّ نظر
الغرض لے کے صبح سے تا شام — بیٹھ کر دیکھتا تھا اُس کو مدام
ہوگیا ہوکے جامِ عشق سے مست — مثلِ نیلوفر، آفتاب پرست
شکلِ آئینہ، اُس کا حیران تھا — ہر سحر رو بروے دکّاں تھا
قیمت اک پیسا اُس کو دیتا تھا — اُس سے روز اک گلوری لیتا تھا
عشق میں ساتھ تھی حیا اُس کے — ربط جوئی نہ تھی سِوا اس کے
جی پر اُس کے جو کچھ گذرتا تھا — دل ہی دل میں بیاں وہ کرتا تھا
لب سے محروم تھی صداے آہ — بہہ گئی تھی سرشک ہوکے نگاہ
روز تا شب رکھے تھا ضبط سے کام — تھا اُسے بس نہفتہ ربط سے کام
اِسی صورت سے گذرے جب کئی ماہ — وارث اُس طفل کے ہوئے آگاہ
کہ یہاں آکے صبح سے یہ جواں — اِس پہ رہتا ہے نت نگاہ کُناں
غالبًا اِس سے لاگ ہے اُس کو — کیجیے اِس کی کچھ نہ کچھ تگ و دَو
باپ و بھائی تھے سخت دانش مند — یہی تدبیر کی اُنھوں نے پسند
کہ کوئی اِس جواں سے کچھ نہ کہو — کرمِ حق ہے یہ، خموش رہو
رب نے ایسا ہمیں دیا بیٹا — محوِ صورت ہے یہ جواں جس کا
اپنی خواہش کی داد دیتا ہے — دیکھے ہے، کیا ہمارا لیتا ہے
بعد یک چند واں سے جب ناگاہ — لائی جمِ غفیر[1] رو بر راہ
رات سے کوچ کا نقارہ ہوا — دل جواں کا ہزار پارہ ہوا
تھا تنبولی بچے کا وہ نوکر — رہ گیا فوج سے جدا ہوکر

1۔ جمِ غفیر = بھاری مجمع، بھیڑ

پال و پرتل شتر سے لے تا اسپ
سب دیا راہ میں لٹا با اسپ
سر بسر بن کے عشق کا پتلا
رہ گیا آپ اک تن تنہا
سر پہ اُس کے جنوں نے جوش کیا
با رفیقاں وداعِ ہوش کیا
قیمتِ پاں میں دل لگا بیٹھا
پیرہن چاک کرکے جا بیٹھا
ہو گیا رفتہ رفتہ سودائی
چاہ آخر کھینچی بہ رسوائی
نوکِ مژگاں سے اشکِ خوں ٹپکا
فصد کھلوائی تو جنوں ٹپکا
غم چھپایا بہت ولے نہ چھپا
راز نا گفتہ، ہو گیا رسوا
تب تو ہونے لگا خود اُس کا گذار
مثل مجنوں کے، بر سرِ بازار
نہ وہ غیرت رہی نہ وہ حرمت
رفتہ رفتہ بگڑ گئی ہیئت
ناوکِ حسن نے نشانہ کیا
عشق نے، عاشقِ یگانہ کیا
منقضی اِس پہ جب ہوئے کئی سال
غم سے گھٹنے لگا وہ بدر مثال
دن بدن رنگ زرد ہونے لگا
خود بخود دل میں درد ہونے لگا
خفقاں دل پہ جو ہوئی طاری
آکے لیٹا بہ فرشِ بیماری
لٹ گئے رنگ سرخ کے گلزار
ہو گیا زرد لالۂ رخسار
عشق کی لگ گئی نظر اُس کو
مرگ نے آکے دی خبر اُس کو
کہ تو بابِ نگاہِ گرم نہیں
تجھ کو نظّارگی سے شرم نہیں
منھ چھپا لے، کہ ہے حیا بیزار
تجھ سے اے بت، نہ ہو خدا بیزار
بس بہت تو نے خود فروشی کی
اب اشارت ہے روے پوشی کی
سنتے ہی یہ خبر وہ رشکِ قمر
آہ بھر کر گیا جہاں سے گذر
یہ خبر شہر میں ہوئی مشہور
کہ وہ حسرت فزاے جلوۂ حور
آج دنیا سے نااُمید گیا
کتنی تدبیریں کیں، ولے نہ بچا
ہوئے مصروفِ تعزیت اَب و عَم
ہو گیا خانہ، خانۂ ماتم

آخر کار با زبانِ درد　　روئی ہاں کر کے یہ بیانِ درد
''کاے مرے لال تھا تو گھر کا چراغ　　تیرے بجھنے سے ہے جگر پُر داغ''
غرض ارتھی کو اُس کی کر تیار　　لے چلے یک بیک جو خویش و تبار[1]
اُس گھڑی یہ جواں بھی با دل زار　　ساتھ ارتھی کے ہو لیا یک بار
کر دیا جب بہ رسمِ قوم ہنود　　مردہ اُس کا سپرد آتش و دود
یہ جو واں اک درخت تھا تنہا　　ٹہنی پکڑے ہوئے تھا اُس کی کھڑا
آگ واں جو اُسے جلاتی تھی　　اِس کو باطن میں سوخت پاتی تھی
اک دو ساعت میں جب وہ لالہ عذار　　ہوگیا جل کے خاک کا انبار
واں سے ہر اک نے عزمِ خانہ کیا　　آدم اک پیش تر روانہ کیا
لیک ہونے لگے وہ جب راہی　　ہوئی تب اُس جواں سے آگاہی
باپ نے بیٹے سے کہی یہ بات　　جا کر اُس کو بھی لے لے اپنے ساتھ
کیوں کہ اُس کا انیسِ ہر دم تھا　　وہ جو گل تھا، تو یہ بھی شبنم تھا
پاس جا جوں ہی اُس کا پکڑا ہاتھ　　کیا کہوں، ہائے وہ حمیدہ صفات
گر پڑا جیسے قالب بے جاں　　نہ رہی خاک اُس میں تاب و تواں
رُوح کا اُس کی کچھ نشاں نہ ملا　　خاک میں کیا وہ نوجواں نہ ملا
عشق کے جذب نے کیا یہ اثر　　کہ ہوا بن جلے وہ خاکستر
کیا عجب، عشق ہے وہ خانہ خراب　　جس سے کھنچ جائے آسماں کی طناب
عشق کی دیکھی جب میں یہ بیداد　　مجھ کو اک مطلع اپنا آیا یاد
''عشق ہے آفت و بلا تو نہیں　　اس کا مارا کوئی بچا تو نہیں''
اب تو اس داستاں کو کوتہ کر　　مصحفی طولِ عشق کو، تہ کر

ہے یہ چنگاری اک جو شعلہ نما
شعلۂ شوق نام ہے اس کا

1۔ تبار = خاندان، قوم قبیلہ

رُباعیات

(1)

سودا کا تو سرد ہوچکا ہے بازار اب بزمِ سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری، جلوہ گری میں ہر وقت سچ ہے کہ تجلّی کو نہیں ہے تکرار

(2)

باہم جو فلک کا ہے بندھا زنجیرا معلوم نہیں کہ اس میں ہے حکمت کیا
ہر چند کیے ہم نے بہت عقدے وا لیکن نہ کھلا ہم سے یہ گورکھ دھندا

(3)

کچھ دیں کی طرف ہوں، کچھ ہوں دنیا کی طرف دل جائے ہے اپنا، سو تمنا کی طرف
یہ پست تو خاکدانِ ہستی میں رہا اے آہ تو جا عالمِ بالا کی طرف

(4)

سب خاک میں مل گئی جوانی کی بہار بیٹھا سر و رو پہ آکے پیری کا غبار
پچیس برس تو خوابِ غفلت میں کٹے اے مصحفی اب تو ٹک کہیں ہو بیدار

(5)

اس کلبۂ احزاں میں وطن تو نے کیا اس تودۂ خاک کو چمن تو نے کیا
القصہ کہ مصحفی کو اپنے یا رب دستاں زن گلزار سخن تو نے کیا

(6)

جاتے ہوئے پانْو سا پھسل جاتا ہے دل سینے میں جیسے کوئی مل جاتا ہے
گر صورتِ خوش کہیں نظر آتی ہے و اللہ کہ میرا جی نکل جاتا ہے

(7)

نادان گئے جہاں سے اور دانا بھی پیدا جو ہوئے، ہوئے وہ ناپیدا بھی
ہے ہستیِ دنیا تو ہمارے دم سے ہم جب نہ ہوئے تو گو نہ ہو دنیا بھی

(8)

ہوتی ہے جو دل میں چاہ چھپتی کب ہے میلانِ طبیعت آہ چھپتی کب ہے
گو خواہش دل نہ منھ پہ لاوے عاشق خواہش کی ولے نگاہ چھپتی کب ہے

(9)

ظالم مرے جی کا درد تو کیا جانے سچ، بے مزگی کا درد تو کیا جانے
ہے تجھ کو تو رات دن ستانے سے کام بے درد کسی کا درد تو کیا جانے

(10)

دل آتشِ عشق میں جو رہتا تھا سپند ہوتا تھا دھوئیں سے آہ کے شعلہ بلند
سو سرد ہیں سب وے گرمیاں، اب ہم کو اک خوسی ہے دیکھنے کی، سو بھی تا چند

(11)

جوں آبلہ پھوٹ پھوٹ کب تک بہیے ہے مصلحت اب یہی کہ چپ ہی رہیے
نے یار و نہ آشنا، نہ مشفق نہ رفیق کہیے تو یہ درد اپنا کس سے کہیے

(12)

چاہت نے تری یاں سے نکالا مجھ کو کس چاہ سے ہائے تو نے پالا مجھ کو
اے آفتِ جانِ مصحفی تو نے تو اتنا چاہا کہ مار ڈالا مجھ کو

(13)

کیا جلدی سے ہوگئی جدائی کم بخت افسوس اجل بھی تو نہ آئی کم بخت
کیا تو نے کیا فلک کہ بن وصل ہوئے صورت مجھے ہجراں کی دکھائی کم بخت

(14)

گاہے بہ کدر گہ بصفا رہتے ہیں گہ سب میں، گہے سب سے جدا رہتے ہیں
ہم لوگ کچھ اختیار اپنے میں نہیں جس طرح سے رکھتا ہے خدا رہتے ہیں

(15)

ہر چند کہ اوروں میں ترا ساکا ہے پر میں نے تو کچھ اور تجھے تاکا ہے
دریاے لباسِ آبگوں میں یعنی گھڑیال تری توند، تو تو ناکا ہے

(16)

ہے ہم کو تو شعر کا فقط اک سودا ہو ہم سے نہ کارِ دیں نہ کارِ دنیا
ہوتی ہے جنھیں کہ مصحفی عقلِ معاش پتھر سے بھی کرتے ہیں وہ روٹی پیدا

(17)

ہم نے نہ چلے بند سلاسل دیکھا نے قافلہ کوئی راہی منزل دیکھا
صورت میں بگولے کی تو صدقے ہوتا اک مشتِ غبار گردِ محمل دیکھا

(18)

چھپ جاتے ہو لحظہ منہ دکھلا کر کیا مار ہی ڈالو گے ہمیں ترسا کر
آنا ہے تمھیں تو آ ملو جیتے جی مر جاویں گے ہم، تو کیا کرو گے آ کر

(19)

یا رب نہ گرفتارِ بلا رکھ مجھ کو دن رات نہ اتنا بھی خفا رکھ مجھ کو
آمیزشِ نیک و بد مرے حق میں ہے کم رکھ سب میں و لے سب سے جدا رکھ مجھ کو

(20)

زاہد تو ہے طاعت سے خریدارِ بہشت پائے جاتے ہیں اس میں آثار بہشت
لیکن یہ گنہگار جو ہے اے یارو نَے قابلِ دوزخ نہ سزاوارِ بہشت

(21)

بس جزئی و کلّی سے وہی ماہر ہے نیک و بد بندہ اُس پہ سب ظاہر ہے
شان اُس کی گہے رحیم و گہ قاہر ہے اللہ جو چاہے سو کرے، قادر ہے

(22)

ہے حور و قصور در نظر ایک کے تئیں اور ایک ہے داغ غم سے جلنے کے قریں
عرصہ ہے قیامت کا یہ میدان زمیں سچ پوچھو اگر بہشت و دوزخ ہے یہیں

(23)

کیا ہم سے ہوا نشأے[1] سابق میں عمل ہے جس کے سبب سے اب حواسوں میں خلل
یا رب کہ نہ پھر روی تناسخ دیکھے اس مرتبہ جان تن سے گر جاوے نکل

1۔ نشأے سابق = پچھلے جنم میں

(24)

ہے خیرِ بدیہہ، روزگار اُس کے میں کیا دخل کسی کو کاروبار اس کے میں
جوں صورت شب باز[1] جو تو غور کرے سر رشتۂ کُل ہے اختیار اس کے میں

(25)

ہیں وے جو نظر باز حقیقت آئیں رکھ پیش نظر آئینہ چرخ و زمیں
دیکھیں ہیں اُسے جس کی کہ یہ صنعت ہے ہر چند بصارت کو وہاں دخل نہیں

(26)

ہرگز نہ کھلا ہم پہ معمّاے فلک چھٹ اُس کے، کہ ہے تو کارفرماے فلک
پیسے ہے ہمیں وہ آسیا کے مانند ہم پستے نہیں ہنوز، اے وائے فلک

(27)

بعضوں نے کہا ہستی عالم ہے قدیم بعضوں نے کیا ہے اس کو حادث تفہیم
اک بات ٹھہرتی ہی نہیں خاطر خواہ کیا کیجیے کہ عاجز ہے یہاں فکرِ حکیم[2]

(28)

ہستی جسے کہتے ہیں سو ہے وہ اک دم اور سمجھے جو تو اول و آخر ہے عدم
اس دم کو تو رایگاں نہ کھو دیوانے گر یہ بھی نہ ہوگا تو کہاں کا عالم

(29)

ہستی تری گر غور کرے دو دم ہے ہے جس پہ بنائے زندگی، سو دم ہے
آ فکر نہ کر ماضی و مستقبل کا بس اس کو غنیمت ہی سمجھ جو دم ہے

1۔ صورت شب باز = کٹھ پتلی کا تماشا دکھانے والا 2۔ حکیم = فلسفی

(30)

بعضوں نے تو لی مذہب و ملّت کی راہ اور بعضے گئے سقر[1] میں ذلّت کی راہ
ان سب سے یہ مصحفی نے ہو کر کے جدا کی اپنے لیے پسند قلت کی راہ

(31)

تو ہستیِ واجب کے تئیں یوں پہچان یعنی کہ وجود اپنا وجود اُس کا جان
جب تجھ پہ یہ اثبات ہوا سب حق ہے پھر آوے نظر میں غیرِ حق کیا امکان

(32)

کیا تیرے سوا یہاں بتا ہے کوئی اور؟ بندہ ہے جو تو، تو کیا خدا ہے کوئی اور؟
یا رب تجھے اپنی ہی قسم سچ کہہ دے اِس پردے میں تو ہے یا چھپا ہے کوئی اور؟

(33)

کیا تجھ سے کہوں حالِ شہود عالم کچھ ایک سی ہے بود و نبود عالم
پس یوہیں جو ٹھہری تو ہوا اے ناداں خود عین وجودِ حق، وجودِ عالم

(34)

عینیتِ ذات جس کو حاصل ہووے عین دریا ہے، گو کہ ساحل ہووے
کیا دخل ہے عکس رونما ہووے اگر آئنہ کے آئینے مقابل ہووے

(35)

ہم دونوں جہاں میں آشنا تجھ سے ہیں جس جا پہ ہیں جان ایک جا تجھ سے ہیں
ہے بحر و حَباب کی سی نسبت باہم تو ہم سے جدا، نہ ہم جدا تجھ سے ہیں

1۔ سقر = دوزخ

(36)

تھا پیشتر آدم سے تو عالم کا ظہور بعد اُس کے ہوا جہاں میں آدم کا ظہور
گر دیدۂ تحقیق سے دیکھے کوئی سارا یہ پیکھنا ہے اِک دم کا ظہور

(37)

کیا ہم سے گریزاں ہیں بتانِ گلفام گویا کہ بچھا رکھا ہے یاں ہم نے دام
گر ان کو یہ وحشت ہے تو پھر ہم کو بھی رعنائی و دلبری سے اُن کی کیا کام

(38)

جب چھیپ[1] کے داغوں پہ گئی میری نظر مجھ کو نظر آیا وہیں اک لطف دگر
اعجاز سے حسن کے ہوا عیب ہنر یعنی کہ یہ تارے تو وہ پنڈا ہے قمر

(39)

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

(40)

ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں باطن میں ولے کریم کے نوکر ہیں
نہ عید نہ بکرید نہ روزے[2] نہ دَہا[3] ہم بھی عجب اک لئیم کے نوکر ہیں

(41)

دی بانٹ محل میں چپکے چپکے تنخواہ اور ہم کو بہانوں ہی میں ٹالا کئی ماہ
انصاف سے کتنا دور ہے میر نعیم لا حولَ و لا قوۃَ اِلّا باللہ

1۔ چھیپ= چہرے کی جھائیاں 2۔ روزے = رمضان 3۔ دَہا = عشرۂ محرم

(42)

جیتا ہوں کبھی تو پھر کبھی مرتا ہوں　　ہنستا ہوں کبھی، کبھی فغاں کرتا ہوں
دن رات جدائی کا جو دکھ بھرتا ہوں　　کچھ خلق سے، کچھ خدا سے میں ڈرتا ہوں

(43)

دو دن جو کشیدہ وہ مجھے پاتا ہے　　یوں پیار سے حق میں مرے فرماتا ہے
آجائے ہے مصحفی کے کیا جی میں بھلا　　کم بخت جو آتے آتے رک جاتا ہے

(44)

یک دن نہ عیادت کو مری تو آیا　　نے اپنی طرف سے ہی کوئی بھجوایا
کیا چاہے ہے اے صنم، جدائی نے تری　　نزدیک بمردن تو مجھے پہنچایا

(45)

قُمری سے نہ سرو کا ٹھکانا چھوٹے　　بلبل سے نہ گل کا آشیانا چھوٹے
گو مجھ کو کرے کوئی نصیحت مجھ سے　　ممکن نہیں اُس گلی کا جانا چھوٹے

(46)

یا تو کسی شخص کو جنوں ہووے گا　　یا چاہِ الم میں کوئی نگوں ہووے گا
ہوتا ہے تری وضع سے معلوم ہمیں　　اک آدھ غریب کا بھی خوں ہووے گا

(47)

ہر سفلہ نہ فنِ شعر کا ماہر ہے　　ہر ذرّہ نہ آفتاب سے باہر[1] ہے
شاعر ہیں بہت سے یوں تو کہنے کو و لے　　جو شعر کی روٹی کھائے وہ شاعر ہے

1۔ باہر (بروزن ماہر) = چمکنے والا

(48)

صد شکر کیا آپ نے غسلِ صحت
دھوئی گئی دل سے سب کے گردِ کلفت
ہو غسل مبارک تمھیں مرزا مینڈھو
جب تک ہے جہاں میں رسمِ رنج و راحت

(49)

کی مجھ سے بقصد بے وفائی تو نے
مٹّی میں ملا دی آشنائی تو نے
افسوس اس کا تجھے بھی ہوگا سچ ہے
کی تھی کوئی روز کی جدائی تو نے

(50)

ہے روزِ وداع آنسوؤں کا طوفاں
آیا ہوں بچشم تیرے اوپر گریاں
جاتا ہوں سفر کو میں تجھے یاد رہے
دل سے نہ بھلانا تو مجھے میری جاں

☆☆☆☆☆